سورۂ فاتحہ اور سورۂ ناس سے سورۂ قدر تک

آسان درسِ قرآن

جلد اوّل

افادات

حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری دامت برکاتہم العالیۃ

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل، گجرات

ناشر

دار الحمد ریسرچ انسٹیٹیوٹ

سوداگرواڑہ، سورت، گجرات، ھند

تفصیلات

کتاب کا نام:......آسان درس قرآن

افادات:......حضرت اقدس مفتی احمد خانپوری صاحب دامت برکاتہم العالیۃ

تخریج:......عبدالاحد فلاحی

سن اشاعت:......ذی قعدۃ الحرام ۱۴۴۰ھ مطابق جولائی ۲۰۱۹ء

PUBLISHER:

DARUL HAMD RESEARCH INSTITUTE

SODAGARWADA, SURAT

+91 7016565842, 9173103824

darulhamd2017@gmail.com

ملنے کا پتہ

دارالحمد ریسرچ انسٹیٹیوٹ، سوداگرواڑہ، سورت۔ ۷۰۱۶۵۶۵۸۴۲

ادارۂ صدیق، ڈابھیل۔ ۹۹۰۴۸۸۶۱۸۸

مولانا بک ڈپو۔ ۹۲۲۸۷۶۰۷۱۶

فہرست مضامین

سورۂ فاتحہ-قسط:۱

سورۂ فاتحہ-قسط:۲

سورۂ فاتحہ-قسط:۳

سورۂ فاتحہ-قسط:٤

﴿ سورۂ فاتحہ-قسط:۵ ﴾

﴿سورۂ فاتحہ-قسط:۶﴾

سورۂ فلق- قسط: ۱

﴿سورۂ فلق-قسط:۲﴾

سورۂ ناس-قسط: ۱

﴿ سورۂ ناس-قسط:۲ ﴾

سورۂ اخلاص

سورۂ لھب

﴿ سورۂ نصر-قسط:۲ ﴾

﴿ سورۂ کافرون-قسط: ۱ ﴾

﴿ سورۂ کافرون-قسط:۲ ﴾

﴿ سورۂ کوثر ﴾

﴿سورۂ ماعون﴾

﴿سورۂ قریش﴾

سورۂ فیل

﴿سورۂ ھمزۃ﴾

﴿سورۂ عصر﴾

﴿سورۂ تکاثر﴾

سورۂ قارعة-قسط: ۱

سورۂ قارعة-قسط: ۲

﴿ سورۂ عادیات-قسط: ۱ ﴾

﴿ سورۂ عادیات-قسط: ۲ ﴾

سورۂ عادیات-قسط:۳

﴿سورۂ عادیات-قسط:۴﴾

﴿ سورۂ عادیات-قسط:۵ ﴾

﴿سورۂ عادیات-قسط:۶﴾

سورۂ زلزال-قسط: ۱

سورۂ زلزال-قسط:۲

سورۂ زلزال-قسط:۳

﴿سورۂ زلزال-قسط:۴﴾

﴿ سورۂ بینۃ ﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ابتدائیہ

(بہ وقت طبع اول)

حضرت الاستاذ مرشدی ومحسنی مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دام ظلھم کی ہفتہ واری مجلس سورت کی عمر الحمدللہ ۲۲/سال ہوگئی۔ اس وقفہ میں فضل وتوفیقِ الٰہی سے ریاض الصالحین، الادب المفرد، شمائل ترمذی اور صحیح بخاری کی کتاب الرقاق کے دروس حضرت اقدس زید فضلھم نے دیے۔ کتاب الرقاق کے اختتام کے بعد کیا شروع کیا جائے؟ یہ مسئلہ محترم ومکرم جناب الحاج بلال منیار صاحب نے بعنایت ایزدی حل فرمادیا کہ استاذ مکرم وشیخ محترم کو درس قرآن کے لیے آمادہ فرما ہی لیا، آں محترم ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

فجزاکم اللہ۔

چناں چہ گذشتہ تین ماہ سے درسِ قرآن ہو رہا ہے۔ پہلی مجلس میں حضرت دام مجدھم نے ایک پر مغز وجامع مقدمہ بیان فرمایا۔ اس کے بعد والی مجلس میں سورۂ فاتحہ کا درس شروع ہوا۔

اللہ کی توفیق سے ہر ہفتہ کا درس نیا درس ہونے سے قبل لکھوا لینے کا التزام پہلے ہی دن سے رکھا اور اسے لفظ بہ لفظ بلکہ حرف بحرف حضرت بھی ملاحظہ فرماتے رہے، تصحیحات کرتے رہے۔ سورۂ فاتحہ مکمل ہوئی تو وہ کتابی شکل میں بھی تیار تھی، حضرت نے اشاعت کی اجازت بھی مرحمت فرمادی، تو تخریج کا کام شروع کروایا گیا۔ جس کو مولانا عبدالاحد راندیری فلاحی سلمہٗ نے بخوبی انجام دیا۔ اب الحمدللہ پریس میں جانے کو ہے۔

مولانا انور پارکھیتی سلمہٗ ہر ہفتے ریکارڈنگ کو عرض سے جوہر کی شکل دے دیتے

ہیں، مولانا داود میمن اسے مزید نکھار کر نظر ثانی کے لیے مجھے دیتے ہیں، یہاں سے صاف ستھری ہوکر تحریر حضرت کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے، تب یہ مجموعہ حرفِ آخر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب ہی احباب و بزرگوں کو دارین میں اپنے شایانِ شان اجرِ عظیم سے مالامال فرمادے۔ ان کی نسلوں کو دینی علمی و ملی کاموں کے لیے قبول فرمائے۔

''دارالحمد'' اس سعادت کے حصول پر سر بسجود ہے اور حمد و شکر کے جذبات سے لبریز ہے۔

ربّنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم، و تب علينا إنك أنت التواب الرحیم.

طاہر سورتی

شب یکم شعبان ۱۴۳۹ھ

۱۷/اپریل ۲۰۱۸ء

باسمہٖ تعالیٰ

ابتدائیہ

(بہ وقت طبع ثانی)

آسان درسِ قرآن جز و دوم پریس کے حوالے ہونے کو ہے، تب دل جذباتِ شکر سے لبریز ہے، توفیق ہے اللہ رحمٰن ورحیم کی کہ نوبت بایں جارسید۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ رب کریم بعافیت اس سلسلہ کو جاری رکھ کر تکمیل تک پہنچائے۔ اور مرشدی ومحسنی حضرت الاستاذ دام مجدھم ومد ظلہم کو بصحت وقوت رکھے کہ درس کا یہ عمل پورے قرآن مجید کو محیط ہو جائے۔

الحمد للہ جزء اول کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے کو ہے۔ قدر دان حضرات سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اسے خرید کر **دارالحمد** اور اس کے عملہ کی حوصلہ افزائی فرما کر آپ بھی اس کارِ خیر میں برابر کے شریک بنیں۔ الحمد للہ ہمارا مقصد تجارت نہیں ہے۔ اسی لیے کتاب کا ریٹ زیادہ نہیں رکھتے، بس ضروری خرچ نکل آئیں، اور کچھ برکت مزید ہو جائے تاکہ اداروں اور اربابِ فضل وکمال کے اعزاز واکرام کی کچھ صورت ہو جائے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ درس قرآن ہر مسجد میں کرنا ہے۔ اس کی مہم جامعہ ڈابھیل سے چلائی گئی ہے۔ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی جولائی کے اواخر میں تشریف لائے تھے، سہ روزہ سیمینار ہوا تھا، آخری دن کا موضوع یہی تھا۔ اس میں خود مہمانِ معظم نے اور سب سے اخیر میں میزبانِ محترم حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے میثاق و معاہدہ ہی لیا کہ ہر شخص اپنی جگہ جا کر درس قرآن کا کام شروع کرے گا۔ کوئی مسجد ایسی باقی نہ رہے، جس میں درس قرآن نہ ہوتا ہو۔ تاریخ کو دہرانا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں دلی میں یہ منظر تھا کہ وہاں کی بیشتر مساجد میں درس قرآن ہوتا تھا۔ (حضرت مولانا خالد

سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم بحوالۂ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ)

تو یہ کتاب اس میں آپ کی معاون ثابت ہوگی۔ کچھ کرنا نہیں ہے۔ کرسی پر بیٹھ کر لوگوں کو چند صفحات پیشگی مطالعہ کر کے سنا دیں۔ ہر شخص سے دست بستہ مؤدبانہ یہ عرض ہے جو اِن سطور کو پڑھ رہا ہے کہ اپنے آپ کو اس مہم کا حصہ بنائیں۔ اور جامعہ ڈابھیل یا دار الحمد کو اس کی باقاعدہ اطلاع بھیجیں کہ کس گاؤں کی کس مسجد میں آپ نے یہ سلسلہ جاری فرمایا۔ جو حضرات پہلے سے درس قرآن عمومی دے رہے ہیں، وہ بھی مطلع فرمائیں کہ کب سے اور کہاں یہ کام کر رہے ہیں۔ اپنے حلقۂ احباب میں اس مشن کی خوب دعوت چلائیں۔ اور قرآن کریم سے امت کو براہِ راست مستفید ہونے کی راہ فراہم کریں کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے، فرض منصبی ہے۔ اس کے بغیر ہم سبک دوش نہ ہوں گے۔

حضرت اقدس مرشدی طال بقاءھم بالعافية ہر ہفتہ پابندی اور اہتمام سے گذشتہ ہفتہ کا درس حرفاً حرفاً ملاحظہ فرماتے ہیں، اور اس میں ضروری اور مناسب اصلاحات سے نوازتے ہیں۔ اس کے بعد ہی مسودہ حرف آخر ہوتا ہے۔ فجزاهم الله خيرا.

عزیزم مولانا انور صاحب پارکھیتی، مولانا داود میمن اور مولانا عبدالاحد فلاحی سلمهم الله نے اس جزء کے لیے بھی اپنے اپنے حصہ کی خدمات فراہم کیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو اجر عظیم سے نوازے۔

آپ حضرات کے مشوروں، ہدایات و اصلاحات کا تا ہنوز انتظار ہے۔ والانتظار أشد من الموت الأحمر۔ للہ کچھ تو بولیے!! کچھ تو لکھیے!! جو بھی لکھنا ہو آپ آزاد ہیں۔

پہلی قسط کی طباعت کے وقت، اس کے سب سے بڑے قدردان محبوبی و معظمی، مشفقی و محسنی حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً میری حوصلہ افزائی کے لیے موجود تھے۔ افسوس کہ آج حضرت نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بے شمار رحمتیں نازل

فرمائے۔اور جو احسانات و شفقتیں مجھ پر فرمائیں، ان کا بھرپور جزاءِ خیر عطا فرمائے۔آمین

ہمارے دار الحمد کے مستقل معاونین کے لیے بھی سب ہی سے دعا کی درخواست ہے۔ یہ حضرات ہر ماہ پابندی سے اپنی متبرک للہ رقوم سے ہماری ہمت بڑھاتے ہیں۔

فجزاهم الله خیرا

اس درس کی خصوصیات پر تو ان شاء اللہ بعد میں اطمینان سے لکھوں گا۔ ابھی سرِ دست اتنا عرض کر دوں کہ:

- جس انسان نے اپنی زندگی نصف صدی سے زائد میدان تدریس میں مکمل کامیابی کے ساتھ پوری شان و وقار سے بتائی ہو۔
- جس کی احتیاط کا یہ عالم ہو کہ کوئی درس بھی بغیر تیاری کے نہ دیا ہو۔
- جس کا نظریہ ہو کہ بغیر تیاری کے سبق پڑھانا خیانت ہے۔
- جس کا تقویٰ و پارسائی ایک اجماعی مسئلہ بن چکا ہو۔
- جو شنبہ تا شنبہ آدھے گھنٹے کے درس کے مطالعے کے لیے ہوم ورک کرتا ہو۔
- جو اس درس کی کامیابی و مقبولیت عند اللہ کے لیے خود بڑے اہتمام سے دعا کرتا کراتا ہو۔

اس کے بیان میں جتنی خوبیاں جمع ہوں؛ کم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔ دارین میں اجر عظیم سے نوازے۔اور پوری امت کو حقیقی قدر نصیب فرمائے۔آمین۔

محمد طاہر سورتی

۱۲/ ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ

۲۳/ اگست ۲۰۱۸ء

شبِ جمعہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

ایک نظر ادھر بھی......

منت منه که خدمت سلطاں همی کنی

منت شناس ازو که به خدمت بداشتت

تمام تعریفیں اس رب کریم کے لیے زیبا ہیں جس نے قرآن مجید کو کتابِ ہدایت بنا کر نازل فرمایا۔ اور لاکھوں سلام اس رحمت عالم پر جس نے کتاب اللہ کی شرح فرما کر انسانیت کو راہِ حق پر گامزن فرمایا۔ اور کروڑوں رحمتیں ان قدسی نفوس پر جن کا سراپا وجود کتابِ حکیم کا زندہ وجاوید عملی مجسمہ تھا۔

شکر ادا کروں تو کیسے؟ کس زبان ودل سے؟ کس بخشش وعطا پر؟ کس جود وسخا پر؟ کہ اس رب کریم نے اپنی مقدس کتاب کی خدمت کی توفیق نصیب فرمائی۔ فالحمد للہ.

اس سے قبل دار الحمد ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے بینر تلے قدوۃ العلماء، بقیۃ السلف حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری ادام اللہ فیوضہ علینا کی ہفتہ واری درسِ قرآن کی مجالس کا حسین گلدستہ قلم بند ہوکر دو جزوں (سورۂ فاتحہ وسورۂ ناس تا کافرون) میں شائع ہوکر مقبول خاص وعام ہوا۔ فالحمد للہ علی ذلک.

اس کے بعد تیسری اور چوتھی قسط (یعنی از سورۂ کوثر تا سورۂ زلزال) بھی لوگوں کے شدید تقاضوں اور اصرار کے بعد حضرت دام مجدہم کی ویب سائٹ پر رکھ دی گئی۔ جو ہزاروں تشنہ لبوں کی سیرابی کا سبب ہوئی۔ بہت سے علماء صرف اسی کا مطالعہ کر کے اپنے اپنے علاقوں میں درس قرآن دے رہے ہیں۔ اس لیے مؤخر الذکر دونوں قسطوں کو انٹرنیٹ کے

حوالے کرنا ناگزیر تھا۔

اب وہ مسرت بخش لمحہ بھی میسر آیا کہ اب تک کا مکمل درس قرآن یکجا قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔اس کتاب میں پہلے دونوں جزوں کی شمولیت کے ساتھ بقیہ دروس (یعنی ازسورۂ کوثر تا سورۂ قدر) بھی شائع کیے گئے ہیں۔

قارئین کو یہ یاد دلانا مناسب ہے کہ ہر ہفتے کا درس ہر ہفتے لکھ لیا جاتا ہے، پھر ایک جگہ نظر ثانی ہو کر آخری نظر کے لیے حضرت دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، حضرت والا اس پر بالاستیعاب نظر فرماتے ہیں، پھر تخریج کے بعد اس کو کتابی شکل دی جاتی ہے۔

میں اُن جملہ معاونین کا تہِ دل سے ممنون ہوں، جنہوں نے اس کتاب کی طباعت و کتابت کے سلسلے میں کسی طرح کی سعی کی ہے۔اور بارگاہِ ایزدی میں دست بہ دعا ہوں کہ رب کریم ان کو دارین کی فوز و فلاح نصیب فرمائے، ان کی نسلوں میں علماءِ ربانی اور دین کے علم بردار پیدا فرمائے۔اور تاحینِ حیات انہیں اس نوع کی دینی خدمات کی توفیق نصیب فرمائے۔آمین۔

طاہر سورتی

۶/ ذی الحجہ ۱۴۴۰ھ

۸/ اگست ۲۰۱۹ء، پنج شنبہ

پس منظر

(یہ کلمات حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیۃ نے کتاب الرقاق کے اختتام پر درس قرآن شروع کرنے کے پسِ منظر کے طور پر ارشاد فرمائے تھے)۔

الحمد للہ! کتاب الرقاق پوری ہوئی۔ میرا جب بھی حرم جانا ہوتا ہے تو میرے ایک کرم فرما ہیں: حاجی بلال منیار صاحب، جو مکہ مکرمہ میں رہتے ہیں، تو جب بھی میرا جانا ہوتا ہے تو مجھ سے پوچھتے ہیں: آج کل کون سی کتاب کا درس چل رہا ہے؟ وہ کب ختم ہونے والی ہے؟ اس سے قبل بھی جب اسباق جاری تھے تو کہتے تھے: اب آپ قرآن کی تفسیر شروع کر دیجیے، اور میں ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ مدرسہ میں نصاب میں بھی کبھی ترجمہ یا جلالین پڑھانے کی نوبت نہیں آئی۔ مجھے قرآن کے متعلق بڑا ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی بات ادھر ادھر نہ ہو جائے، ہمیشہ سہم رہتا ہے، لیکن ان کا بڑا اصرار رہتا ہے۔

اب کی مرتبہ بھی جب محرم میں جانا ہوا تھا تو پھر یہی پوچھا تھا، اور ان کا اصرار تھا۔ تو اب توکلاً علی اللہ! میں نے یہ نیت کی ہے کہ-ان شاء اللہ-اب درس قرآن شروع کریں گے اور ایک ترتیب سے نہیں؛ بلکہ مختلف جگہوں سے کریں گے۔

آپ حضرات دعا کیجیے! اللہ تعالیٰ اس کو آسان فرماوے، اور اس کی برکتوں سے مجھے اور آپ سب کو اللہ تعالیٰ نوازے، اور صحیح نیت کے ساتھ اس کو پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ قرآن پاک کے درس کی برکات اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب فرمائے اور آپ کو بھی۔ اور اس سلسلہ میں کوئی ایسی بات جو اللہ کے کلام کی شان سے ہٹ کر ہو، اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آپ سب دعاؤں کا اہتمام کریں۔

مقدمہ

(مؤرخہ ۲/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۰/جنوری ۲۰۱۸ء شبِ یکشنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ كَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (النساء) وَقَالَ تَعَالیٰ: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ وَقَالَ تَعَالیٰ: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (القدر/۱) وعن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قال النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَامِنَ الْأَنْبِيَاءِ نَبِيٌّ إِلَّا أُعْطِيَ مَا مِثْلُهُ اٰمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ وَ إِنَّمَا كَانَ الَّذِیْ أُوتِيتُ وَحْيًا أَوْحَاهُ اللّٰهُ إِلَیَّ فَأَرْجُوْ أَنْ أَكُوْنَ أَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (أخرجه البخاری برقم: ۴۶۹۶ ومسلم برقم/ ۱۵۲)

مقصد تخلیق:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کو اپنی عبادت اور اطاعت کے لیے پیدا فرمایا ہے،

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (میں نے جنات اور انسانوں کو اپنی عبادت اور اطاعت کے لیے پیدا کیا)۔

عبادت کے معنیٰ:

عبادت کس کو کہتے ہیں؟ الطاعة مع الخضوع (فروتنی یعنی اپنے آپ کو جھکاتے ہوئے)[۱] کسی کی فرماں برداری کرنا اسی کو طاعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا طاعت کے لیے وہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بتلایا، اُسی کی طرف سے عبادت اور طاعت کا مطالبہ ہے، اگر ہم کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں، جو اللہ کو ناپسند ہو پھر وہ طاعت کیا ہوئی؟ اس لیے کہ جس کی طرف سے مطالبہ ہے اس کو تو یہ ناپسند ہے، تو اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق ہمیں اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری کرنی ہے۔

نبیوں کا سلسلہ:

اب یہ کیسے معلوم ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو فلاں چیز پسند ہے اور فلاں چیز ناپسند ہے؟ ہم اپنے جیسے انسانوں کی پسند اور ناپسند کو اپنی عقل کے ذریعہ معلوم نہیں کر سکتے، حالاں کہ وہ ہم جیسے انسان ہیں، تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کو کیا چیز پسند ہے اور کیا چیز ناپسند ہے وہ عقل کے ذریعہ سے معلوم نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ خود ہی نہ بتلائیں، اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات تو بڑی بزرگی والی، بڑی عالی مقام ہے، ہر کس و ناکس اللہ تبارک وتعالیٰ سے خطاب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور نہ ہی اس کے اندر اس کی اہلیت

---

(۱) معاني القرآن وإعرابه للزجاج ۱/ ۴۸ (ط: عالم الكتب، بيروت) والوسيط للواحدي ۱/ ۶۸ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت) تفسير البغوي ۱/ ۷۵ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت).

ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ہی نے محض اپنے فضل وکرم سے انسانوں میں سے بعض حضرات کو چنا، اور اپنے احکام بذریعۂ وحی ان پر نازل فرمائے، اور ان کو اس بات کا مکلف بنایا کہ ان احکامات کو اللہ کے بندوں تک پہنچائیں، اسے سمجھائیں، چناں چہ جو حضرات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس خدمت کے لیے چنے گئے ان کو حضرات انبیاء اور حضرات رُسُل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب سے انسان کا وجود ہوا ہے، تب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے، سب سے پہلے نبی، سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام ہیں۔ پھر یہ سلسلہ جاری رہا، مختلف زمانوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف انسانوں کو اپنا نبی اور رسول بنایا، ان پر کتب و صحائف بھی نازل فرمائے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کے آخری نبی ہیں، اب آپ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں، نبوت کا سلسلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکمل ہو چکا۔

وحی:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کتاب بذریعہ وحی قرآن پاک کی شکل میں نازل کی گئی وہ آخری کتاب ہے، اب دوسری کوئی کتاب آنے والی نہیں ہے، اس کتاب نے اگلی تمام کتابوں کے احکام کو منسوخ کیا ہے۔ یہ قرآن پاک اللہ تبارک وتعالیٰ نے بذریعۂ وحی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا۔ وحی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فرشتوں کے ذریعہ یا دوسرے طریقوں سے اپنے منتخب اور چنیدہ بندوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ راضی ہوتے ہیں، اور یہ وہ باتیں ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، وہی چیزیں حضرات انبیاء انسانوں تک پہنچاتے ہیں اور ان کو اس کا مکلف کیا جاتا ہے۔

نزولِ کتاب کیسے ہوا......؟؟؟

اب آخری کتاب (قرآن کریم) کب نازل ہوئی؟ بخاری شریف میں روایت ہے: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر وحی کی ابتداء سچے خوابوں کے ذریعہ ہوئی، چھ مہینے ایسے گزرے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے روزانہ رات میں آپ کو ایسے خواب دکھلائے جاتے تھے جو دن میں ہو بہو، صاف صاف وجود میں آجاتے تھے، اس کی تعبیر کی ضرورت نہیں تھی، کھلم کھلے ہوتے تھے، كفلق الصبح صبح کی روشنی کی طرح، جیسے وہ واضح اور صاف ہوتی ہے اسی طرح وہ خواب بھی بالکل واضح حقائق کی شکل میں آپ کے سامنے آجاتے تھے، چھ مہینے یہ سلسلہ رہا۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ پر خلوت پسندیدگی ڈال دی گئی۔[1] یعنی آپ کے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ تقاضہ اور داعیہ پیدا فرمایا کہ آپ تنہائی میں، خلوت میں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوں، چناں چہ اس خلوت گزینی کے لیے نبی کریم ﷺ نے غار حرا کا انتخاب فرمایا، شراح حدیث نے لکھا ہے کہ اسی غار میں آپ کے دادا خواجہ عبدالمطلب بھی خلوت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کرتے تھے، کعبۃ اللہ سے تین میل کی دوری پر، منیٰ جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر جبل نور کے نام سے ایک پہاڑ واقع ہے، اس کے اوپر یہ غار ہے، یوں سمجھیے! ایک بنا بنایا کمرہ ہے جس میں آسانی سے ایک آدمی کھڑا رہ سکتا ہے، اور اللہ کی عبادت کرسکتا ہے، اس میں ایک سوراخ بھی ہے، جس سے سیدھا کعبۃ اللہ نظر آتا تھا۔ اب تو عمارتوں کی وجہ سے وہ بات نہیں رہی۔ نبی کریم ﷺ اسی غار میں اللہ کی عبادت کے لیے تنہائی میں قیام کرتے تھے اور اللہ کی

---

(۱) أخرجه البخاري في بدء الوحي: ۳.

عبادت میں خلوت گزینی کے طور پر مشغول ہوتے تھے، چند دنوں کا توشہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے، پھر چند دنوں کے بعد جب گھر والوں سے ملاقات کا تقاضہ پیدا ہوتا، تو آپ گھر واپس آتے، اور چند دنوں کا توشہ لے کر دوبارہ جاتے، اس طرح یہ سلسلہ جاری تھا۔

اسی دوران ایک مرتبہ حضرت جبریلؑ اسی غار میں آپ کے سامنے نمودار ہوئے، اور کہا: اِقْرَأْ آپ پڑھیے! تو حضور اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا: ما أنا بقارئ، میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، تو حضرت جبریلؑ نے حضور اکرم ﷺ کو اپنے سینے سے چمٹا کر کے بھینچا، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ: ایسا بھینچا کہ میری طاقت جواب دے گئی، پھر چھوڑ دیا اور فرمایا: اِقْرَأْ، پڑھیے! حضور ﷺ نے وہی جواب دیا، انھوں نے دوبارہ اپنے سینے سے لگا کر چمٹا یا اور بھینچا، اور اب کی مرتبہ بھی اسی طرح طاقت انتہا کو پہنچ گئی، جواب دے گئی، اور پھر چھوڑا اور فرمایا: اِقْرَأْ، تو آپ نے فرمایا: ما أنا بقارئ۔ تیسری مرتبہ اسی طرح ہوا، اور چوتھی مرتبہ سورۂ اقرأ کی پہلی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔[1] یہ پہلی وحی تھی، جو غار حرا کے اندر آپ پر نازل ہوئی، یہ پہلا موقع تھا جس میں آپ کو فرشتے سے واسطہ پڑا، اور وہ بھی غار کی تنہائیوں میں، اور اچانک یہ واقعہ پیش آیا، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کی طبیعت مبارکہ پر ایک خوف اور گھبراہٹ سی طاری ہوگئی، اور آپ ﷺ کا قلب مبارک کانپنے لگا، اسی حالت میں آپ ﷺ گھر تشریف لے گئے۔[2]

یہ واقعہ کب پیش آیا؟

یہ واقعہ کب پیش آیا؟ اس سلسلے میں اہل سیر کے دو قول ہیں: (۱) علامہ ابن عبد البر

(۱) أخرجه البخاري في بدء الوحي: ۳.

(۲) أخرجه البخاري في بدء الوحي: ۳.

مالکیؒ - صاحب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب - فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ۸ / ربیع الاول کو پیر کے دن پیش آیا، اس اعتبار سے نبی کریم ﷺ کی عمر شریف پورے ۴۰ سال اور ایک دن ہے۔[۱]

(۲) دوسرا قول محمد بن اسحاقؒ - جو امام المغازی کہے جاتے ہیں - کا ہے کہ پیر کا دن تھا اور رمضان کی ۱۷ / تاریخ تھی۔[۲] حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[۳] گویا قرآن پاک کا نزول جو آپ پر شروع ہوا اس کی ابتدا بھی رمضان ہی میں ہوئی، اسی مناسبت سے انہوں نے اس قول کو راجح قرار دیا ہے۔ اس پر دونوں متفق ہیں کہ دن پیر کا تھا۔

قرآن کے دو نزول ہیں:

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کو لوح محفوظ میں محفوظ رکھا اور وہاں سے آسمان دنیا میں بیت العزت پر پورا قرآن رمضان کے مہینے میں اور شب قدر میں نازل ہوا اس پر سب کا اتفاق ہے۔

(۲) اس کے بعد نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر حضرت جبریلؑ کے ذریعہ سے ۲۳ ر سالہ دور نبوت میں نازل ہوتا رہا۔[۴]

---

(۱) ذکرہ ابن عبد البر في الاستیعاب ۱ / ۳۱، نقلاً عن الخوارزمي وفیه: فکان من مولده ﷺ إلی أن بعثه الله تعالیٰ أربعون سنةً ویوم. انتهیٰ. (ط: دار الجیل، بیروت).

(۲) سیرة ابن اسحاق ۱ / ۱۲۱ و ۱ / ۱۳۱ - ۱۳۰ (ط: دار الفکر، بیروت).

(۳) فتح الباري ۱۲ / ۳۵۷ - ۳۵۶ (ط: دار المعرفة، بیروت).

(۴) هذا قول الأکثر أخرجه النسائي في الکبریٰ برقم: ۱۱۶۲۵ (ط: مؤسسة الرسالة، بیروت)، والحاکم في المستدرک ۲ / ۲۴۲، (ط: دار الکتب العلمیة، بیروت)

زمّلوني زمّلوني:

جب یہ پہلی وحی نازل ہوئی، تو نبی کریم ﷺ کی طبیعت مبارکہ کے اوپر ایک گھبراہٹ اور خوف کی سی کیفیت تھی، آپ ﷺ کا دل کانپ رہا تھا، اور اسی حالت میں آپ ﷺ گھر تشریف لے گئے، گھر پہنچتے ہی کہا: زَمِّلُوْنِي زَمِّلُوْنِي (مجھے چادر اوڑھاؤ! مجھے چادر اوڑھاؤ!) تو آپ کو چادر اوڑھائی گئی، تھوڑی دیر کے بعد جب آپ کی طبیعت میں اطمینان پیدا ہوا تو آپ ﷺ نے پورا واقعہ حضرت خدیجہؓ کے سامنے بیان فرمایا اور کہا: لقد خشيت علی نفسي (مجھے اپنے متعلق خطرہ ہے)[۱] خطرہ کس چیز کا؟ اس کی تشریح اور تعیین کے سلسلہ میں بھی شراحِ حدیث کی بہت ساری باتیں ہیں، لیکن حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں: یہاں دراصل حضور کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے، میں اس ذمہ داری کو کماحقہٗ ادا کر پاؤں گا یا نہیں؟ آپ پر یہ خوف طاری تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی مجھ سے نہ ہو پائے اور میرے لیے یہ رسوائی کا سبب بن جائے۔[۲] کوئی بڑی ذمہ داری کسی کو سونپی جاتی ہے، تو اس میں جہاں اس کے لیے ایک بڑا اونچا مقام ہے وہیں یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ ذمہ داری پوری نہ ہو پائی، تو لوگوں کے درمیان رسوائی ہوگی، یہ ڈر اور خطرہ ہوتا ہے، حضرت گنگوہیؒ نے اسی مطلب کو واضح بتلایا ہے۔ اس پر حضرت خدیجہؓ نے آپ کو اطمینان دلاتے ہوئے جواب میں عرض کیا: إنك لتصل الرحم وتحمل الكل وتكسب المعدوم آپ کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، اور جن کے پاس مال

---

(۱) أخرجه البخاري في بدء الوحي: ۳.

(۲) لامع الدراري ۱/۶-۵ (ط: المكتبة الرشيدية، سهارنبور، يوبي).

نہیں ہے، ان کو کما کر دیتے ہیں، بوجھل مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، مہمانوں کی میز بانی کرتے ہیں، اور قدرتی مصائب کے موقع پر آپ لوگوں کی مدد کرتے ہیں، کلا واللّٰہ لا يخزيك اللّٰه أبدا (اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کو رسوا نہیں کریں گے)[١] جو آدمی اس طرح اللہ کے بندوں کے کام آتا ہو اللہ تعالیٰ کبھی اس کو رسوا نہیں کرتے۔

یہ تو وہی فرشتہ ہے:

یہ جواب اپنی طرف سے دے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مزید اطمینان دلانے کے لیے وہ اپنے چچازاد بھائی حضرت ورقہ بن نوفل کی خدمت میں لے گئیں، مکہ مکرمہ میں اس زمانہ میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا، جو اس وحی وغیرہ کے حقائق سے واقف ہو، ہاں ! مکہ مکرمہ میں ان کے چچازاد بھائی حضرت ورقہ بن نوفل باقاعدہ مکہ مکرمہ سے سفر کر کے شام گئے تھے، وہاں انہوں نے عیسائیوں سے انجیل کی تعلیم حاصل کی تھی، اور عیسائی مذہب اختیار کیا تھا۔ باقاعدہ عبرانی زبان میں انجیل کو لکھتے تھے اور عربی زبان میں اس کا ترجمہ کرتے تھے، بوڑھے ہو گئے تھے، بینائی بھی کمزور ہو گئی تھی، آسمانی کتابوں کے حال سے وہ واقف تھے اور تو کوئی تھا نہیں ایسا مکہ مکرمہ میں !!! حضرت خدیجہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انہی کے پاس لے گئیں اور ان سے کہا کہ: اے میرے چچازاد بھائی ! اپنے بھتیجے کی بات سنیے ! پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انہوں نے پوچھا: کیا ہوا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورا قصہ ان کے سامنے بیان فرمایا، تو انہوں نے جواب میں کہا: یہ تو وہی فرشتہ ہے، جو حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کے پاس وحی لے کر آیا کرتا تھا اور پھر انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ کاش ! اس وقت میں بھی زندہ رہوں، جب آپ

---

(١) أخرجه البخاري في بدء الوحي: ٣.

لوگوں کو یہ پیغام پہنچائیں گے اور لوگ آپ کو وطن سے نکالیں گے، اس وقت اگر میں زندہ رہا، تو آپ کا بھرپور تعاون کروں گا، آپ کی بھرپور مدد کروں گا، اس پر نبی کریم ﷺ نے تعجب سے پوچھا: أَوَ مُخْرِجِيَّ هم؟ (کیا یہ لوگ مجھے نکالیں گے؟) انہوں نے کہا: ہاں! یہ چیز ایسی ہے کہ جو بھی اس سے پہلے اس طرح کی دعوت لے کر کے آیا ہے اس کو لوگوں نے نکالا ہے۔ گویا اس وقت یہ چیز آپ کے ساتھ بھی پیش آنے والی ہے۔[١] بس! یہ پہلی وحی تھی۔

وقفہ:

اس کے بعد ایک مدت تک وحی کا سلسلہ موقوف رہا، پہلی وحی کے بعد آپ پر جو کیفیت طاری ہوئی تھی اس سے آپ کو اطمینان حاصل ہوا، ایک مدت تک اطمینان کے حصول کا آپ کو موقع دیا گیا تھا، اب کتنے دنوں تک وحی کا سلسلہ موقوف رہا؟ اس سلسلہ میں روایتیں مختلف ہیں، محمد بن اسحاقؒ (امام المغازی) فرماتے ہیں: ٣/سال۔[٢] اور عامۃً کتب سیر میں یہی لکھا ہوا ہے، لیکن (١٢/دن، ١٥/دن، ٤٠/دن) ٢/سال، ڈھائی سال اور ٦/مہینے کا بھی قول مذکور ہے، اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اسی ٦/مہینے والے قول کو راجح قرار دیا ہے۔[٣]

اصلی شکل میں پہلا دیدار:

اس کے بعد نبی کریم ﷺ کا غار حرا میں عبادت کے لیے آنا جانا دوبارہ شروع ہوا

---

(١) أخرجه البخاري في بدء الوحي: ٣.

(٢) فتح الباري ١/٢٦ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

(٣) فتح الباري ١/٢٦ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

اوراسی طرح معمول کے مطابق آتے جاتے تھے، حضور ﷺ فرماتے ہیں: ایک دن میں غار سے گھر جانے کے لیے باہر نکلا اور نیچے کھلے میدان میں آیا، اوراچانک میں نے ایک آواز سنی، میں نے اوپر دیکھا، تو وہی فرشتہ جو میرے پاس غار حرا میں وحی لے کر کے آیا تھا وہ آسمان کے بیچ ایک کرسی پر براجمان ہے، گویا حضرت جبریلؑ کو اپنی اصل شکل میں اس موقع پر دیکھا۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ. (التکویر:۲۳) یہ پہلا موقع ہے۔

دثّرونی دثّرونی:

اور دوسرا موقع جب حضور ﷺ معراج میں تشریف لے گئے تھے، تو سدرۃ المنتہٰی پر پہنچے تو حضرت جبریلؑ نے کہا: بس آگے آپ جایئے! اس سے آگے میں نہیں جا سکتا، وہاں بھی حضرت جبریلؑ کو حضور ﷺ نے اپنی اصلی شکل میں دیکھا تھا، اس کا تذکرہ سورۂ والنجم میں ہے: وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (والنجم:۱۳) بہرحال! یہ دو موقعے تھے، جن میں نبی کریم ﷺ نے حضرت جبریلؑ کو اپنی اصلی شکل میں دیکھا۔[۱] (اُس سے آگے کوئی نہیں جا سکتا، دنیا سے جانے والی ساری چیزیں ختم ہوتی ہیں، سدرۃ المنتہٰی بیری کا ایک بڑا حسین وجمیل درخت ہے)

تو آپ نیچے اتر کر وادی میں چل رہے تھے اور اوپر نگاہ پڑی، تو کھلے آسمان میں کرسی کے اوپر معلق دیکھا، جس کی وجہ سے آپ پر ایک گھبراہٹ سی طاری ہوگئی اور آپ نیچے گر گئے، پھر آپ اٹھ کر گھر گئے، گھبرائے ہوئے، اور کہا: دثروني دثروني، مجھے چادر اوڑھاؤ! اور اسی موقع پر سورۂ مدثر یٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ (المدثر:۱-۵) یہ پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔ سورۂ اقرأ کی پانچ آیتیں پہلی وحی

---

(۱) أخرجه البخاري في التفسير برقم: ۴۵۷۴ ومسلم في الإيمان: ۱۷۰۔

میں اور سورۂ مدثر کی پانچ آیتیں دوسری وحی میں نازل ہوئیں، آپ کھڑے ہو جائیے اور لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے۔ اس لیے کہ ابھی تک ایمان لانے والوں کی معقول تعداد نہیں تھی، سب کفر ہی پر تھے، سب کو ڈرانے ہی کی ضرورت تھی، چناں چہ اس کے بعد سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو ایمان کی دعوت دینا شروع کیا، یہ دوسری وحی تھی۔ بخاری شریف میں منقول ہے کہ اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔[١]

وحی کے معنیٰ:

وحی: اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں یا رسل پر پہنچائے جانے والے پیغام کو وحی کہتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے وحی الإعلام بخفية چپکے سے، پوشیدہ طور پر کسی کو کوئی بات بتلانے کو کہتے ہیں۔ اور صاحب مفردات القرآن نے السرعة کا اضافہ بھی کیا ہے۔[٢] تیزی سے اور چپکے سے کہ دوسروں کو پتہ نہ چلے۔ جب بھی آپ پر وحی نازل ہوتی تھی، اس وقت لوگ موجود ہوتے تھے، لیکن لوگوں کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ آپ کے پاس کون سی چیز آئی؟

وحی کا سلسلہ:

وحی کا یہ سلسلہ ٢٣ / سالہ دور نبوت میں آخر عمر تک رہا۔ اور وحی کے نزول کی کل مدت ٢٢ / سال، ٥ / مہینے، ١٤ / دن ہے یعنی اگر ١٧ / رمضان سے حساب لگایا جائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ١١ / یا ١٢ / ربیع الاول کو شمار کی جائے (راجح قول کے مطابق) تو یہ

---

(١) أخرجه البخاري في بدء الوحي: ٤.

(٢) المفردات في غريب القرآن ١/ ٨٥٨ (ط: دار القلم والدار الشامية، دمشق، بيروت).

حساب بنتا ہے۔ اور پورا قرآن اسی درمیان میں نازل ہوا۔ آپ کی سب سے پہلی اور دوسری وحی وہی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا، اور آخری وحی وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (البقرۃ: ۲۸۱) جو سورۂ بقرہ میں ہے، اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدۃ: ۳) یہ قول بھی ہے، اس کو بھی اخیری وحی میں شمار کیا جاتا ہے۔

وحی کی مختلف صورتیں ہوتی تھیں، کبھی تو پوری سورت نازل ہوتی تھی، سورۂ انعام یک بارگی پوری نازل ہوئی ہے، یہ سب سے بڑی وحی ہے، جو ایک وقت میں نازل ہوئی، اور سب سے چھوٹی وحی غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ ہے، یہ ایک موقع پر نازل ہوئی۔

نزولِ وحی کے طرق:

وحی کے لیے کیا طریقہ ہوتا تھا؟ بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت منقول ہے: حضرت حارث بن ہشامؓ - جو فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے - نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا: يا رسول الله! كيف يأتيك الوحي؟ (اے اللہ کے رسول! آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟) تو جواب میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: أحيانًا يأتيني مثل صلصلة الجرس (کبھی تو میرے پاس وحی گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے) جب وحی مکمل ہوجاتی ہے، تو اس وحی کے ذریعہ جو کچھ مجھ پر نازل ہوتا ہے میں اس کو محفوظ کر چکا ہوتا ہوں۔ گھنٹی کی آواز سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں ایک قول یہ ہے کہ یہاں تسلسل مراد ہے، یعنی جب گھنٹی بجتی ہے، تو اس کی آواز مسلسل ہوتی ہے اور مسلسل بجنے کی صورت میں اس کی آواز کی جہت بھی متعین نہیں ہوتی، اگر لگاتار گھنٹی بجائی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف سے آواز آرہی ہے۔ گویا وحی کی آواز تسلسل کے ساتھ اور ہر جہت

سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اسی کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا: وھو أشدہ علیّ، وحی کے آنے کے جو طریقے ہیں ان میں سب سے زیادہ سخت طریقہ یہی ہے۔ حضرت عائشہؓ اس کے متعلق فرماتی ہیں کہ سخت سردی کے زمانہ میں جب آپ پر وحی آتی، تو آپ ﷺ کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو جاتی۔[۱] اس سے وحی کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ کی سانس خراٹوں کی طرح ہوا کرتی تھی۔

دوسرا طریقہ جو اسی روایت میں حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: فرشتہ میرے پاس انسانی شکل میں آتا ہے، حضرت جبریلؑ انسانی شکل میں تشریف لاتے، مگر دوسرے لوگ نہ دیکھ سکتے، آپ ﷺ کے پاس جب بھی انسانی شکل میں آتے، تو حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ (ایک صحابی ہیں، بڑے حسین وجمیل تھے، دیگر ممالک میں جاتے، تو ان کو دیکھنے کے لیے عورتیں اور بچے باہر نکل پڑتے تھے، اتنے حسین تھے) کی شکل میں حضور ﷺ کے پاس آتے تھے۔[۲] جن لوگوں کو نظر آئے ان کے متعلق یہ منقول ہے کہ آخر عمر میں ان کی بینائی ختم ہوگئی، ایک مرتبہ حضرت عباسؓ حضور ﷺ کی ملاقات کے لیے آئے، سلام کیا، لیکن حضور ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا، توجہ نہیں فرمائی، ان کے ساتھ صاحب زادے حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی تھے، تو حضرت عباسؓ شکوہ کرنے لگے: کیا بات ہے حضور ﷺ میرے سلام کا جواب نہیں دے رہے ہیں؟ میری طرف توجہ نہیں کر رہے ہیں؟ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا: آپ دیکھتے نہیں کہ حضور ﷺ حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی کے ساتھ

---

(۱) أخرجه البخاري في بدء الوحي برقم: ۲.

(۲) أخرجه النسائي في سننه برقم: ۴۹۹۱ (ط: مكتب المطبوعات الإسلامية، حلب) والطبراني في الأوسط برقم: ۷ (ط: دار الحرمين، القاهرة) وفي الكبير برقم: ۷۵۸ (ط: مكتب ابن تيمية، القاهرة).

بیٹھے ہوئے بات کر رہے ہیں ۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا: وہ حضرت جبرئیل تھے)[1] تو حضرت عباس ﷺ کو نظر نہیں آئے، حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کو نظر آئے ۔اس کا اثر یہ ہوا کہ آخری زمانے میں ان کی بینائی باقی نہیں رہی ۔ یہ بھی منقول ہے۔[2] یہ دو طریقے تو عام طور پر قرآن کی وحی کے تھے۔

اس کے علاوہ دیگر شکلیں بھی تھیں، حضرت جبریلؑ اپنی اصلی شکل میں دو مرتبہ نظر آئے تھے۔اور پھر معراج کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچے، تو وہاں براہ راست اللہ تعالیٰ سے بات ہوئی۔ چناں چہ زندگی میں یہ ایک ہی موقع ہے، ورنہ دنیا میں تو بات ہو ہی نہیں سکتی۔ نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز آپ ﷺ کے قلب مبارک میں ڈالی جاتی، یہ بھی وحی کی شکل تھی ۔کبھی حضرت جبریلؑ کی طرف سے آپ ﷺ کے قلب میں بات ڈالی جاتی، کبھی خواب میں کوئی چیز دکھلائی جاتی، نبی کا خواب بھی وحی کے حکم میں ہوتا ہے۔اسی لیے حضرات صحابہؓ کا معمول تھا کہ کہیں سفر میں نبی کریم ﷺ اگر آنکھ بند ہونے کی حالت میں لیٹے ہوئے ہوتے، تو کوئی بھی صحابی آپ کو نہ جگاتا، اس لیے کہ پتہ نہیں اس حالت میں کہیں آپ ﷺ پر وحی نازل نہ ہو رہی ہو۔

ایک سفر میں رات کے آخری حصے میں سب کے اصرار پر نبی کریم ﷺ نے پڑاؤ ڈالا، چناں چہ سب لیٹ گئے، لیٹتے ہی سب کی آنکھ لگ گئی، حتیٰ کہ سورج نکل آیا، سب سے پہلے ایک صحابی اٹھے، پھر دوسرے اٹھے، پھر تیسرے اٹھے، پھر چوتھے نمبر پر حضرت عمرؓ اٹھے، ان میں سے ایک صحابیؓ کہنے لگے کہ حضور ﷺ اب بھی لیٹے ہوئے ہیں۔ ہم حضور کو

---

(١) أخرجه أحمد بن حنبل في مسنده: ٢٦٧٤ و ٢٨٤٣ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت).

(٢) أخرجه الحاكم في المستدرك: ١ ٣٤ ٦ (ط: دار المعرفة، بيروت) والطبراني في الأوسط: ٣٨٣٣ (ط: مكتب المعارف).

کبھی خواب سے بیدار نہیں کرتے اس وجہ سے کہ کہیں آپ ﷺ پر وحی نازل نہ ہو رہی ہو اور ہم جگا دیں، تو وحی کا انقطاع ہو جائے۔ حضرت عمرؓ جب اٹھے تو ویسے تو نہیں جگایا، لیکن زور زور سے اللہ اکبر کہنے لگے، تو اس آواز کو سن کر حضور ﷺ کی بھی آنکھ کھل گئی۔[1] اور ہر نبی کا خواب وحی ہوتا ہے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیلؑ کو خواب میں ذبح کرتے ہوئے دیکھا، تو اس کو وحی پر ہی محمول کیا۔ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى (الصّٰفّٰت: ١٠٢) قرآن میں اس کا تذکرہ ہے۔ وحی کی بنیاد پر ہی اس کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ اور بھی کچھ طریقے بتلائے جاتے ہیں، لیکن زیادہ تر قرآن کی وحی جو آپ ﷺ پر نازل ہوتی تھی وہ پہلی دو شکلوں میں ہوا کرتی۔ اس طرح پورا قرآن آپ کے پورے دورِ نبوت کے دوران نازل ہوا۔

مکی و مدنی سورتیں:

مکہ مکرمہ میں آپ ﷺ کے قیام کے زمانے میں کچھ سورتیں نازل ہوئیں، ان کو مکی سورتیں کہا جاتا ہے، اور بعض مکی سورتیں ایسی بھی ہیں جن میں کچھ آیتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں، تو ان کو اکثر آیتوں کے اعتبار سے مکی کہا جاتا ہے۔ ٨٧/سورتیں مکی ہیں اور ٢٧/سورتیں مدنی ہیں دونوں کو ملانے سے ١١٤/ہو جاتی ہیں۔[2] حضور اکرم ﷺ کے مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے جانے سے پہلے جتنی بھی سورتیں نازل ہوئیں، وہ سب مکی کہلاتی ہیں، حتیٰ کہ ہجرت کے سفر کے دوران مدینہ منورہ پہنچنے سے قبل بھی جو سورتیں نازل ہوئیں، وہ سب بھی مکی ہی کہلاتی ہیں۔ اور مدینہ پہنچنے کے بعد جتنی بھی آیتیں یا سورتیں نازل ہوئیں،

---

(١) أخرجه البخاري في صحيحه: ٣٣٧.

(٢) نقله ابن عباس عن أبي بن كعب رضي الله عنه. الإتقان فی علوم القرآن ١/ ٣٨ (ط: الهيئة المصرية العامة للكتاب).

وہ سب مدنی کہلاتی ہیں ۔ چاہے وہ مکہ میں نازل ہوئی ہوں ۔(هذا أحد الأقوال و عليه الجمهور)

چابی مجھے دے دیجیے:

آپ ﷺ مکہ مکرمہ فتح کرنے کی غرض سے حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے، تو آپ نے کعبۃ اللہ کی چابی منگوائی اور کعبۃ اللہ کھولا گیا اور چابی آپ کے ہاتھ میں تھی، اسی حالت میں آپ نے خطبہ دیا، جب آپ خطبہ سے فارغ ہوئے، حضرت عباس ؓ نے کھڑے ہوکر آپ ﷺ سے چابی کا مطالبہ کیا، آپ چابی مجھے دے دیجیے تاکہ حاجیوں کو پانی پلانے (سقایہ) کے ساتھ ساتھ کعبۃ اللہ کی کلید برداری کا عہدہ بھی مجھے مل جائے ۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا.(النساء :۵۸) یہ عین کعبہ میں نازل ہوئی۔[۱] پھر بھی اس کو مدنی کہیں گے، مکی نہیں کہیں گے، اس لیے کہ وہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی، تو ہجرت کے بعد جتنی بھی آیتیں نازل ہوئیں چاہے وہ مدینہ میں ہوں یا مدینہ سے باہر کسی سفر میں ہوں یا مکہ مکرمہ ہی میں کیوں نہ ہوں، حجۃ الوداع یا فتح مکہ کے موقع پر، تو وہ بھی مدنی ہی کہلاتی ہیں۔ ہجرت سے پہلے جو نازل ہوئیں وہ مکی کہلاتی ہیں۔ تو مکی سورتیں ۸۷/ ہیں اور مدنی سورتیں ۲۷/ ہیں، کل ۱۱۴/ ہو جاتی ہیں ۔ یہ قرآن پاک کے نزول کی تفصیل ہے۔

:

(۱) راجع "لباب النقول في أسباب النزول" للسيوطي ۲۰/۱ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

سورۂ فاتحہ

(قسط-۱)

(مؤرخہ ۸/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۷/جنوری ۲۰۱۸ء)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ۞ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۞

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ؕ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ؕ﴿۴﴾ اِهۡدِ نَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ۬ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا الضَّآلِّيۡنَ ﴿۷﴾

سب سے پہلے مکمل نازل ہونے والی:

یہ سورۂ فاتحہ ہے، جو قرآن پاک کی موجودہ ترتیب میں سب سے پہلی سورت ہے، نزول کے اعتبار سے تو پہلی نہیں ہے، سب سے پہلے سورۂ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل

ہوئیں اور ان کے بعد سورۂ مدثر کی پانچ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔سب سے پہلے مکمل نازل ہونے والی سورت، سورۂ فاتحہ ہے۔اور یہ مکی ہے، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ دوبارہ اس کا نزول مدینہ منورہ میں بھی ہوا۔گویا مکی بھی ہے اور مدنی بھی ہے۔

یہ سات آیتیں ہیں ، البتہ سات آیتوں کی تعیین کے سلسلہ میں ائمہ کے درمیان تشریح میں قدرے اختلاف ہے:

امام شافعیؒ کے نزدیک بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ بھی سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت ہے اور ان کے نزدیک صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۙ۬ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ یہ پوری ایک آیت ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ سات آیتیں ہیں۔اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ یہ پہلی ہے اور صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ پر چھٹی آیت ختم ہوتی ہے اور غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ پر ساتویں آیت مکمل ہوتی ہے۔اس طرح سات آیتیں ہیں،اس پر سب کا اتفاق ہے۔

سورۂ فاتحہ کے مختلف نام:

اس سورت کے بہت سارے نام ہیں:

(۱) علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب ’’الاتقان فی علوم القرآن‘‘ میں ۲۵ ؍نام بتائے ہیں۔[۱] ان میں سب سے زیادہ مشہور نام الفاتحة ہے۔الفاتحہ یعنی وہ سورت جس سے قرآن پاک کی ابتداء ہورہی ہے۔قرآن پاک کے دیباچہ، پیش لفظ (પ્રસ્તાવના) کے طور پر،گویا قرآن پاک کی ابتداء اسی سورت سے ہورہی ہے، نیز نماز کی ابتداء بھی اسی سورت سے ہوتی

(۱) الإتقان في علوم القرآن ۱/۱۹۱ (ط: الهيئة المصرية العامة للكتاب).

ہے اس اعتبار سے اس کو الفاتحۃ نام دیا گیا ہے۔

(۲) فاتحۃ القرآن.

(۳) أم الکتاب اور أم القرآن: قرآن پاک کے مضامین کو اجمالی طور پر اس سورت میں بیان کردیا گیا ہے، لہٰذا اس کو ام الکتاب اور ام القرآن کا نام دیا گیا ہے۔

(۴) السبع المثاني: مثانی، مثنیٰ کی جمع ہے، جس کا تکرار کیا جائے، یعنی وہ سات آیتیں جن کو بار بار پڑھا جاتا ہے، کیوں کہ نماز کی ہر رکعت میں اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔

(۵) سورۃ السوال و سورۃ المناجاۃ: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذات سے مانگنے کا طریقہ اس سورت میں سکھلایا ہے۔

(۶) سورۃ الحمد: اس کی شروعات اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے ہوتی ہے، ابتداءً اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی گئی ہے اس معنیٰ کی وجہ سے اس کو سورۃ الحمد بھی کہتے ہیں۔

(۷) سورۃ الصلاۃ: نماز کی ہر رکعت کے اندر یہ پڑھی جاتی ہے۔

چناں چہ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد نقل کرتے ہوئے فرمایا: قسمت الصلاة بيني و بين عبدي نصفين (میں نے صلاۃ کو (یعنی سورۂ فاتحہ) کو اپنے اور بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کیا) چناں چہ بندہ جب الحمد للہ رب العٰلمین پڑھتا ہے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: حمدني عبدي (میرے بندے نے میری حمد وتعریف کی)۔

جب بندہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہتا ہے، تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: أثنیٰ علي عبدي (میرے بندے نے میری ثنا بیان کی)۔

جب بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: مجّدني عبدي

(میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی)۔

جب بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: هذا بيني و بين عبدي و لعبدي ما سأل (یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میرے بندے کو وہ مل گیا/مل جائے گا، جو اس نے مانگا)[۱]

اس کے بعد جو آیت بندہ پڑھتا ہے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: هذا لعبدي و لعبدي ما سأل (یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کو وہ مل جائے گا/ دیا جائے گا، جو اس نے مانگا)۔

اس میں نصف (ساڑھے تین آیتیں) بندے کی درخواست کی شکل میں ہے، اور ساڑھے تین آیتیں اللہ کی حمد ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے اس سورت کو اپنے اور بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کیا ہے۔

(۸) سورة الشفاء: اس کو پڑھ کر دم کرنے سے بیماریوں سے شفا حاصل ہوتی ہے۔

بخاری شریف میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا واقعہ موجود ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک دستہ کسی علاقے میں بھیجا، جب صحابہ رضی اللہ عنہم وہاں پہنچے تو بستی والوں نے اُن کی میزبانی نہیں کی، حالاں کہ اصول کے مطابق ان کو میزبانی کرنی چاہیے تھی، پھر اتفاق سے اس قبیلے والوں کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا، ان لوگوں نے اس کا زہر اتارنے کے لیے اپنی ساری تدبیریں کر لیں، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا، تو ان لوگوں نے سوچا کہ یہ لوگ آئے ہیں، ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی جھاڑنا جانتا ہو، چناں چہ یہ لوگ اُن صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کے پاس آئے، پوچھا: تم لوگوں میں کوئی جھاڑنے والا ہے؟ تو حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے

---

(۱) أخرجه مسلم: ۳۹۵.

جواب میں کہا: ہاں! میں جھاڑنا جانتا ہوں، لیکن تم نے ہماری میزبانی تو کی نہیں! اس لیے ہم علاج نہیں کریں گے۔ اس کے بعد پھر ان کے ساتھ معاملہ ہوا، اور ۳۰ یا ۴۰ بکریاں طے ہوئیں، اور حضرت ابوسعید خدریؓ نے سورۂ فاتحہ پڑھ پڑھ کر اس پر دم کیا، تو سانپ کے زہر کا اثر ختم ہو گیا۔ اب ان بکریوں کا کیا کریں؟ تو ساتھیوں نے کہا: تقسیم کرلیں، تو حضرت ابوسعید خدریؓ نے کہا: نہیں! ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پوری بات پیش کریں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے متعلق جو فیصلہ فرمائیں گے، اس پر عمل ہوگا۔ چناں چہ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سارا واقعہ بیان کیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے فرمایا: تمھیں کیسے پتہ چلا کہ اس سے جھاڑا جاتا ہے؟ اور پھر جو معاوضہ لیا گیا تھا اس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھنے کی اجازت دے دی کہ اس کو تقسیم کرلو، اور اس کے اندر میرا بھی حصہ رکھو۔[۱] لہٰذا یہ سورۂ شفا ہے، کسی بھی بیماری میں پڑھ کر دم کیا جائے، تو اس بیماری میں شفا ہوتی ہے۔

سورۂ فاتحہ کے ذریعہ دم:

بعضوں نے شفا کے مخصوص طریقے بھی بیان کیے ہیں۔

حضرت شیخؒ نے فضائل قرآن کے اخیر میں مخصوص سورتوں کے فضائل کے تحت سورۂ فاتحہ کے سلسلہ میں مشائخ کا عمل تحریر فرمایا ہے کہ کوئی آدمی اگر سورۂ فاتحہ کو بسم اللہ سمیت- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی میم کو الحمد کے لام کے ساتھ ملا کر- فجر کی نماز اور سنتوں کے درمیان ۴۱/مرتبہ، ۴۰/روز تک پڑھے گا، بیمار پر دم کرے گا یا پانی پر دم کر کے پلائے گا تو اس سے شفا حاصل ہوگی۔ (فضائلِ اعمال ۱/ ۵۴۵ط: ادارۂ دینیات ممبئی)

(۹) سورۂ وافیہ۔

---

(۱) أخرجه البخاري: ۲۱۵۶.

(۱۰) سورۂ کافیہ۔

فضائلِ سورۂ فاتحہ:

اس سورت کے بڑے فضائل بھی وارد ہوئے ہیں، بخاری شریف میں اس کی فضیلت کے سلسلہ میں روایت آئی ہے: حضرت ابوسعید بن معلیٰؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ مسجد نبوی میں نماز پڑھ رہا تھا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے آواز دی، تو نماز میں ہونے کی وجہ سے میں فوراً نہیں گیا، میں نماز پوری کر کے پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے بلایا تو فوراً کیوں نہیں آئے؟ کیا تم نے قرآن پاک کی یہ آیت نہیں پڑھی؟ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ. (الانفال:۲۴) (اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو، جب کہ وہ تم کو ایک ایسی چیز کے لیے پکاریں، جس میں تمہارے لیے حیات ہے) تو حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں نماز میں تھا۔

اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دورانِ صلوٰۃ بلائیں تو......:

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاویں اور وہ نماز میں ہو تو اس کے لیے جواب دینا واجب ہے۔ اور اس جواب کی وجہ سے نماز ٹوٹ جائے گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔

اکثر شافعیہ وحنابلہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی، اِن میں سے بعض جواز کے قائل ہیں۔ بعض احناف نماز کے ٹوٹنے کے قائل ہیں جیسے امام طحاویؒ وغیرہ۔ شوافع میں سے حافظ ابن حجرؒ نے ٹوٹنے کا حکم لگایا ہے، اور احناف میں سے بھی بعض نے

ٹوٹنے کا حکم لگایا ہے۔ ہاں! جواب دینا ضروری ہے اس پر تو سب کا اتفاق ہے۔ حضرت ابوسعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میں تمھیں مسجد سے نکلنے سے قبل ایک ایسی سورت بتلاؤں گا، جو قرآن کے اندر تمام سورتوں میں سب سے عظیم ہے، پھر حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لیا اور چلنے لگے، چلتے چلتے جب مسجد کے دروازے تک پہنچے، اب تک وہ سورت بتلائی نہیں، مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں دروازے سے باہر نہ نکل جائیں، تو میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا تھا کہ مسجد سے نکلنے سے پہلے تم کو قرآن کی سورتوں میں سب سے عظیم سورت بتلاؤں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ہے الحمد للہ رب العٰلمین. هي السبع المثاني و القران العظيم الذي أوتيتُه یہی وہ سات آیتیں ہیں جن کا تکرار کیا جاتا ہے، اور یہی وہ قرآن عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے دیا گیا ہے۔[۱]

دو نور:

مشکوٰۃ شریف میں بحوالۂ مسلم شریف ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، اور آسمان سے ایک آواز سنائی دی، آپ ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا کہ آج آسمان کا ایک دروازہ کھلا، جو آج تک کبھی نہیں کھلا تھا اور اس میں سے ایک فرشتہ نیچے آ رہا ہے، جو کبھی زمین پر نہیں آیا تھا، اس فرشتے نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کو مبارک باد دینے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ ﷺ کو دو ایسے نور اللہ تعالیٰ کی طرف سے

---

(۱) أخرجه البخاري: ۴۴۲۶.

دیے گئے کہ آپ ﷺ سے پہلے دیگر انبیاء کرامؑ کو عطا نہیں کیے گئے، ایک تو سورۂ فاتحہ اور دوسرا سورۂ بقرہ کی اخیری آیتیں، اور یہ دعا جو بھی مانگے گا اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں گے۔[١] یہ بھی سورۂ فاتحہ کی فضیلت میں شامل ہے۔

ترمذی شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے سورۂ فاتحہ ایک ایسی سورت عطا فرمائی جو نہ تورات میں ہے، نہ زبور میں ہے، نہ انجیل میں ہے، نہ قرآن میں اس جیسی کوئی سورت ہے۔ گویا کسی کتاب میں اس کا کوئی بدل موجود نہیں ہے۔ اور یہی وہ سات آیتیں اور یہی وہ قرآن عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔[٢]

تعوذ کا حکم:

أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

ترجمہ: پناہ مانگتا ہوں میں اللہ تعالیٰ کی شیطان مردود سے۔

قرآن پاک کی تلاوت کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. (النحل: ٩٨) (اے نبی! آپ جب قرآن پڑھنا شروع کریں تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کریں) اس حکم کی وجہ سے قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے تعوذ یعنی اعوذ باللہ پڑھنا مسنون قرار دیا گیا ہے۔ اور تعوذ کے الفاظ عام طور پر جو حدیث شریف میں آئے ہیں وہ أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ہیں، اور بعض نے أعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم بھی بتایا ہے، لیکن زیادہ مشہور یہی ہے جو عام طور پر ہم پڑھتے ہیں۔

---

(١) أخرجه مسلم: ٨٠٦

(٢) أخرجه البخاري: ٤٤٢٦.

اور یہ صرف قرآن کی تلاوت سے پہلے ہے، چاہے قرآن کی تلاوت نماز میں ہو چاہے نماز سے باہر ہو، نماز میں بھی جب پہلی رکعت میں قرآن شروع کیا جائے، تو اس سے پہلے اعوذ باللہ پڑھی جائے گی۔

ہر رکعت میں تعوذ پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ یا صرف پہلی رکعت میں پڑھا ہوا سب کے لیے کافی ہے؟

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ: ہر رکعت میں پڑھنا ضروری نہیں ہے، پہلی رکعت میں پڑھا ہوا بعد کی رکعتوں کے لیے بھی کافی ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک ہر رکعت میں پڑھنا مستحب قرار دیا گیا ہے۔

اور تلاوت کے دوران اگر کسی دنیوی چیز میں مشغول ہوں جیسے: کسی کے ساتھ بات کر لی یا کوئی چیز کھا-پی لی، تو اس صورت میں دوبارہ تعوذ پڑھا جائے گا۔ یہ تعوذ کا حکم ہے۔
اور تعوذ قرآن کے ساتھ خاص ہے، قرآن کے علاوہ آپ کوئی اور کتاب پڑھیں یا کوئی اور مضمون پڑھیں تو اس کے شروع میں اعوذ باللہ پڑھنے کا حکم نہیں ہے، اور مسنون بھی نہیں ہے۔ یہ قرآن کی خصوصیت اور امتیاز ہے۔ حکمت یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرے گا تو اس میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ شیطان اس کے فہم وفکر میں کہیں گمراہی کا کوئی پہلو داخل نہ کر دے، تو اس سے حفاظت کے لیے تعوذ کا حکم دیا گیا ہے۔

تسمیہ کا حکم:

قرآن کی تلاوت سے پہلے تسمیہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی پڑھنا چاہیے۔
قرآن پاک میں ایک بسم اللہ تو سورۂ نمل کی ایک آیت کا ایک حصہ ہے اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (النمل:۳۰) اس کی پوری آیت بھی نہیں، آیت کا ایک حصہ ہے، وہ تو قرآن پاک کا جزء ہے ہی، اس پر تو سب کا اتفاق ہے۔ اس کے علاوہ قرآن پاک میں سورۂ توبہ کے علاوہ ۱۱۳؍ سورتوں کے اوپر بسم اللہ لکھی گئی ہے، اس سلسلہ میں تین نظریات ہیں:

(۱) امام مالکؒ کا نظریہ یہ ہے کہ نہ تو قرآن پاک کا جز ہے نہ ہی سورتوں کا جز ہے، اس کو امام مالک سورتوں کا جز بھی نہیں مانتے اور قرآن کا جز بھی نہیں مانتے۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ایک مستقل آیت ہے (سورۂ نمل کے علاوہ) جو اللہ تعالیٰ نے دو سورتوں کے درمیان فاصلہ کرنے کے لیے نازل فرمائی ہے، چناں چہ حضور ﷺ پر جب یہ آیت نازل ہوتی تھی تو حضور ﷺ کو پتہ چل جاتا تھا کہ ایک سورت ختم ہوئی اور دوسری سورت شروع ہو رہی ہے۔ گویا فصل بین السور کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمائی ہے، تو یہ ایک آیت، تمام سورتوں کے شروع میں لکھی گئی ہے۔

بسملہ تمام سورتوں کا یا سورۂ فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں؟

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک مستقل آیت ہے ۱۱۳؍ آیتیں نہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کو پورے قرآن میں ایک آیت شمار کیا گیا ہے، اور صحابہ کے آپس کے اجماع سے اس کو تمام سورتوں کے شروع میں لکھا گیا۔

(۳) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ۱۱۳؍ آیتیں ہیں، تو اس اعتبار سے آیتوں کی تعداد بڑھ جائے گی، اور جس سورت پر وہ لکھی گئی ہے، اس سورت کا وہ جز اور حصہ ہے۔ سورۂ فاتحہ کے متعلق تو تمام شافعی حضرات کا اتفاق ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے۔ باقی سورتوں میں علماءِ شوافع کے درمیان دو قول ہیں؛ لیکن راجح قول یہی ہے کہ باقی سورتوں کا بھی حصہ

ہے۔گویا ان کے نزدیک بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ توبہ کے سوا ہر سورت کا حصہ ہے۔
اور درمیان میں بھی ایک سورت پوری کر کے جب دوسری سورت شروع کریں گے، تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی جائے گی ،لیکن جب درمیان میں سورۂ توبہ شروع کریں گے تو وہاں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھی جائے گی۔ ہاں! جب ابتداءً سورۂ توبہ ہی سے تلاوت شروع کر رہے ہیں، تو اس سورت میں أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی جائے گی۔اس لیے کہ قرآن کی تلاوت کے شروع میں أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی پڑھی جاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترجمہ: شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان اور بڑا مہربان ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں بؔ ہے اور اسمؔ ہے اور لفظ اللہ ہے۔ب کو اسم کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔عربی زبان میں ب مختلف معانی کے لیے آتا ہے۔ان معانی میں سے تین معنیٰ یہاں مراد لیے جاسکتے ہیں۔

(۱) مصاحبت: ایک چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ متصل ہونا۔

(۲) استعانت: کسی چیز سے مدد حاصل کرنا۔

(۳) تبرک: کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

اِن تینوں اعتبار سے معنیٰ یوں ہوں گے:

اگر مصاحبت والا معنیٰ مراد لیں تو مطلب ہوگا ’’اللہ کے نام کے ساتھ‘‘۔

اگر استعانت والا معنیٰ مراد لیں تو مطلب ہوگا ’’اللہ کے نام کی مدد سے‘‘۔

اور اگر تبرک والا معنیٰ مراد لیں تو مطلب ہوگا ’’اللہ کے نام کی برکت سے میں شروع

کررہاہوں“۔

لفظ اللہ یہ ذاتی نام ہے اور الرحمٰن اور الرحیم یہ صفاتی نام ہیں۔یعنی اس میں اللہ کی صفت بیان کی گئی ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ کے ۱۰۰ ر سے بھی زیادہ صفاتی نام ہیں،تو حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک ذات کے اگر مختلف نام ہوں،تو وہ اس کے اوصاف اور کمالات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ ذات بہت سارے اوصاف کی جامع ہے۔اوران اوصاف کو تعبیر کرنے کے لیے ڈکشنری اور لغت میں کوئی ایک لفظ نہیں ہے،اس لیے الگ الگ الفاظ سے اُن اوصاف کو ظاہر کیا جاتا ہے،یہی صفاتی نام کہلاتے ہیں۔جیسے کسی کو مولانا، حافظ، قاری، مولوی،مفتی کہا جاتا ہے،تو ایک شخص کے اندر بہت ساری خوبیاں ہیں، وہ قرآن کا حافظ بھی ہے،قرآن کو عمدہ طریقے سے پڑھنے کا طریقہ بھی اس نے سیکھا ہوا ہے، عالم بھی ہے،قرآن کے مطالب سے بھی واقف ہے اور فتویٰ دینے کا طریقہ بھی جانتا ہے۔یہ مختلف کمالات ہیں ان کمالات کو تعبیر کرنے کے لیے کوئی ایک لفظ موجود نہیں ،اس لیے اس کے ساتھ مختلف صفاتی نام جوڑے گئے۔تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کمالات کو اور اس کے اوصاف کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے بہت سارے نام ہیں۔اسی طرح نبی کریم ﷺ کے بھی بہت سارے صفاتی نام ہیں۔لہٰذا سورۂ فاتحہ کے جو بہت سارے نام بتلائے گئے وہ اسی طرح سمجھے جائیں گے کہ سورۂ فاتحہ کے اندر بہت سارے اوصاف اور خوبیاں ہیں،ان خوبیوں کو تعبیر کرنے کے لیے کوئی ایک لفظ نہیں تھا اس لیے مختلف اور الگ الگ نام اس کے لیے وضع کیے گئے۔

الرحمٰن الرحیم

لفظ رحمٰن اور رحیم دونوں رحمت سے بنے ہیں۔لیکن دونوں کے مفہوم میں فرق ہے۔

لفظ رحمٰن اللہ کی رحمت کے عموم کو بتلاتا ہے یعنی اللہ کی رحمت سب کو شامل ہے، عامۃً اس کا ترجمہ کرتے ہیں؛ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ لیکن حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ''شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے'' گویا دنیا میں جتنی بھی مخلوقات ہیں، ان میں کوئی ایسی مخلوق نہیں جس کو اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہو۔ تمام انسان، تمام جانور، تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل ہے، لہٰذا رحمت کے عموم کو بتلانے کے لیے رحمٰن سے تعبیر کیا گیا۔

اور رحیم کا لفظ رحمت کے کمال کو بتلانے کے لیے ہے، یعنی وہ بڑا مہربان ہے، اس کی رحمت کامل اور مکمل ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت تمام مخلوقات کو شامل ہے اس لیے لفظ رحمٰن کا اطلاق دنیوی اعتبار سے ہے۔ اور آخرت میں اللہ کی رحمت جس کو بھی شامل ہوگی پورے طور پر شامل ہوگی۔ اس لیے کہ دنیا کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں رحمت کامل طور پر شامل نہیں ہوسکتی ہے، دنیا میں اس کی صلاحیت ہی نہیں ہے، گویا دنیا کا ظرف اس لائق نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل رحمت اس مخلوق کو حاصل ہوسکے۔

اللہ تعالیٰ نے تین دار بنائے ہیں:

(۱) جنت: جس میں خیر ہی خیر ہے، وہاں شر کا شائبہ نہیں۔

(۲) جہنم: جس میں شر ہی شر ہے، وہاں خیر کا کوئی شائبہ نہیں۔

(۳) دنیا: جس میں خیر اور شر دونوں ملے ہوئے ہیں۔ یہاں کوئی خوشی ایسی نہیں جس کے ساتھ غم کی ملاوٹ نہ ہو۔ دنیا کی بناوٹ ہی اللہ تعالیٰ نے ایسی رکھی ہے، اس لیے یہاں اللہ کی رحمت جس کسی کو بھی حاصل ہوگی وہ کامل حاصل ہو ہی نہیں سکتی، کیوں کہ دنیا کے حالات کے اعتبار سے اس میں وہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اللہ کی رحمت اپنی جگہ پر ہے؛

لیکن وہ مقام اور وہ محل، وہ جگہ ایسی نہیں ہے جس میں اللہ کی رحمت کامل طور پر آسکے۔ ظرف اور برتن میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا دنیا میں اللہ کی رحمت کسی پر کامل نہیں ہوگی، کامل تو آخرت ہی میں ہوگی۔ دنیا میں سب کو شامل ہے، کوئی ایسی مخلوق نہیں ہے جس کو اللہ کی رحمت شامل نہ ہو۔ اس لیے اس کا ترجمہ اس طرح کریں گے: ''شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان، بڑا مہربان ہے۔''

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

حمد: لغتاً کسی کے ذاتی کمالات کی بنیاد پر تعریف کرنا۔

مدح: کسی کے ذاتی کمال یا دوسرے کی دَین پر کی جانے والی تعریف پر مدح کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسے تاج محل بڑا خوب صورت ہے اس کی تعریف کی جاتی ہے، تو تاج محل کی خوب صورتی اور کمال اپنا ذاتی نہیں ہے، بلکہ وہ کاریگر کی محنت کے نتیجے میں ہوا، اور کاریگر کی محنت اور اس کا فن بھی اس کا ذاتی کمال نہیں ہے، بلکہ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ سو اس اعتبار سے دنیا میں جتنے بھی اربابِ کمال ہیں کسی کا بھی کمال اپنا ذاتی نہیں ہے، سب اللہ کا دیا ہوا ہے۔ تو لفظ ''حمد'' اللہ کے علاوہ کسی کے لیے بھی نہیں بولا جائے گا۔ اس لیے کہ حمد کا لفظ اُسی تعریف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جو ایسے کمال پر کی گئی ہو جو ذاتی ہو، اور دنیا کی مخلوقات میں جس کا جو بھی کمال ہے وہ ذاتی نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اس لحاظ سے اس کو حمد نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کو مدح کہیں گے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

حمد اسم جنس ہے یعنی تمام تعریفیں۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مختلف انواع واجناس

پیدا فرمائیں۔ جیسے انسان، جنات، جانوروں کی مختلف انواع، چرند و پرند، جمادات، نباتات ہر ایک کا ایک جہاں ہے، ایک انسانوں کا جہاں ہے، ایک جناتوں کا جہاں ہے، ہر مخلوق کا ایک الگ عالم ہے۔ پوری دنیا گویا بہت سارے عالموں کا مجموعہ ہے۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے تمام (انسان، جنات، جانوروں کی مختلف اجناس و انواع) کا پالنے والا اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں جو دنیا ہمیں نظر آرہی ہے، اس کے علاوہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سارے ایسے جہاں پیدا کیے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے، لیکن آج کل سائنس دانوں کی تحقیق یہ ہے کہ ہماری اس دنیا کے چاند اور سورج ہیں، یہ ہماری کہکشاں (Galaxy) ہیں۔ اس دنیا کے علاوہ بہت ساری کہکشائیں ہیں۔

ابھی دو روز قبل ہی اس سلسلہ میں ایک مضمون سامنے آیا تھا، تو میں نے اس کو بھی نوٹ کرلیا۔ اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کتنی بڑی ہے اور اللہ تعالیٰ کی پرورش اور تربیت کتنی عظیم الشان ہے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

چناں چہ مضمون نگار نے لکھا ہے:

''جس زمین پر ہم رہتے ہیں وہ ایک عام آدمی کے حجم کے مقابلہ میں بیس ارب کھرب گنا بڑی ہے، جب کہ ہمارا سورج ہماری زمین سے دس لاکھ گنا ہے، اس کے مقابلے میں Etacarainae نامی مشہور ستارہ ہمارے سورج سے بھی پچاس لاکھ گنا بڑا ہے، اس کے بعد Betel Geuse نامی ستارے کا نمبر آتا ہے، جو ہمارے سورج سے تیس کروڑ گنا بڑا ہے، اور vy canismajioris نامی ستارے کی بڑائی کا کیا ہی کہنا! یہ ستارہ ہمارے

سورج سے ایک ارب (یعنی ۱۰۰ ارکروڑ) گنا بڑا ہے۔کیا آپ کو معلوم ہے کہ جس کہکشاں میں ہم رہتے ہیں اس کا نام Milky way ہے، (یعنی ہمارے سورج چاند کو گجراتی میں આકાશગંગા کہتے ہیں، اسی کو کہکشاں کہا جاتا ہے)اور ہماری صرف ایک کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے تین سو ارب سے زائد سورج موجود ہیں، اور یہ کہکشاں اتنی بڑی ہے کہ اگر ہم کسی ایسی چیز میں سوار ہوں جو ایک سکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے یعنی ایک سکنڈ میں زمین کے سات چکر لگانے والی ہو تو اُس کو بھی ہماری کہکشاں کو پار کرتے کرتے ایک لاکھ سال لگ جائیں گے۔اندازہ ہوا نا کہ ہماری کہکشاں کتنی بڑی ہے! لیکن نہیں، آئیں! ہم آپ کو اپنی پڑوسی کہکشاں میں لیے چلتے ہیں، اس کا نام Andromeda ہے وہ ہماری کہکشاں سے دوگنی ہے یعنی دو لاکھ سال لگ جائیں گے؛ لیکن یہ بھی چھوٹی ہے، M81 نامی کہکشاں ہماری کہکشاں سے ساٹھ گنا بڑی ہے۔جب کہ IC1011 ہماری کہکشاں سے چھ سو گنا بڑی ہے۔اب سمجھ میں آرہا ہے نا اللہ اکبر کا کیا مطلب ہے؟

آئیں! ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا، جیسے ستاروں سے کہکشائیں بنتی ہے آپ کو معلوم ہے اسی طرح کہکشاؤں سے کلسٹر بنتے ہیں؟ اور جس کلسٹر میں ہماری کہکشاں واقع ہے اس کا نام ''وِرکو کلسٹر'' ہے اور صرف اس ایک کلسٹر میں ۴۷ رہزار کہکشائیں ہیں، اور معاملہ ابھی یہیں ختم نہیں ہوا، کلسٹرس بھی آپس میں مل کر سوپر کلسٹر بناتے ہیں، اور جس سوپر کلسٹر میں ہم رہتے ہیں اس کا نام ''لوکل سوپر کلسٹر'' ہے اور اس سوپر کلسٹر میں سو کے قریب کلسٹر ہیں

اوراس سوپر کلسٹر جیسے کم وبیش ایک کروڑ سوپر کلسٹر ہماری کائنات میں موجود ہیں، جوایک عظیم جال میں معمولی نقطوں کے مانند نظر آتے ہیں؛ اوران سب کوایک ذات یعنی اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔''

ہم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں:

اب اس زمین کی حیثیت تو ان سب کے مقابلے میں ایک نقطے سے بھی کم سمجھی جاتی ہے۔اسی سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: **رب العٰلمین** (سارے جہانوں کے پروردگار) کا اندازہ ہوتا ہے۔ہم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں!!! ہماری جانکاری کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ''کنویں کے مینڈک'' لفظ بھی کم پڑتا ہے۔آج کے سائنس داں جب ان سب تفصیلات کو بتلاتے ہیں تو ہماری عقل ان سب کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی ،سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی بڑی کائنات!!!

سب کا پالنہار:

اللہ اس ساری کائنات کو بنانے والا بھی ہے اوراس کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا بھی ہے،اوران میں سے ہرایک کواپنے کمال تک پہنچانے والا بھی ہے۔تربیت کسی بھی چیز کو درجہ بدرجہ،اس کی انتہاء تک پہنچانے کو کہتے ہیں۔جیسے انسان، بچہ پیدا ہوا،تواس کی تربیت کا مطلب یہ ہے کہ بچپن سے لے کرایک کامل انسان بننے تک جتنی بھی محنت کی جاتی ہے، اس کوتربیت سے تعبیر کریں گے۔تو اللہ تعالیٰ سارے جہانوں اور جہانوں میں جتنی بھی مخلوقات ہیں ساری مخلوقات کا پالنہار ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ لگایئے!یوں کہا جاسکتا ہے کہ جتنی بھی تعریفیں ہیں

ساری اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں؛ اس لیے کہ دنیا میں جس چیز کی بھی تعریف کی جائے گی وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچے گی۔ جیسے ایک مکان کی تعریف کریں گے، تو مکان کی تعریف دراصل اس مکان بنانے والے کی تعریف ہے، تو کائنات کی ساری مخلوق اللہ کی بنائی ہوئی ہے، تو کسی کی بھی تعریف کی جائے گی وہ تعریف سیدھی اللہ تعالیٰ تک پہنچے گی۔ لہٰذا ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اسی کی دلیل یہ رب العٰلمین بتلائی کہ وہ سارے جہانوں کا پالنہار ہے۔

سورۂ فاتحہ

(قسط-۲)

(مؤرخہ ۱۷ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ مطابق ۴ر فروری ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾

ماقبل سے ربط:

اگلی مجلس میں ذکر کیا جا چکا کہ یہ پہلی سورت ہے جس کا نام سورۂ فاتحہ ہے۔ اس میں پہلی تین آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو

بندوں کی زبان سے کہلوایا ہے، گویا بندے اللہ کے حضور یہ مناجات پیش کرتے ہیں جس کے شروع میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعریف ہے، وہ صفات جو خاص اہمیت کی حامل ہیں، ان کو بیان کیا گیا ہے، پھر بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی بندگی کا اقرار کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ آپ ہی سے میں مدد چاہتا ہوں اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے صراط مستقیم کی دعا کرتا ہے۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ .

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اس میں لفظ اللہ، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذاتی نام ہے اور بقیہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے صفاتی نام ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی صفات کو بتلاتے ہیں۔

رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت ربوبیت کو ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کو وجود عطا فرماتے ہیں، وجود کے بعد کمال بھی دیتے ہیں اور اس کمال کو انتہاء تک پہنچاتے ہیں۔

تربیت کہتے ہیں کسی چیز کو دھیرے دھیرے، درجہ بدرجہ، تدریجاً اس کے منتہا اور کمال تک پہنچانا۔ دنیا کے اندر جتنے بھی عالَم ہیں، عالم انسان ہو، یا عالم جنات ہو، یا عالم ملائکہ ہو، یا عالم جمادات ہو، یا عالم حیوانات ہو، یا عالم نباتات ہو، اور بھی دیگر کہکشائیں ان تمام عالموں کا پروردگار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب اسی نے سب کو پیدا کیا اور سب کو کمال سے نوازنے اور انتہاء کو پہنچانے والا بھی وہی ہے اور جب اسی کی قدرت سے یہ سب کچھ ہوا تو وہی اس بات کے لائق ہے کہ اسی کی عبادت کی جائے۔

پہلی آیت، عقیدۂ توحید:

مفسرین لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اسلام کے تین بنیادی عقائد کو بیان کیا ہے: (۱) عقیدۂ توحید (۲) عقیدۂ رسالت (۳) عقیدۂ آخرت۔ اس پہلی آیت میں عقیدۂ توحید کا تذکرہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات ہی وہ ذات ہے جس نے تمام جہانوں کو پیدا کیا اور ان کو پالنے والا، ان کو کمال کی انتہاء تک پہنچانے والا وہی ہے تو وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے، اس میں توحید کا سبق دیا گیا ہے۔

رحمٰن الدنیا و رحیم الاٰخرۃ:

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (سب پر مہربان، بہت زیادہ مہربان)

یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے دو نام ہیں، دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، اور دونوں رحمت سے بنے ہوئے ہیں۔ اور اس سے قبل رحمٰن کا مطلب گذر چکا یعنی جس کی رحمت سب پر عام ہو۔ چناں چہ اس کا ترجمہ سب پر مہربان کیا جاتا ہے۔ دنیا میں اللہ کی رحمت سب کو ایسی شامل ہے کہ دنیا کی چھوٹی یا بڑی کوئی بھی مخلوق اللہ کی رحمت سے نکلی ہوئی نہیں ہے۔ اسی لیے امام بیضاویؒ فرماتے ہیں: رحمٰن الدنیا و رحیم الاخرۃ گویا اللہ کی صفت رحمت جس کا تذکرہ اللہ کے نام کے ساتھ کیا گیا ہے اس کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے اور دنیا کی ساری مخلوق پر اللہ کی اس رحمت کا ظہور ہوتا ہے۔

اور رحیم کا مطلب یہ ہے کہ بہت زیادہ مہربان، جس کی رحمت بہت زیادہ کامل و مکمل ہو۔ اور اس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ اس سے قبل گذر چکا کہ دنیا کی ساخت اور

بناوٹ ہی ایسی ہے کہ اللہ کی اُس رحمت کا ظہور علیٰ وجہ الکمال یہاں نہیں ہوسکتا۔اس دنیا میں اس کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔اس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔تو آخرت میں جو اہل ایمان ہیں فلاح یاب بندے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت ان پر کامل ومکمل ہوگی ۔اِن دو صفات کے تذکرے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت جو دنیا میں سب کو شامل ہے،اس سے ہم سب کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان:

اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا حال یہ ہے کہ مشکوٰۃ شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے : ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کچھ قیدی لائے گئے، ان قیدیوں میں ایک عورت تھی جس کا دودھ پیتا بچہ اس سے بچھڑ گیا تھا،اور اس کی چھاتیوں میں دودھ جمع ہوکر جوش مار رہا تھا،تو وہ بے چینی کے ساتھ بھاگ رہی تھی ، جو بچہ اس کو نظر آجاتا اس کو لے کر وہ اپنی چھاتی سے لگاتی اور دودھ پلانا شروع کر دیتی تھی، چناں چہ اس منظر کو دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا: بتلاؤ! کیا یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟ تو صحابہ نے جواب میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہرگز نہیں،تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: للّٰہ أرحم بعبادہ من ھذہ بولدھا (اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہیں، جتنا یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہے۔[1]

حدیث شریف میں آتا ہے: اللہ نے اپنی رحمت کے سو(۱۰۰) حصوں میں سے ایک حصہ دنیا میں اتارا ہے، اور اسی وجہ سے ماں اپنی اولاد کے ساتھ، جانور اپنے بچوں کے ساتھ

---

(۱) أخرجه البخاري: ۵۶۵۳ و مسلم: ۲۷۵۴.

شفقت و مہربانی کرتے ہیں، حتیٰ کہ گھوڑی اپنا قدم زمین پر رکھنے سے پہلے دیکھ لیتی ہے کہ کہیں میرے بچے کے اوپر تو قدم نہیں پڑ رہا ہے؟ اور بہت احتیاط سے وہ نیچے قدم رکھتی ہے اسی محبت کی وجہ سے۔[۱] گویا اللہ تعالیٰ نے رحمت کے صرف ایک حصہ کو ظہور عطا فرمایا ہے، اور آخرت میں ننانوے حصے ظاہر ہوں گے۔ تو اس رحمت کا ظہور شیخ سعدیؒ کے بقول ایسا ہوگا جو انہوں نے کہا ہے ؎

وگر در دہد یک صلائے کرم
عزازیل گوید نصیبے برم

(بوستاں)

(اگر اللہ تعالیٰ کرم کی ایک آواز لگا دیں، تو شیطان بھی کہے گا کہ مجھے بھی اس میں سے حصہ مل جائے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی اس رحمت سے ناامید نہیں ہوتا)

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور اس دنیا میں تو سب پر ہوتا ہے، مسلمان ہو، کافر ہو، انسان ہو، جانور ہو، جمادات ہو، بلکہ کافروں کو اللہ تعالیٰ ایسے لاڈ پیار کے ساتھ دنیا میں پالتے ہیں کہ کوئی اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتیں دنیا میں ان کے بھی شامل حال ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ تربیت کا معاملہ فرماتے ہیں۔

امام رازیؒ نے اسی الرحمٰن الرحیم کے تحت لکھا ہے: حضرت ابراہیم بن ادہمؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک جگہ مہمان تھا، کھانے کے لیے دسترخوان لگایا گیا، اچانک ایک کوا آیا اور ایک روٹی اٹھا کر کے بھاگا، وہ اس کے پیچھے پیچھے گئے تو وہ پہاڑیوں کے درمیان

---

(۱) أخرجه البخاري: ۵۶۵۴ ومسلم: ۲۷۵۲.

گیا، وہاں پہنچ کر جب دیکھا تو ایک آدمی کے دونوں ہاتھ بیڑیوں میں بندھے ہوئے تھے، وہاں مقید پڑا تھا، اس کوّے نے جا کر اس کے منہ پر روٹی ڈال دی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے وہاں بھی اس کی روٹی کا انتظام کیا۔[۱]

إلى طاعة الله:

ایک اور واقعہ بیان کیا ہے: حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے گھر میں تھا، میرے دل میں ایک ولولہ اور بے چینی سی پیدا ہوئی تو میں گھر سے نکل کر دریائے نیل کی طرف گیا، جب کنارے پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک بڑا بچھو بہت تیزی سے چل رہا ہے، تو میں اس کے پیچھے پیچھے چلا کہ یقیناً اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی کوئی حکمت پوشیدہ ہوگی، تھوڑی دیر چلا، اتنے میں دریائے نیل میں سے ایک بہت بڑا مینڈک کنارے پر آ کر کھڑا ہوگیا، اور وہ بچھو کود کر اس کی پیٹھ پر سوار ہوگیا، مینڈک اس بچھو کو لے کر دریا میں تیرنے لگا اور دوسری طرف جانے لگا۔ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بھی جلدی سے ایک کشتی حاصل کی اور میں نے بھی اس کا پیچھا کیا، جب وہ مینڈک دوسرے کنارے پہنچا تو وہ بچھو چھلانگ لگا کر نیچے آگیا اور پھر وہ تیزی سے جانے لگا، میں بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا، تھوڑی دور ایک درخت کے نیچے ایک نوجوان نشہ کیے ہوئے سو رہا تھا، اور دیکھا کہ وہاں ایک اژدہا اس کی ناف کی طرف سے اس کے جسم پر چڑھ کر اپنی پھن کھڑی کیے ہوئے تھا اور گویا کاٹنے کے درپے تھا کہ اچانک اس بچھو نے جا کر کود کر اس سانپ کو اِس زور سے ڈسا کہ سانپ تیوری کھا کر نیچے گرا، اور پھر وہ بچھو تیزی سے واپس جانے لگا،

---

(۱) مفاتيح الغيب للرازي ۱/۲۰۱ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت).

اوراسی طرح وہ مینڈک آیا اور اس نے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔[۱]

حضرت ذوالنون مصریؒ کا یہی واقعہ ایک اور جگہ پر بھی ہے اس میں یہ ہے کہ حضرت حضرت ذوالنون مصریؒ نے بعد میں اس نوجوان کو پاؤں ہلا کر کے بیدار کیا، جب ہوش میں آیا تو اس کو بتلایا کہ اے غافل! جانتا ہے کہ تیرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا معاملہ ہوا؟ پھر پورا قصہ بیان کیا تو یہ سن کر وہ نوجوان کہنے لگا: إلٰهي! هذا فعلك بمن عصاك فكيف رفقك بمن يطيعك؟ (اے اللہ! تیرا یہ معاملہ تو اُس بندے کے ساتھ ہے، جو تیری نافرمانی میں مبتلا ہے، تو جو تیرے بندے تیری اطاعت اور فرماں برداری میں ہیں ان کے ساتھ تیرا کیا معاملہ ہوگا؟) یہ کہا اور اٹھ کر جانے لگا، تو حضرت ذوالنون مصریؒ نے کہا: کہاں جاتے ہو؟ تو اس نے کہا: إلى طاعة الله! اب میں اللہ کی طرف جاتا ہوں۔ گویا اپنی اس زندگی سے توبہ کرتا ہوں۔[۲] حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو ہر ایک کو شامل حال ہے۔

ماں کی ممتا، ایک سچا قصہ:

ایک اور روایت مشکوٰۃ میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے، ایک آدمی چادر اوڑھے ہوئے ہاتھ میں کچھ لیے ہوئے تھا، جس کو اس چادر کے ایک کونے سے ڈھانپ رکھا تھا، وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! میں درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب سے گذر رہا تھا کہ مجھے وہاں سے پرندے کے بچوں کے بولنے کی آواز آئی، میں اندر گیا، تو چھوٹے چھوٹے بچے تھے جو ابھی اُڑنے کے

---

(۱) مفاتيح الغيب للرازي ۱/۲۰۱ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت).

(۲) كتاب التوابين لابن قدامة ۱/۱۳۶ (ط: دار ابن حزم، بيروت) ونصه: فنهض الشاب و قال: إلهي! هذا فعلك بمن عصاك فكيف رفقك بمن يطيعك؟ ثم ولّى وقلت: إلى أين؟ قال: إلى البادية والله لا عدت إلى المدن أبداً.

لائق نہیں ہوئے تھے، ان کے پروں میں اتنی قوت نہیں تھی کہ وہ اڑ سکیں، تو میں نے بچوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر ان پر چادر کا ایک کونہ ڈال دیا، اور درختوں کے جھنڈ میں سے باہر آیا، تو ان بچوں کی ماں میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے جس کونے سے بچوں کو ڈھانپ رکھا تھا وہ ہٹا دیا تو ماں اپنے بچوں کے اوپر گری اور چمٹ گئی، جانے کا نام ہی نہیں لیتی، میں نے اس کو بھی ڈھانپ لیا، اور یہ آپ ﷺ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: رکھو۔ اس نے ان بچوں کو نبی کریم ﷺ کے سامنے کھول کر رکھا، وہ ماں بھی ان کے ساتھ چپکی ہوئی ہے، بچوں کے بازوؤں میں طاقت نہیں تھی اس لیے نہیں اڑ سکتے تھے؛ لیکن ماں تو اڑ سکتی تھی، مگر بچوں کی محبت کی وجہ سے وہ بھی ان کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہؓ سے پوچھا: أتعجبون لرحم أم الأفراخ بفراخها؟ قالوا: نعم یا رسول الله ﷺ قال فو الذي بعثني بالحق للّٰہ أرحم بعباده من أم الأفراخ بفراخها. (کیا ان بچوں کی ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ جو مہربانی، شفقت اور محبت ہے اس سے تم کو تعجب ہوتا ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے دین حق لے کر کے بھیجا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے زیادہ مہربانی، شفقت اور محبت ہے جتنی اِن بچوں کی ماں کو اِن بچوں کے ساتھ ہے۔)[1] حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے ساتھ جو محبت ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تو یہ رحمٰن کا ظہور تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔ اور قیامت میں صفت رحمت کا بھی ظہور ہوگا۔ اس لیے علما لکھتے ہیں کہ اللہ کی ان صفتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یعنی اگر ہم سے کچھ قصور ہو گیا ہے، گناہ ہو گئے ہیں تو اپنے گناہوں پر اڑے نہ رہیں، اترائیں نہیں؛ بلکہ اللہ کے حضور گڑگڑائیں، اور رو رو کر اپنے

(۱) مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۷۷ نقلاً عن السنن لأبي داود. (ط: المکتب الإسلامی، بیروت).

گناہوں کی معافی مانگیں، اللہ معاف کر دے گا، اللہ تو بڑا مہربان ہے۔قرآن میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا.(الزمر :۵۳) (اے میرے وہ بندو! جنھوں نے نافرمانی کر کے، گناہ کر کے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ سارے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔اللہ تو بڑے مہربان ہیں)

تو میرا بندہ، میں تیرا رب:

اللہ بندے کی توبہ سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے کتنا خوش ہوتا ہے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ایک آدمی اونٹ کے اوپر سارا کھانے پینے کا سامان لے کر سفر میں نکلا، صحرا کے اندر چل رہا ہے اور دو پہر کے وقت ایک درخت کے نیچے ٹھہر گیا اور اونٹ سے اتر کر آرام کرنے کے لیے وہاں لیٹ گیا، اونٹ کو وہاں چھوڑا، جب نیند سے اٹھا تو دیکھا کہ اونٹ غائب!!! اب کھانے پینے کا سارا سامان تو اسی پر تھا، اس لق و دق صحراء میں اس کے لیے اور کوئی زندگی کا سہارا نہیں تھا، اس نے تلاش کیا، کچھ ملا نہیں، بالآخر مایوس ہو کر وہ اسی درخت کے نیچے- یہ سوچ کر کہ اب موت ہی آنی ہے تو یہیں آجائے- آکر لیٹ گیا، اسی میں آنکھ لگ گئی، تھوڑی دیر کے بعد آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اونٹ وہاں موجود ہے!!! اس کو دیکھ کر اس شخص پر اتنی خوشی طاری ہوئی کہ اس خوشی میں وہ کہنے لگا کہ: اے اللہ! تو میرا بندہ، میں تیرا رب۔ کہنا تو یوں چاہیے تھا کہ: اے اللہ! میں تیرا بندہ، تو میرا رب۔ وہ شکر کے طور پر کہتا ہے؛ لیکن خوشی میں اس کی زبان پھسل گئی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

دیکھو! اس آدمی کو کتنی خوشی ہوئی؟ اللہ کا کوئی بندہ جب توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔[۱]

اے میرے بندو!

باری تعالیٰ خود قرآن میں فرماتے ہیں: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا. اس میں بھی شانِ رحمت تو دیکھو! کہ ان گنہگاروں کو اللہ تعالیٰ يٰعِبَادِيَ (اے میرے بندو!) سے خطاب کرتے ہیں۔ دنیا میں باپ اگر اپنے بیٹے سے ناراض ہو اور کسی وجہ سے اس کو تنبیہ کرنا چاہے، تو اس کی ماں سے کہتا ہے: تیرے بیٹے کو کہہ دینا کہ میرے گھر میں قدم نہ رکھے!!! یعنی اپنا بیٹا نہیں کہتا، گویا اس کی اس بری حالت کی وجہ سے اپنی طرف نسبت کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ گنہگاروں کی اس حالت میں بھی اپنی طرف نسبت کرتے ہوئے يٰعِبَادِيَ (اے میرے بندو!) سے خطاب کرتے ہیں۔ کیا شانِ رحمت ہے!!! اس لیے اللہ تعالیٰ کی اس رحمت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اور آدمی گناہوں پر اصرار نہ کرے، اگر کوئی گناہ ہو گیا ہے تو توبہ کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرمائیں گے۔ اور اتنا ہی نہیں کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرے؛ بلکہ اپنے بھائیوں کی طرف سے، دوسرے انسانوں کی طرف سے توبہ کرے، کسی کی طرف سے زیادتی کا معاملہ ہوا ہو، ظلم کا معاملہ ہوا ہو تو ان کو بھی معاف کر دے، ان کے ساتھ بھی رحمت کا معاملہ کرے۔

---

(۱) أخرجه البخاري: ۵۹۴۹.

ارحموا من فی الأرض:

محدثین کے یہاں مسلسل بالاولیۃ ایک حدیث ہے کہ سب سے پہلے استاذ اپنے شاگردوں کو سناتے ہیں اور شاگرد سب سے پہلے اپنے استاذ سے وہ روایت سنتے ہیں اس کو مسلسل بالاولیۃ کہا جاتا ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: الراحمون یرحمهم الرحمٰن تبارك و تعالیٰ ہے۔(اللہ کے جو بندے دوسروں پر رحم کرنے والے ہیں ان پر رحمٰن رحم کرتا ہے) ارحموا من في الأرض يرحمكم من في السماء (تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا)[1] اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: لا یرحم الله من لا یرحم الناس. (جو لوگوں پر مہربانی نہیں کرتا، اللہ اس پر مہربانی نہیں کرتے)[2] ہم لوگوں کے قصور کو معاف نہ کریں، ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ نہ کریں اور پھر اللہ سے رحمت کی امید رکھیں!!! ایں خیال است و محال است وجنوں! یہ ون سائڈ ٹریفک نہیں چلا کرتا۔ اگر ہم اللہ سے رحمت کی امید رکھتے ہیں، تو ہمیں بھی دوسروں کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرنا چاہیے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بندگی:

دیکھو! حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جب تہمت لگائی گئی تھی اور منافقین نے اس کو بہت ہوا دی، اس کا بڑا پروپیگنڈا کیا، تو اس کی وجہ سے بعض مخلص مؤمنین بھی دھوکے میں آ گئے، اور انھوں نے اس بات کو سچا سمجھ کر تہمت کے اس معاملہ میں حصہ لیا، جن میں حضرت

---

(۱) أخرجه الترمذي: ۱۹۲۴ (ط: مطبعة مصطفىٰ البابي الحلبي، مصر) وأبوداود: ۴۹۴۱ (ط: المكتبة العصرية، بيروت) وأحمد: ۶۴۹۴ (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت).

(۲) أخرجه البخاري: ۷۳۷۶ واللفظ له ومسلم ۲۳۱۹.

مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے، مہاجرین میں سے تھے، اور غریب ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کا خرچ برداشت کرتے تھے۔ جب قرآن میں حضرت عائشہؓ کی براءت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قسم کھا کر کہا: اب میں ان پر خرچ نہیں کروں گا۔ براءت نازل ہوئی تو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ اس معاملے میں بَری ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انصاف کی بات دیکھیے! کہ جب تک براءت نازل نہیں ہوئی، تب تک اُن کا وظیفہ بند نہیں کیا ہمارے دور اور مزاج کا دوسرا کوئی ہوتا، تو پہلے دن سے ہی معاملہ نمٹ جاتا کہ میں خرچ دیتا ہوں اور ہماری بیٹی کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے!!! لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انصاف کا تقاضہ یوں پورا کیا کہ جب تک حضرت عائشہؓ کی براءت اور بے گناہ ہونا ظاہر نہیں ہوا وہاں تک خرچ بند نہیں کیا، جب بے گناہ ہونا ظاہر ہوا اور قرآن میں آیت نازل ہوئی تو بات صاف ہوگئی کہ حضرت مسطح غلط تھے، قصور وار تھے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ میں ان پر خرچ نہیں کروں گا۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ قسم کھائی تو باری تعالیٰ نے قرآن پاک میں آیت نازل فرمائی: وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (النور:۲۲) (تم میں جو لوگ فضیلت اور مالی کشادگی والے ہیں وہ اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ وہ ان کو نہیں دیں گے جو رشتہ دار ہیں اور غریب ہیں اور مہاجرین ہیں۔ ان کو معافی اور درگذر سے کام لینا چاہیے، کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کردیں؟) گویا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ترغیب دی جارہی ہے کہ تم ان کا قصور معاف کردو، اللہ تمہارے قصور معاف کردیں گے۔ جب یہ

آیت نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی، سنتے ہی فوراً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: بلىٰ والله إني لأحب أن يغفر الله لي. (کیوں نہیں! اللہ کی قسم! میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف کردے)[۱]

آج دنیا میں ہمارا معاملہ الٹا ہوگیا ہے، ہم اپنے متعلق تو یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ہمارے قصور معاف کردیں؛ لیکن ہم لوگوں کے قصور معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اپنے متعلق تو ہماری خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ لوگ ہمارے ساتھ محبت کا، مہربانی کا، شفقت کا معاملہ کریں، اور ہم دوسروں کے ساتھ مہربانی، محبت وشفقت کا معاملہ کرنے کو تیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: من لا یَرحم لا یُرحم (جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحم نہیں کیا جاتا)۔[۲]

بہرحال! یہ دونوں اللہ کے صفاتی نام ہیں۔ اللہ کی صفات سے بندوں کو بھی متصف ہونا چاہیے۔ یعنی ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ جب سب پر مہربان ہیں، تو ہمیں بھی اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری رحمت اور مہربانی سے بھی کوئی بچنے نہ پائے، دشمن، دوست، اپنا، پرایا سب کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ارحموا من في الأرض يرحمكم من في السماء (زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا) لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ان دو مبارک ناموں سے ہمیں بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اور ان صفات کو اختیار کرکے ہمیں بھی اللہ کی مخلوق کے ساتھ رحمت اور مہربانی کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اگر ایسا

---

(۱) أخرجه البخاري: ۲۵۱۸.

(۲) أخرجه البخاري: ۵۶۶۷ و مسلم: ۲۳۱۸.

کریں گے، تو جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ معاف کر دیتے ہیں، ہمارے گناہ بھی معاف ہو جائیں گے۔ اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔

باز آ باز آ ، ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما، درگہِ نو میدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(ابوسعید ابوالخیر)

آجاؤ! واپس آجاؤ! جو کچھ کیا ہے واپس آجاؤ، تم کافر ہو، مجوسی ہو، بت کی پوجا کرنے والے ہو پھر بھی آجاؤ، ہماری یہ بارگاہ اور ہمارا یہ دربار ناامیدی کا نہیں ہے، سو بار توبہ توڑ چکے ہو تو بھی آجاؤ۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اتنا مہربان خدا! اس کو چھوڑ کر ہم کہاں جائیں گے؟ دنیا میں کوئی ایسا ہے جو ہمیں پناہ دے؟

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

(اقبالؔ)

حقیقت میں دنیا میں اللہ کی رحمت کے علاوہ کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے، اسی لیے اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ گناہ ہو گیا ہے تو توبہ کرو، اللہ کی طرف رجوع کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں اس سورت کو پڑھنے کا حکم دیا ہے تو ہمیشہ نماز میں جب بھی اس سورت کو پڑھیں تو اس کو پڑھتے وقت یہ تصور کرنا چاہیے، یہ سبق تازہ کر لینا چاہیے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اللہ تعالیٰ جب اتنے مہربان ہیں، تو اس کی اسی رحمت کا تقاضہ یہ

ہے کہ وہ اپنے بندوں کو راہِ حق دکھائے بغیر گمراہی کے اندر ویسے ہی نہیں چھوڑ دیں گے؛ بلکہ ان بندوں کو راہِ حق دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اس سے رسالت کا ثبوت ہوتا ہے۔ تو اسلام کے بنیادی تین عقائد ہیں (۱) عقیدۂ توحید، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے (۲) عقیدۂ رسالت، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے اور (۳) عقیدۂ آخرت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے ثابت ہوتا ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (جو روزِ جزاء کا مالک ہے)۔

لفظ دین، بدلہ اور حساب دونوں معنیٰ میں آتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: الكيس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت[1] (ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس سے حساب لے اور موت کے بعد والی زندگی کے لیے عمل کرے) دین یہاں حساب کے معنیٰ میں آیا ہے۔ آیت میں دونوں معنیٰ کرتے ہیں: روزِ حساب کا مالک ہے، یا روزِ جزاء کا مالک ہے۔ اس لیے کہ کسی کو کوئی بدلہ دینا چاہیں گے، تو پہلے حساب کرنا پڑے گا، بدلہ کے لیے حساب لازم ہے، اور جب حساب کریں گے تو بدلہ دیا جائے گا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔

ہماری ملکیت مجازی ہے:

دیکھو! اللہ تعالیٰ تو اس دنیا میں بھی ہر چیز کا مالک ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر اپنی ایک خاص حکمت اور مصلحت کی وجہ سے انسانوں کو بھی عارضی اور مجازی طور پر مالک بنایا، حقیقی مالک تو اللہ ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی میں انسانی ملکیتوں کو بھی

---

(۱) أخرجه الترمذي: ۲۴۵۹ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر) وابن ماجة: ۴۲۶۰ (ط: دار احياء الكتب العربية- فيصل عيسى البابي الحلبي، مصر).

تسلیم کیا، اسی لیے تو زکوۃ فرض ہوتی ہے۔ اگر مالک نہ مانا جائے تو زکوۃ کہاں سے فرض ہوگی؟ اور ہر آدمی جو کپڑے پہنے ہوئے ہے، اس سے پوچھیں کہ یہ کپڑے کس کے ہیں؟ تو کہے گا: میرے ہیں۔ یہ مکان کس کا ہے؟ میرا ہے۔ ملکیت ثابت ہوتی ہے۔

دنیا میں اللہ نے ملکیت کو تسلیم کیا اور ہر ایک کو مالک بنایا۔ دنیا میں حاکم بھی بنایا، حکمران بھی بنائے، لیکن ان حکمرانوں کی حکومت بھی دنیا میں عارضی اور مجازی ہے۔ حقیقی مالک اور حقیقی حکمران تو اللہ ہیں۔ دنیا کی اس زندگی میں اللہ نے اپنی مصلحتوں کے پیش نظر انسان کی مالکیت، ملوکیت اور بادشاہت کو منظوری دی، عارضی ہی سہی۔ لیکن ایک دن ایسا آنے والا ہے: روز جزاء، اُس دن دنیا کی یہ عارضی اور مجازی حکومتیں بھی ختم ہو جائیں گی، کوئی کسی چیز کا مالک نہیں؛ بلکہ حشر کے میدان میں اللہ تعالیٰ ایسے ہی پیدا کر کے لائیں گے کہ کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ (الانبیاء:۱۰۴) یعنی جیسے ہم نے ماں کے پیٹ سے؛ پہلے پیدا کیا تھا ویسے ہی ہم دوبارہ ان کو زندہ کریں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ انسانوں کو قبروں سے زندہ کر کے اٹھائیں گے تو بدن پر کوئی لباس نہیں ہوگا، پاؤں میں جوتے نہیں ہوں گے، اور جیسے بچہ غیر مختون پیدا ہوتا ہے ویسے غیر مختون اٹھائیں گے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں۔[۱] بچہ جب ماں کے پیٹ سے آتا ہے کیا لے کر آتا ہے؟ کچھ پوٹلہ لاتا ہے؟ کچھ نہیں! تو قیامت کے روز بھی اللہ تبارک وتعالیٰ جب قبروں سے دوبارہ پیدا کر کے اٹھائیں گے، اسی کیفیت کے ساتھ، کسی کے پاس کچھ نہیں ہوگا! یہ ظاہری، مجازی، عارضی ملکیتیں جو اللہ نے دنیا میں عطا فرمائی تھیں، کسی کے پاس کوئی چیز نہیں ہوگی، سب ایسے ہی ننگ دھڑنگ ہوں گے۔ اور کسی بادشاہ کی

---

(۱) أخرجه البخاري: ۶۱۲۱ ومسلم: ۲۸۵۹.

کوئی حکومت اور بادشاہت نہیں ہوگی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ خود ہی پکاریں گے: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ آج کس کی حکومت ہے؟ کوئی جواب دینے والا نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ خود ہی فرمائیں گے: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ (المؤمن:١٦) اس اکیلے اللہ کی جو ہر چیز پر غالب ہے۔ اللہ کی حقیقی حکومت کا ظہور اس روز جزاء اور قیامت کے دن ہوگا۔

جزاء و سزا دونوں ہی اعلیٰ:

اس کو روز جزاء اس لیے کہتے ہیں کہ اس دن دنیا میں جو اعمال کیے گئے ہیں ان کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس میں گویا عقیدۂ آخرت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بنیادی عقیدہ ہے۔ اس لیے کہ دیکھو! اگر اس دنیا ہی کی زندگی کو مانا جائے، تو دنیا میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کفر کرتے ہیں، ان کی پوری زندگی نافرمانی میں گذرتی ہے، اور اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں! کھا پی رہے ہیں، مزے کر رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں، اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے بندے وہ بھی ہیں، جو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری میں ہیں، لیکن تکلیف میں ہیں، ذرہ برابر ان کو چین نہیں۔ تو آدمی سوچتا ہے کہ اس کی پوری زندگی نافرمانی میں گذری، اس کی ان نافرمانیوں کا کیا ہوگا؟ بدلہ ملے گا یا نہیں؟ اور یہ فرماں بردار کہ اس کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں گذری، اس کا کیا؟ اس کو کیا نیک بدلہ ملے گا؟ تو ہمیں بتلایا گیا کہ یہ دنیا کی زندگی ایسی نہیں کہ کھایا پیا اور ختم ہوگیا، نہیں! اس کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے، یہ دنیوی زندگی تو عمل کے لیے ہے، یہاں بدلہ نہیں ہے۔ بدلہ تو آخرت میں دیا جائے گا، وہی بدلہ کا دن ہے۔ اس وقت بدلہ ہوگا، اور اس وقت

جنہوں نے نیکیاں کی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے مطیع اور فرماں بردار ہیں ان کو اللہ تعالیٰ انعامات سے نوازیں گے۔اور جو گنہگار، نافرمان ہیں اللہ تعالیٰ ان کو سزا دیں گے۔

جن کو اطاعت کی وجہ سے نعمتوں سے نوازیں گے وہ نعمتیں بھی کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہوں گی، دنیا میں اس کا کوئی تصور ہی نہیں کرسکتا ۔ اور نافرمانوں کو جو سزائیں دی جائیں گی وہ بھی اعلیٰ درجہ کی ہوں گی، اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔تو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ یعنی روز جزاء کا مالک ہے۔اس میں عقیدۂ آخرت کی طرف اشارہ ہے۔

گو یا اسلام کی بنیادی تعلیمات میں تین چیزیں ہیں (۱) توحید (۲) رسالت (۳) آخرت سورۂ فاتحہ کی پہلی تین آیتوں میں ان کی طرف اشارہ ہوگیا۔

سورۂ فاتحہ

(قسط-۳)

(مؤرخہ: ۲۳/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ، مطابق ۱۱/فروری ۲۰۱۸ء شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ؕ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ؕ﴿۴﴾ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ﴿۷﴾

ماقبل سے ربط:

سورۂ فاتحہ چل رہی ہے، اب تک اس کی پہلی تین آیتیں ہوگئیں:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، جو تمام جہانوں کا

پروردگار ہے)۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (جو سب پر مہربان اور بہت زیادہ مہربان ہے)۔

مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (جو روز جزاء یا روز حساب کا مالک ہے)۔

ان تین آیتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلام کے تین بنیادی عقائد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہ تینوں اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔

توحید:

پہلا عقیدہ توحید کا ہے، یعنی ہم اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کو عبادت کے لائق مانتے ہیں، کوئی اور عبادت کے لائق نہیں ہے، اسی کی عبادت کی جاتی ہے، کیوں کہ جب سارے جہانوں کا وہی پروردگار ہے، اُسی نے سب کو پیدا کیا، اسی نے سب کو کمال تک پہنچایا، وہی سب کی پرورش کرتا ہے تو وہی اس بات کے لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، چوں کہ اس میں کوئی اور اس کا شریک نہیں ہے، وہی تن تنہا خالق بھی ہے، مالک بھی ہے، رازق بھی ہے، تربیت کرنے والا بھی ہے، ہر چیز کو اس کے کمال تک پہنچانے والا ہے، تو جب سب کچھ وہی ہے، تو وہ اس لائق ہے کہ اس اکیلے ہی کی عبادت کی جائے، اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے، یہ توحید کی طرف اشارہ ہوا۔ توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو نہ معبود مانا جائے اور نہ کسی اور کی عبادت کی جائے۔

رسالت:

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (جو سب پر مہربان اور بہت مہربان ہے)۔

اسی مہربانی اور صفت رحمت کا تقاضہ تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب انسان کو دنیا

میں بھیجا ہے تو اس کو یوں ہی اندھیروں میں نہ چھوڑ دے؛ بلکہ کیوں بھیجا گیا ہے اس کو باقاعدہ بتلایا جائے، چناں چہ اسی کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیغمبروں کا سلسلہ جاری فرمایا۔ حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں مختلف پیغمبر بھیجے، سب سے آخری پیغمبر اور رسول نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اِن پیغمبروں نے انسانوں کو یہ بتلایا کہ تمہیں دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ تمہیں کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ تمہاری پیدائش کس لیے کی گئی ہے؟ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (الذّٰریٰت:۵۶) اللہ نے اپنی عبادت اور اطاعت کے لیے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور یہ بات بتلانے کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام اگر نہ بھیجے جاتے تو انسانوں کو کیسے پتہ چلتا کہ ہمیں دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ اور ان پیغمبروں اور رسولوں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتابیں بھی اتاریں اور ان میں زندگی گزارنے سے متعلق تمام احکام بتلائے گئے کہ تمہیں اس طرح زندگی گزارنی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس زندگی سے راضی ہو وہ کون سی ہے؟ وہ بتلائی گئی؛ تاکہ لوگ اس کے مطابق اپنی زندگی کو استوار اور ہموار کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کون سے طریقۂ زندگی سے ناراض ہیں وہ بھی بتلا دیا تاکہ لوگ اپنے آپ کو اس سے بچائیں۔ چناں چہ اس آیت میں رسالت کے عقیدے کی طرف اشارہ کیا گیا۔

آخرت:

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (وہی روز جزاء اور روز حساب کا مالک ہے)۔

ایک دن آنے والا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اُس دن حساب لیں گے، یعنی یہ نہ سمجھا جائے کہ اس دنیا میں بس پیدا ہوئے، کھایا پیا اور ختم ہو گئے!!! نہیں! بلکہ اس زندگی کے بعد

ایک دوسری زندگی ہے جو دائمی زندگی ہے، جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اور اس دائمی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا مدار اِس دنیوی زندگی پر ہے۔ اگر ہم نے اس دنیوی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کے مطابق گزارا، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور پیغمبروں کے ذریعہ زندگی گزارنے کا جو طریقہ اپنی کتابوں میں اتارا ہے، اس کے مطابق اگر یہ زندگی گزاری، تب تو وہاں کامیابی ہے اور ہمیشہ کی نعمتیں ہیں۔

اور اگر خدانخواستہ اس زندگی کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں گزارا، اللہ نے جن چیزوں سے منع کیا تھا ان کا ارتکاب کرتے رہے، اللہ کی نافرمانی میں رہے، کھایا پیا اور اسی میں لگے رہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کو توڑا، تو دائمی زندگی میں ناکامی مرتب ہوگی، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے واسطہ پڑے گا، اللہ کا عذاب ہمیشہ ہمیش کے لیے بھگتنا پڑے گا۔ یہ مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے روز جزاء اور روز حساب کے مالک ہونے کا۔ گویا اس آیت میں آخرت کے عقیدے کی طرف اشارہ کیا گیا۔

پہلی آیت میں توحید، دوسری آیت میں رسالت اور تیسری آیت میں آخرت کے عقیدے کی طرف اشارہ کیا گیا۔ یہ تین عقائد اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔

آخرت: یہی زندگی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک زندگی آنے والی ہے اور وہ اصلی زندگی ہے۔ اور وہاں اللہ تعالیٰ، انسانوں نے دنیا میں جو کچھ کیا ہے اس کا حساب لیں گے۔

اقرب الیہ من حبل الورید:

ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کے متعلق یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو پتہ نہیں ہے، وہ تو عالم الغیب والشہادۃ ہے، سب کچھ جانتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس

بات کا بھی انتظام کیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ اللہ کی طرف سے دو فرشتے بٹھائے گئے ہیں، جو ان کے سارے اعمال کو لکھتے ہیں، اس کا ریکارڈ رکھتے ہیں،اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ. (ق:۱۷، ۱۸) یہ لینے والے، لکھنے والے کیچ (Catch) کرنے والے دو فرشتے دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے ہیں اور آدمی جو کچھ بولتا ہے وہ اس کو نوٹ کرتے ہیں۔ہم یوں نہ سمجھیں کہ ہم جو بول رہے ہیں وہ ہوا میں تحلیل ہوگیا، ختم ہوگیا۔نہیں! ایک ایک بول محفوظ کیا جاتا ہے۔آدمی کے سارے اعمال کا اللہ تعالیٰ کے یہاں ریکارڈ ہے۔

جب قیامت کے روز ہاتھ میں اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا اور انسان اس کو دیکھے گا تو وہ کہے گا: مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا (الکہف:۴۹) (اس صحیفے کو کیا ہوگیا ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی چیز ایسی نہیں ہے جو اس میں نہ ہو، ہماری زندگی کا سارا کچا چٹھا اس کے اندر ہوگا، کوئی چیز چھوٹی ہوئی نہ ہوگی) وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا . انسان دنیا میں اپنا کیا ہوا سب کچھ موجود پائیں گے، اور وہ انکار نہیں کرسکیں گے، اور اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی نہیں کرتے۔اللہ تعالیٰ تو بندوں کو ان کے اعمال دکھلا دیں گے، ان کے اعمال پر گواہ پیش کریں گے۔

اعضاء کی گواہی:

بندوں سے پہلے جب پوچھا جائے گا تو بندے پہلے جھوٹ بھی بولیں گے؛ لیکن اللہ تعالیٰ زبان بند کردیں گے اور دوسرے اعضاء گواہی دیں گے۔جن اعضاء سے اس نے گناہ کیے تھے ہر ہر عضو گواہی دے گا۔آنکھ نے جو گناہ کیا تھا آنکھ بولے گی، کان نے کیا تھا

کان بولے گا، ہاتھ نے کیا تھا ہاتھ بولے گا۔ ہر ہر عضو بولے گا؛ تو وہ کہے گا کہ بھئی! تمہارے لیے تو میں نے کیا تھا، اور تم ہی میرے خلاف گواہی دے رہے ہو؟!!! وہ اعضاء کہیں گے: اللہ تعالیٰ نے ہم کو بولنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے اور ہم سب بتلائیں گے۔ اور جس زمین پر گناہ کیے ہیں، اس زمین پر اگر نیکی کی ہے تو اس پر اور اگر گناہ بھی ہیں، تو اس کے خلاف گواہی دے گی۔ لہٰذا کوئی چیز چھوٹنے والی نہیں ہے۔ آدمی کو ہر وقت اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ سب ریکارڈ ہو رہا ہے اور ان سب کے متعلق قیامت کے دن مجھے اللہ کو حساب دینا ہے، وہی روز حساب کا مالک ہے۔

إن تعدوا نعمت اللّٰہ:

قیامت کے روز بندے کو جب اللہ تعالیٰ کے حضور حساب کے لیے پیش کیا جائے گا تو اس وقت اس کے ساتھ تین رجسٹر بھی پیش کیے جائیں گے۔

(۱) تمام نیکیوں اور اچھے اعمال کا تذکرہ ہوگا۔

(۲) گناہوں کا تذکرہ ہوگا۔

(۳) ان تمام نعمتوں کا تذکرہ ہوگا جن کو پوری زندگی استعمال کیا۔

(یہ متعدد آیات واحادیث سے ثابت ہے)

ہم پانی پیتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر چیز کو استعمال کرتے ہیں وہ سب ریکارڈ ہے، قرآن کریم میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيۡمِ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں ان نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے حضور جب پیشی ہوگی تو نعمتوں کے رجسٹر میں جو سب سے چھوٹی نعمت

ہوگی، اللہ تعالیٰ اس کو کہیں گے کہ اس کی عبادتوں کے اندر سے تو اپنی قیمت وصول کر لے، چناں چہ وہ آگے بڑھے گی اور ساری عبادتوں کو سمیٹ ایک جانب کھڑی ہو جائے گی۔ باری تعالیٰ پوچھیں گے: کیا بات ہے؟ تو وہ عرض کرے گی: میں نے اس کی ساری عبادتیں لے لیں؛ لیکن میری قیمت ادا نہیں ہوئی۔ وہ بندہ لرز جائے گا کہ اب کیا ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ مہربانی کرنا چاہیں گے، اس کو فرمائیں گے: جا! میں نے تیرے گناہوں کو معاف کر دیا اور اپنی نعمتوں کا حساب بھی تجھ سے نہیں لیتا اور تیری نیکیوں کو میں اضعافاً مضاعفۃً، کئی گنا کر دیتا ہوں۔ وہ بندہ خوش ہو جائے گا۔[1]

اور جس کی گرفت کرنا مقصود ہوگی وہ تو وہیں سے لرز جائے گا کہ اللہ کی ایک نعمت میں میری ساری عبادتیں چلی گئیں، اب تو گناہ ہی رہ گئے اور یہ مجھے جہنم میں ہی لے جائیں گے۔

واقعہ یہی ہے! ہم زندگی بھر عبادتیں کریں تو بھی اللہ تعالیٰ کی ایک چھوٹی سی نعمت کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ ایک گلاس پانی کی قیمت ہم سے ادا نہیں ہو سکتی۔

پانچ سوالات، ایک نمونہ:

مختلف احادیث میں مختلف انداز سے نبی کریم ﷺ نے قیامت کے دن جن جن نعمتوں کی باز پرس ہوگی ان کی تفصیلات بتلائی ہیں۔ آپ نے فضائل صدقات میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وہ روایت سنی ہوگی: لا تزول قدم ابن اٰدم یوم القیامۃ من عند ربہٖ حتیٰ یسئل عن خمس[2] قیامت کے روز انسان کے پاؤں اللہ کے حضور سے اُس وقت

---

(۱) الآثار لأبي يوسف: ۱/۲۰۴ [۹۱۵] (ط: دار الكتب العلمية) و مسند البزار: ۱۳/۹۹ [۲۴۲۲] (ط: مكتبة العلوم و الحكم، المدينة المنورة) و المجالسة وجواهر العلم للدينوري المالكي: ۱/۲۹۱ [۵] (ط: جمعية التربية، بحرين و دار ابن حزم، بيروت) و مسند أبي حنيفة رواية أبي نعيم: ۱/۲۰۲ (ط: مكتبة الكوثر، الرياض) و الترغيب و الترهيب للمنذري: ۵۴۴۹ (ت. إبراهيم شمس الدين).

(۲) أخرجه الترمذي برقم: ۲۴۱۶ وغيره.

تک ہٹ نہیں پائیں گے، جب تک کہ پانچ چیزوں کے متعلق سوال نہ ہو جائے:

(۱) عن عمره فيم أفناه (جو زندگی دی تھی اس کو کہاں خرچ کیا؟)

اس میں سب کچھ آ گیا، جسم اور اس میں جو قویٰ اللہ تعالیٰ نے دیے، آنکھیں دیں، کان دیے، زبان دی، ہاتھ دیے، پاؤں دیے، دل دیا، دماغ دیا، یہ ساری صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں، تو اس زندگی کے متعلق سوال ہوگا کہ آپ نے کہاں ختم کی؟

(۲) وعن شبابه فيم أبلاه (جوانی کو کہاں استعمال کیا؟)

جوانی زندگی کا سب سے بہترین حصہ ہے، جوانی میں آدمی کی صلاحیتیں بالکل شباب پر ہوتی ہیں، سو جوانی سے متعلق مستقل سوال ہوگا۔

(۳، ۴) و ماله من أين اكتسبه و فيم أنفقه (اور مال سے متعلق سوال ہوگا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟)

(۵) وماذا عمل فيما علم (جو چیز تمہارے علم میں آئی اس پر کتنا عمل کیا؟)

یہ تو ایک نمونہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف ان ہی پانچ چیزوں کے متعلق سوال ہوگا، بلکہ ساری چیزوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اس لیے آدمی کو دنیا میں ہمیشہ یہ دھیان رہنا چاہیے کہ میرے چلنے سے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا۔ میرے بول، کسی کے ساتھ معاملہ کرنے سے متعلق بھی مجھ سے سوال کیا ہوگا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں زندگی گزارنے کا حکم دیا ہے اس کے مطابق ہمیں زندگی گزارنی ہے، اور جس قسم کے طریقۂ زندگی کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند بتلایا ہے اس سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ فرائض و واجبات کی ادائیگی کرنی ہے، حرام سے بچنا ہے، حلال کا اہتمام کرنا ہے۔ اسی طرح تمام امور کا اہتمام کرنا ہے۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حساب میں یہی پوچھیں گے۔ اور وہاں

سب کچھ موجود ہوگا تو بندہ انکار بھی نہیں کر سکے گا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری ہم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے کہ ہمیں اپنی زندگی کو جس طرح اللہ چاہتے ہیں اسی طرح گزارنا ہے، کیسے گزاریں گے؟ سو آگے اس کا طریقہ بتلایا:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں)

عبادت یعنی بندگی ، غلامی ۔ ہم تیری ہی غلامی کرتے ہیں ، دنیا میں کسی اور کو اپنا مطاع نہیں سمجھتے ۔ واجب الاطاعۃ اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھیں ۔ دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ بھی ہو، والدین ہوں ، بیوی کے حق میں شوہر ہو، یا حاکمِ وقت ہو ان سب کی اطاعت کا حکم قرآن یا حدیث میں کہیں آیا بھی ہے تو وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ ان کی طرف سے دیے جانے والے احکام اور آرڈر (Order) اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف نہ ہوں۔

لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق:

اولاد کو اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر والدین کوئی ایسی بات کرنے کو کہتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے، تو اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کا حکم ماننے کے لیے فرمایا ہے، لہٰذا اگر والدین ناجائز کام کرنے کے لیے کہیں تو وہ بھی کریں ۔ نہیں !نہیں ! والدین ناجائز کام کرنے کے لیے کہیں گے تو ہم اس پر عمل نہیں کریں گے۔

مکہ میں ایمان لانے والے صحابہ میں سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے،

یہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، وہ جب ایمان لائے، تو ان کی والدہ نے ان سے کہہ دیا کہ تم اس دین سے باز آجاؤ، اور اس دین کا انکار کرو، اور میری بات مانو، ورنہ میں کھانا نہیں کھاؤں گی والدہ نے بھوک ہڑتال کردی کہ جب تک تم اس دین کو نہیں چھوڑو گے وہاں تک کھانا نہیں کھاؤں گی۔ اب وہ عجیب کشمکش میں آگئے کہ ماں کا یہ حکم ہے، وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے کو کہہ رہی ہیں۔ نبی کریم ﷺ سے آکر عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آیت نازل فرمائی: وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا. (لقمٰن: ۱۵) ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے؛ لیکن باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ تم کو میرے ساتھ شرک کرنے کے لیے کہیں تو ان کی بات مت مانو۔[۱]

شریعت نے ایک اصول بتلا دیا: لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق[۲] جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو وہاں کسی بھی مخلوق کی کوئی بات نہیں مانی جائے گی۔ چاہے وہ حاکم وقت ہو، چاہے بادشاہ وقت ہو، چاہے باپ ہو، چاہے شوہر ہو، چاہے کوئی بھی ہو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ اس کی بات صرف اس شرط کے ساتھ مانی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی لازم نہ آتی ہو۔

رب چاہی یا من چاہی:

إنما الطاعة في المعروف[۳] جن لوگوں کی اطاعت اور فرماں برداری کا اللہ

---

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۱۷۴۸.

(۲) أخرجه الطبراني بهذا اللفظ في الأوسط برقم: ۳۹۱۷ (ط: دار الحرمين، القاهرة) وأخرجه أحمد في مسنده برقم: ۲۰۶۵۳ و ۲۰۶۵۶ ولفظه: "لا طاعة في معصية الله".

(۳) أخرجه البخاري: ۴۰۵۰.

تعالیٰ نے حکم دیا ہے، وہ ایک شرط کے ساتھ کی جائے گی کہ نیکی کے کام میں ان کی بات مانی جائے گی، اگر وہ گناہ کے کام کے لیے کہیں تو اس پر عمل نہیں ہوگا۔ چناں چہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہہ کر بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور اقرار کرتا ہے کہ اے اللہ! میں تیری ہی مانوں گا۔ جس وقت ہم نماز میں یہ اقرار کر رہے ہیں، سوچیے! ہم اللہ ہی کی مان رہے ہیں یا اوروں کی بھی مان رہے ہیں؟ اللہ کے حکم پر چل رہے ہیں؟ رب چاہی زندگی گزار رہے ہیں یا من چاہی زندگی گزار رہے ہیں؟ اپنے نفس کی بات مان رہے ہیں؟ اپنی بیوی کی بات مان رہے ہیں؟ یا اپنے دوستوں کی بات مان رہے ہیں؟ اللہ کے حکم کو چھوڑ کر کے فرینڈ سرکل جو کہہ رہا ہے اس کے مطابق کر رہے ہیں؟ سوچ لو!!! ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے جھوٹا اقرار کرتے ہیں؟ کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

اس اقرار کا علاج بتلایا گیا کہ آپ اپنے اوپر اللہ کی اطاعت لازم کرلو، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو واجب الاطاعۃ مت سمجھو، اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کو ہر حال میں ماننا ہے، چاہے وہ حکم ہماری چاہت کے موافق ہو یا مخالف؛ ہمیں اس پر عمل کرنا ہے۔

حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جب کلمہ أشهد أن لا إله إلا الله پڑھا، تو کلمہ پڑھ کر اُنہوں نے اس بات کا اقرار کرلیا اور بتادیا کہ ہم اللہ ہی کے حکم کو مانیں گے۔

شراب کی لت کولات:

شراب ایک ایسی لَت ہے کہ اگر لگ جائے تو آسانی سے چھوٹتی نہیں ہے۔ آج کل کسی کو بیڑی اور سگریٹ کی لت ہے، کسی کو پان کی، کسی کو گٹکھا کی۔ ساری دنیا اور بہت سے لوگ سمجھاتے ہیں؛ لیکن وہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور اگر شراب کی لت پڑ جائے!

اس سے تو اللہ ہی بچائے!!

ذوق نے کہا ہے: ع

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

تو یہ شراب کی لت ایسی خطرناک ہے کہ آسانی سے چھوٹتی نہیں ہے۔

یورپ کے متعلق لکھا ہے: ۱۹۲۲ء میں جب یورپ کے حکمرانوں اور دانش مندوں نے دیکھا کہ شراب میں بڑا نقصان ہے، اس کی وجہ سے حادثات ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے بہت سارا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ شراب پر قانونی طور پر پابندی لگائی جائے۔ چناں چہ سب نے یہ قانون پاس کر کے شراب پر پابندی لگا دی۔ پھر کیا ہوا؟ جب پابندی لگتی ہے، قانون بنتا ہے تو اس پر عمل کرانے کے لیے پولیس میدان میں آتی ہے، ایجنسیاں قانون پر عمل کرنے کے لیے اس کی نگرانی کرتی ہیں۔ اب شراب کے کارخانے حکومت نے بند کرا دیے، لیکن شراب کی عادت نہیں چھوٹتی تھی، اُنھوں نے گھر میں بھٹیاں بنالیں، اور گھر میں شراب بنا کر پینا شروع کیا، کارخانے تھے تب تو فضا کچھ ٹھیک رہتی تھی، گندگی نہیں ہوتی تھی؛ اب جب گھر گھر میں بھٹیاں بن گئیں تو گندگی بھی عام ہوگئی۔ اور لوگ مجمع میں سب کے سامنے تو نہیں پیتے تھے؛ لیکن تنہائیوں میں انھوں نے پینا شروع کر دیا، تنہائیوں میں کون روکنے والا ہے؟

بہت مشکل ہے بچنا بادۂ گل گوں سے خلوت میں

بہت آساں ہے یاروں میں معاذ اللہ کہہ دینا

یعنی دوستوں کی مجلس میں نعوذ باللہ! کہہ کر اپنی بزرگی کا اظہار کرنا تو بہت آسان

ہے؛ لیکن تنہائی میں اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔ تو یہ شراب ان لوگوں سے نہیں چھوٹی، بالآخر حکومتوں نے وہ قانون اٹھالیا۔

شراب کی لت عربوں میں کئی پیڑھیوں سے چلی آرہی تھی، ان عربوں کو شراب سے ایسی عجیب وغریب محبت ہوا کرتی تھی کہ عربی زبان میں شراب کے دوسو سے زائد نام ہیں۔ انگور کی شراب، کھجور کی شراب، مکئ کی شراب، ہر قسم کی شراب کا نام الگ۔ پھر شراب کو پانی کے ساتھ ملائیں تو اس کا نام الگ، صبح کو پئیں تو نام الگ، شام کو پئیں تو نام الگ، ایسے الگ الگ نام ہیں۔ ان کو شراب سے بہت عشق تھا۔ انہی کے متعلق جب شراب کی حرمت کی آیت قرآن میں نازل ہوئی: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا. (البقرۃ:۲۱۹) (اے نبی! یہ لوگ آپ سے شراب کے متعلق پوچھتے ہیں، تو آپ کہہ دیجیے کہ ان میں خرابیاں بھی ہیں اور فائدہ بھی ہے؛ لیکن خرابیاں فائدے سے زیادہ ہیں) ابھی حرمت کا حکم نہیں دیا؛ لیکن بعض اتنے دانشمند تھے کہ جیسے ہی یہ آیت نازل ہوئی اسی وقت انہوں نے شراب کو چھوڑ دیا، پھر تو صراحتاً اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ . (المائدۃ:۹۰) (بے شک شراب، جوا، اور جو پانسے کے تیر لگائے جاتے ہیں وہ سب شیطانی عمل ہیں، اس سے بچو، تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ)

شراب کی حرمت:

بس! کیا تھا! بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے: میں اپنے سوتیلے والد ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں ان کے دوستوں کی مجلس میں تھا، اور شراب پی جارہی تھی

-وہ چھوٹے بچے تھے اور ایسے موقعوں پر چھوٹے بچوں سے ہی خدمت لی جاتی ہے-تو میں ان کو شراب پلا رہا تھا، اچانک باہر اعلان ہوا: ألا إن الخمر قد حرّمت شراب حرام کر دی گئی، اس سے بچو! تو ان لوگوں نے کہا کہ دیکھو! کیا اعلان ہو رہا ہے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں باہر گیا اور سنا، اُس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر تو تھے نہیں، اعلان کرنے والے محلوں میں جا کر زبانی اعلان کرتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے جا کر کہا: شراب حرام کر دی گئی ہے۔تو فرماتے ہیں کہ جن کے ہاتھ میں جام تھا وہ ہاتھ میں ہی رہا، جنہوں نے اپنے ہونٹ تک لگا یا تھا اندر نہیں گیا، سب نے باہر پھینک دیا۔ اور جن مٹکوں میں شراب تھی وہ سارے توڑ دیے گئے۔مدینہ کی گلیوں میں شراب بہنے لگی۔[۱]

کوئی آپ کو دیکھ رہا ہے:

وہاں کون نگرانی کرنے والا تھا؟ کون سی پولیس تھی؟ اور کون سی ایجنسیاں تھیں؟ جو نگرانی کررہی ہوں؟ کوئی نہیں، بس! خدا کا خوف دل میں ہے۔وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (النّٰزعٰت: ۴۰، ۴۱) قرآن نے اصول بتلا دیا۔اللہ تعالیٰ کے قانون پر عمل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ اللہ کا ڈر اپنے دل میں بٹھا لیا جائے۔سوچا جائے کہ وہ دیکھتا ہے، میں اس کی نگاہوں کے سامنے ہوں، میں جو کچھ کر رہا ہوں اسے وہ دیکھ رہا ہے، اس کے علم میں ہے، اور کل کو مجھے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے، اس جوابدہی کے تصور سے جو ڈرا، اور اس نے اپنے

---

(۱) أخرجه البخاري: ۲۳۳۲ و مسلم: ۱۹۸۰.

نفس کو خواہشات سے روکا تو اس کا ٹھکانا جنت ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے کوئی پولیس نہیں تھی، کوئی کہنے والا نہیں تھا؛ لیکن سب عمل کرتے تھے۔

زنا، پرائی عورتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا یہ بھی اُس زمانے میں بہت عام تھا، ایک صحابی تھے، ان کا اسلام لانے سے پہلے ایک عورت سے تعلق تھا، اور اس کے ساتھ محبت کے بعد جنسی تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے۔ جب اسلام لائے اور ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچ گئے، ایک مرتبہ جب مدینہ سے مکہ آئے، تو وہ عورت جس کے ساتھ محبت کا تعلق تھا، جنسی تعلقات قائم تھے وہ ملی، اور اس نے ان کو اپنے پاس آنے کی آواز دی، انہوں نے کہا کہ اب تو میرے اور تیرے درمیان اسلام حائل ہو چکا ہے، میں نہیں آ سکتا۔ اس عورت نے اپنی محبت کا واسطہ دیا کہ میں نے تو اپنے آپ کو تیرے لیے قربان کر دیا اور تو ایسا جواب دے رہا ہے!!! اور میں تو تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب اس نے اتنی ساری باتیں کہیں، تو ان صحابی نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھوں گا، اگر میرے ساتھ تیرا نکاح ہوسکتا ہے تو کروں گا، ورنہ نہیں، کیوں کہ وہ غیر مسلم تھی، تیرے غیر مسلم ہوتے ہوئے اگر تجھ سے نکاح درست ہوسکتا ہے، تو ٹھیک ہے۔ زنا کا تو سوال ہی نہیں، چناں چہ جب مدینہ پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سب سنایا اور سوال کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ وحی آئی: اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِکَةً وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْکِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ. (النور: ۳) (زانی مرد نکاح کرتا ہے تو زنا کار یا مشرک عورت ہی سے نکاح کرتا ہے، اور زنا کار عورت سے نکاح کرتا ہے تو وہی مرد جو خود زانی ہو یا مشرک ہو، اور یہ بات مؤمنوں کے لیے حرام کر دی گئی ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ

آیت سنائی تو انھوں نے فوراً اس عورت سے کہہ دیا کہ میں تجھ سے نکاح نہیں کرسکتا۔ فوراً چھوڑ دیا، ذرہ برابر بھی پس و پیش نہیں کیا۔[۱]

مجھے پاک کیجیے......!!!

کسی سے کوئی قصور ہوتا تھا تو جب تک اس سے توبہ کرکے اپنے آپ کو پاک صاف نہ کرلیتا وہاں تک چین نہیں آتا تھا۔ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اللہ کے رسول! مجھ سے زنا ہوگیا ہے، آپ مجھے پاک کیجیے۔ آپ ﷺ نے منہ پھیرلیا، وہ عورت دوسری طرف آئی اور پھر یہ کہا، آپ ﷺ نے پھر دوسری طرف منہ پھیرلیا، تیسری طرف آئی، پھر آپ ﷺ نے منہ پھیرلیا۔ جب چار مرتبہ ہوا تو پھر نبی کریم ﷺ نے کہا: دیکھو! یہ کیا کہہ رہی ہے؟ پھر اس عورت نے کہا کہ حضور! مجھے تو اس زنا سے حمل تک ٹھہر چکا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: جب تک یہ بچہ تیرے پیٹ میں ہے، تب تک زنا کی سزا تجھ پر جاری نہیں ہوگی۔ کیوں کہ وہ شادی شدہ عورت تھی، اس کو پتھر مار کر رجم کردیا جانا چاہیے؛ مگر اس بچے کا تو کوئی قصور نہیں ہے، بھلے وہ زنا سے بنا ہے؛ لیکن بہر حال وہ تو معصوم اور بے گناہ ہے، اس لیے جب تک وہ تیرے پیٹ میں ہے اُس وقت تک تجھ پر حد جاری نہیں ہوسکتی۔ اور پیدا ہونے کے بعد بھی جب تک اس کو تیرے دودھ کی ضرورت ہے تب تک تیرے اوپر حد جاری نہیں ہوگی۔ چناں چہ وہ گئی، اور پھر اس کو بچہ پیدا ہوا، پیدا ہونے کے بعد اس کو دودھ بھی پلایا، دوسال دودھ پلانے کے بعد جب کھانا شروع کردیا تو وہ اس بچے

---

(۱) أخرجه الترمذي: ۳۱۷۷ (ط: مطبعة مصطفىٰ البابي الحلبي، مصر) وأبو داود: ۲۰۵۱ (ط: المكتبة العصرية، بيروت) والحاكم في المستدرك: ۲۷۰۱ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا اس حال میں وہ لے کر آئی اور کہا: اللہ کے رسول! یہ ہے وہ بچہ! اب تو اس کو میری ضرورت نہیں رہی۔[۱]

دیکھیے! اس عورت کے اقرار کرنے کو کتنی مدت ہو گئی، تین سال گذر گئے، کوئی F.I.R. درج نہیں کرائی تھی، رجسٹر میں نام نہیں لکھا گیا تھا، تین سال کے بعد خود آئی، وقتی جوش میں کچھ کیا ہوتا تو تین سال میں اس جوش کا اثر بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے؛ لیکن نہیں، مجھے پاک کرو۔ چناں چہ وہ بچہ جب اس لائق ہو گیا کہ اس کو ماں کی ضرورت نہیں رہی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر حد جاری کی، پتھر لگوائے، اور جب اسی حد اور سزا میں اس کا انتقال ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جنازے کی نماز پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اس نے زنا کیا تھا اور آپ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس نے ایسی توبہ کی کہ اگر مدینہ والوں پر اس کو تقسیم کیا جائے تو سب کی مغفرت ہو جائے۔

یہ جذبہ کہ مجھے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ اللہ تعالیٰ ہی کی بات ہمیں ماننی ہے، اللہ رب العزت ہی کے حکم پر چلنا ہے، روز حساب کو ہونے والے معاملے سے نمٹنے کا یہی ایک علاج ہے، جب تک یہ دھیان اپنے اندر پیدا نہیں کریں گے وہاں تک یہ چیز آسان نہیں ہو سکتی۔

ایک المیہ، کثرتِ معاصی:

دورِ حاضر میں ہم لوگوں کا سب سے بڑا المیہ اور سب سے بڑا پرابلم یہی ہے کہ ہم لوگوں نے آخرت کو بھلا دیا، آخرت کا تصور ہمارے دماغوں سے نکل گیا، جس کا نتیجہ یہ ہے

---

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۱۶۹۵ (ط: دار إحياء التراث العربي).

کہ ہم گناہوں پر جری ہیں۔ دورِ صحابہ میں بچہ بھی کسی گناہ کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ آج آخرت کا تصور دماغ سے نکل جانے کی وجہ سے گناہوں کی کثرت ہو رہی ہے۔ اس کا یہی ایک علاج ہے کہ اس آخرت کے عقیدے کو پختگی سے دل میں جمایا جائے۔ اسی کو اس سورت کی ان تین آیتوں میں بیان کیا گیا۔ اور آگے یہ بتلایا گیا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کا حساب لیں گے۔

یقیں محکم عمل پیہم:

حقیقت یہی ہے کہ اس تصور کو اپنے دل و دماغ میں جمانے کی ضرورت ہے کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں، تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تجھ ہی کو واجب الاطاعۃ سمجھتے ہیں، ہماری نگاہوں میں تیرے حکم کے مقابلے میں کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کوئی ہمیں کچھ بھی کہے تیرے حکم کے مقابلے میں کسی کی کوئی بات نہیں مانیں گے۔ نفس کہے، بیوی کہے، باپ کہے، دوست کہے، حاکم کہے، کوئی بھی کہے ہم تیرے حکم کے سامنے کسی کی بات نہیں مانیں گے۔

ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں:

یہ اتنا آسان کیسے ہو جائے گا؟ تو آگے فرمایا: وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے میں ہمارے لیے جو رکاوٹیں ہوتی ہیں تو ان رکاوٹوں کا بھی علاج ہے۔ لوگ آج کہتے ہیں: مولانا صاحب! اس زمانے میں تو شریعت پر عمل کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ شریعت پر عمل کرنا مشکل ہو گیا تو کبھی تم نے اللہ سے مانگا؟ اللہ سے کہو: اے اللہ! تو نے مجھے یہ حکم دیا ہے اور اس وقت صورت حال یہ ہے، ماحول میرے

مخالف ہے اور ساری چیزیں میرے مخالف ہیں، تو میری مدد فرما۔ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہیے، وہی تو مدد کرے گا۔

ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفیؒ ایک عجیب بات بیان فرماتے تھے: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ بندے کو اپنے سامنے کھڑا کر کے پوچھیں گے: تو نے یہ گناہ کیوں کیے؟ تو بندہ جواب میں عرض کرے گا: باری تعالیٰ آپ نے مجھے ایسے زمانے میں پیدا کیا کہ گناہوں کا ہی دور دورہ تھا، گناہوں سے بچنا مشکل تھا۔ تو باری تعالیٰ اس کے جواب میں یوں فرمائیں گے: تم نے میری کتاب قرآن میں تو پڑھا تھا: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (البقرة:۲۰) اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تو نے کبھی مجھ سے یوں کہا کہ اے اللہ! اس گناہ سے میرے لیے بچنا مشکل ہے، تو میرے لیے آسانی پیدا کر دے، رکاوٹیں دور فرما دے۔ ہم نے تو اس کے لیے کبھی دعا بھی نہیں کی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں پختہ ارادہ کرنا ہے کہ ہم اللہ ہی کے احکام پر عمل کریں گے اور ہم سے جتنی کوشش ہو سکتی ہے اس کو تو آج سے ہی شروع کر دیں۔ اس میں ہماری طرف سے کمی نہ ہو، اور جو چیزیں ہمارے اختیار سے باہر ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

دعاء

سبحانك اللّٰهم و بحمدك و تبارك اسمك و تعالىٰ جدك ولا إلٰه غيرك اللّٰهم لك الحمد كله و لك الشكر كله و لك الملك كله وبيدك الخير كله و إليك يرجع الأمر كله اللّٰهم لا أحصي ثناءً عليك أنت كما أثنيت علىٰ نفسك اللّٰهم صل علىٰ سيدنا ومولانا محمد و علىٰ اٰل سيدنا و مولانا محمد كما تحب و ترضىٰ بعدد

ماتحب وترضیٰ.

ربنا ظلمنا أنفسنا وإن لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين.

ربنا اٰتنا في الدنيا حسنةً وفي الاٰخرة حسنةً وقنا عذاب النار.

اللّٰهم وفّقنا لما تحب وترضیٰ من القول والعمل والفعل والنية والهدیٰ.

اللّٰهم اجعلنا هادين مهتدين غير ضالين ولا مضلين سلما لأوليائك وحرباً لأعدائك نحب بحبك من أحبك ونعادی بعداوتك من خالفك من خلقك.

اللّٰهم أغننا بالعلم وزيّنا بالحلم وأكرمنا بالتقویٰ وجمّلنا بالعافية.

اللّٰهم إن قلوبنا ونواصينا وجوارحنا بيدك لم تملكنا منها شيئاً.

اے اللہ! ہمارے دل، ہماری پیشانیاں، ہمارے اعضاء تیرے قبضے اور اختیار میں ہیں، تو نے ان میں سے کسی کا بھی ہم کو مالک نہیں بنایا، فإذا فعلت ذٰلک بنا، جب تو نے یہ معاملہ کیا ہے، فکن أنت ولینا تو ہی ہمارا کارساز ہوجا، واهدنا إلیٰ سواء السبیل، اور اے اللہ! سیدھے راستے کی طرف ہماری رہنمائی فرما۔ اے اللہ! اپنے فضل کا معاملہ فرما اپنے فضل کا معاملہ فرما۔

اے اللہ! تو نے ہم سے جس اطاعت اور فرماں برداری کا مطالبہ کیا ہے، تیری توفیق کے بغیر، تیری مدد کے بغیر ہمارے لیے مشکل ہے، اے اللہ! تو ہماری مدد فرما، اور ہمارے لیے تیری اس اطاعت اور فرماں برداری کو آسان فرما دے۔ نفس اور شیطان کی غلامی سے، اے اللہ! ان کی دھوکے بازی سے ہمیں نجات عطا فرما۔ اپنے فضل کا معاملہ فرما۔ اے اللہ! ہمیں، ہمارے اہل وعیال اور تمام متعلقین، کو صحت، قوت و عافیت، سلامتی، دنیا اور آخرت کی بھلائیوں سے مالا مال فرما۔ ہماری تمام ضرورتوں کی تو اپنے خزانۂ غیب سے

کفالت فرما، ہمیں کسی کا محتاج اور دست نگر نہ بنا۔ اے اللہ! تیری طاعت ہر میدان میں، ہر شعبے میں ہمارے لیے آسان فرما دے۔ ہمارے لیے آسان فرما دے۔

اے اللہ! تیری ذاتِ عالی کا، تیری کبریائی اور تیری عظمت کا استحضار، ہر گھڑی، ہر لمحہ، دن میں، رات میں، خلوت میں، جلوت میں ہمارے دلوں میں ایسا بٹھا دے کہ ہمارے لیے تیرے احکام پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔ اپنے فضل کا معاملہ فرما۔ اپنے فضل کا معاملہ فرما۔

اے اللہ! تیری شان رحمت کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ہمیں اپنے فرماں برداروں میں شامل فرما دے، تیری اطاعت اور فرماں برداری ہمارے لیے آسان فرما دے۔ اپنے فضل کا معاملہ فرما۔

تیرے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جتنی خیر اور بھلائی تجھ سے مانگی، ہمیں اور پوری امت کو عطا فرما، اور جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری اور پوری امت کی حفاظت فرما۔ اے اللہ! یہاں موجود تیرے تمام بندوں کی جائز اور نیک مرادیں پوری فرما۔

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم و صلّى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه سيدنا و مولانا محمد و اٰله و أصحابه أجمعين برحمتك يا أرحم الراحمين.

سورۂ فاتحہ

(قسط-۴)

(۱۰ر جمادی الآخرة ۱۴۳۹ھ، مطابق ۱۷ر فروری ۲۰۱۸ء شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

گذشتہ سے پیوستہ:

سورۂ فاتحہ کی چوتھی آیت چل رہی تھی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (جو سب پر مہربان اور بہت مہربان ہے)۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (جو روز جزاء کا مالک ہے)۔

بات یہ چل رہی تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ روز جزاء کے مالک ہیں، وہاں ہم سے حساب لیں گے، دنیا کے تمام اعمال کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے باز پرس ہوگی فرائض وواجبات کی ادائیگی ہوئی تھی یا نہیں؟ جائز ناجائز کا لحاظ کیا تھا یا نہیں؟ محرمات سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا تھا یا نہیں؟ ہر چیز کے متعلق سوال ہوگا۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ ان ساری چیزوں کے متعلق پوچھیں گے، تو اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے اس مرحلے سے ہم کامیابی کے ساتھ کس طرح پار ہوسکیں گے؟ تو اس کا علاج بتلایا کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں)۔

واجب الاطاعۃ کون......؟؟؟

عبادت کے معنیٰ: بندگی، غلامی۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی کو واجب الاطاعۃ سمجھتے ہیں۔ اللہ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا واجب الاطاعۃ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی اطاعت اور فرماں برداری کا حکم دیا ہے ان کی اطاعت بھی اس لیے کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ اگر وہ کسی ایسی بات کا حکم دیں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو تو اس حکم میں ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ چوں کہ ان کی اطاعت اصالۃً نہیں کی جاتی؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے کی جاتی ہے، تو جس حکم میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو بھلا اس میں ان کی اطاعت کیسے کی جائے گی؟ واجب الاطاعۃ ذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی

ہے۔ لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق[۱] مخلوق کی ان باتوں میں اطاعت نہیں کی جائے گی، جن میں اللہ کی نافرمانی لازم آتی ہو۔ اور إنما الطاعة في المعروف[۲] جن جن مخلوقات کی اطاعت اور فرماں برداری کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے (اولاد کو والدین کی، بیوی کو شوہر کی، رعایا کو اپنے حکمران اور حاکم کی) وہاں بھی یہ شرط رہے گی کہ جائز کاموں میں ہی ان کی بات کو مانا جائے گا، وہ اگر کسی ناجائز بات کا حکم دیتے ہیں تو اس میں ان کی اطاعت اور فرماں برداری نہیں ہوگی۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تجھے ہی واجب الاطاعۃ سمجھتے ہیں، ہم تیرے حکم کے مقابلہ میں کسی اور کا حکم نہیں مانیں گے۔ اگر ہم دل میں یہ بٹھالیں تو پھر دنیا میں ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنا آسان ہوجائے گا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ کو حساب کتاب دینا آسان ہوجائے گا۔

لکل داءٍ دواء:

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کی اطاعت ضروری ہے، اس میں اگر کچھ دشواریاں پیش آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ ان دشواریوں کو کیسے حل کیا جائے گا؟ ان کا حل یہ ہے کہ اللہ ہی سے مانگیں کہ اے اللہ! تو نے یہ حکم دیا ہے، تیرے اس حکم پر ہمیں عمل کرنا ہے؛ لیکن اس پر عمل کرنے کے معاملے میں ہمارے لیے رکاوٹیں اور دشواریاں ہیں، بیچ

(۱) أخرجه الطبراني بهذا اللفظ في الأوسط: ۳۹۱۷ (ط: دارالحرمين، القاهرة) وأخرجه أحمد في مسنده: ۲۰۶۵۳ و ۲۰۶۵۶ ولفظه: "لاطاعة في معصية الله".

(۲) أخرجه البخاري: ۴۰۵۰.

میں لوگوں کی طرف سے، دوستوں کی طرف سے، گھر والوں کی طرف سے، اولاد کی طرف سے، بیوی کی طرف سے، معاشرے اور کمیونٹی کی طرف سے روڑے ڈالے جارہے ہیں، اب تو ہی ان رکاوٹوں کو دور فرمادے، اور ہمارے لیے تیری اطاعت آسان فرمادے۔ گویا اللہ کی اطاعت کی ادائیگی میں اگر ہمارے لیے کچھ دشواری پیش آتی ہے، تو اسی میں اس کا نسخہ اور علاج بتلادیا کہ ہم اللہ ہی سے اس سلسلہ کی مدد مانگیں گے۔

آج ہم کہتے ہیں کہ مولانا! ہم کیسے شریعت پر عمل کریں گے؟ دیکھو نا! آج حالات کیسے ہیں؟ ان حالات میں ہم کیسے شریعت کے مطابق تجارت کر سکتے ہیں؟ ہم کیسے شریعت کے مطابق ملازمت کر سکتے ہیں؟ کیسے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق گزار سکتے ہیں؟ ہمارے لیے قدم قدم پر مشکلات ہیں۔ ان مشکلات کا حل یہ ہے کہ تم اللہ ہی سے مدد مانگو: اے اللہ! ہمارے لیے تیری اطاعت اور فرماں برداری کو آسان کر دے۔

تم نے ہم سے کیوں نہیں کہا؟؟

اس سے قبل ڈاکٹر عبدالحی صاحبؒ کا مقولہ نقل کیا تھا کہ: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ باز پرس کریں گے کہ: تم نے یہ گناہ کیوں کیے؟ میں نے یہ حکم دیا تھا، تم اس کو کیوں بجا نہیں لائے؟ تو اس وقت جواب میں ہم کہیں کہ باری تعالیٰ! بڑی دشواریاں تھیں، ہر چیز میری مخالف تھی، میرے لیے اس پر عمل کرنا مشکل تھا، میں بالکل مجبور تھا، مجبوری کی وجہ سے میں نے تیرے اس حکم کو توڑا ہے۔ تو وہاں اگر باری تعالیٰ کی طرف سے یہ پوچھ لیا گیا کہ: اگر یہ رکاوٹیں تھیں تو تم نے ہم سے کہا؟ ہم سے مانگا؟ ہم سے سوال کیا؟ تمہارا تو ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے، تو مجھے ہر چیز پر قدرت ہے اس کے تم قائل تھے، اس کو تم مانتے

تھے، اس پر تمہارا یقین اور ایمان تھا، اس کے باوجود تم نے ہم سے کیوں نہیں کہا؟ ہم سے کہتے تو ہم تمہاری اس رکاوٹ کو دور کرتے!!! تو یہ ایک نسخہ ہے۔

ایک مجرب عمل:

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: کسی کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے معاملے میں کوئی بھی رکاوٹ آئی ہو، اگر وہ چالیس (۴۰) دن تک خالص دل سے اللہ کی طرف رجوع کرے اور مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کے مسئلے کو حل کر دیتے ہیں، یہ ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اللہ کی اس اطاعت اور فرماں برداری کے معاملے میں اگر کچھ مشکلات درپیش ہیں تو اس کا حل یہ ہے کہ اللہ ہی سے مانگا جائے۔ گزشتہ ایک مطلب تو یہ بیان کیا تھا۔

ہر چیز اللہ ہی سے مانگیے:

مدد کا ایک اور طریقہ بھی ہے، وہ یہ کہ ہم ہر چیز اللہ سے مانگیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں دعا کے طریقے بھی بتلائے کہ ہم اپنی حاجات اللہ تعالیٰ سے کیسے مانگیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام دعائیں ہم کو سکھلائی ہیں۔ ایسی عجیب وغریب دعائیں ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

آپ الحزب الاعظم کھول کر دیکھ لیں، ترجمہ پڑھیں گے تو حیرت ہوگی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی دعائیں ہم کو سکھلائی ہیں۔ یہ دعائیں نبی ہی مانگ سکتا ہے، نبی کے علاوہ کسی کی زبان پر یہ دعائیں نہیں آسکتیں۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں دعا کا طریقہ بھی بتلایا کہ ہمیں اللہ سے ہر چیز کس طرح مانگنی ہے؟ یوں سمجھیے کہ یہ چھپے ہوئے سرکاری فارم ہیں، حکومت کی طرف سے جب کسی چیز میں مدد کا اعلان

کیا جاتا ہے، جیسے کسانوں کی فلاں چیز کی مدد کی جائے گی، تو جو کسان مدد حاصل کرنا چاہتا ہے، تو حکومت اس کو چھپے ہوئے فارم دیتی ہے کہ یہ فارم بھر لو، اس میں سب کچھ لکھا ہوا ہے، گویا یہ درخواست اس کو اپنی طرف سے کرنی نہیں پڑتی ہے؛ بلکہ حکومت نے اس درخواست کا مضمون بھی چھاپ کر دے دیا ہے، آپ کو اس میں صرف خالی جگہوں کو پُر کرنا ہے۔ تو ہمیں جو چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا مضمون نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے بتلادیا۔

دعائیں، چھپے ہوئے فارم:

دعائیں چھپے ہوئے فارم کی مانند ہیں، ہمیں تو صرف انہیں پُر کر کے اللہ کے ہاں جمع کرانا ہے۔ تو اللہ کی بارگاہ میں ہمیں ان ہی الفاظ میں دعائیں کرنی ہیں۔ ایسے عجیب و غریب الفاظ اور ایسے انداز سے نبی کریم ﷺ نے اللہ سے مانگا ہے کہ کوئی انسان اس کا تصور نہیں کرسکتا۔ ان دعاؤں کو دیکھ کر ان کے زبان نبوت سے صادر ہونے کا پختہ یقین ہوتا ہے، اس لیے کہ دوسرا کوئی ایسی دعا نہیں کرسکتا۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے حضور اکرم ﷺ کے قلب مبارک پر ان دعاؤں کا الہام اور القا ہوا، اور آپ ﷺ نے اللہ ہی کے بتلانے سے ان دعاؤں کو اپنے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا۔ تو یہ گویا چھپے ہوئے فارم ہیں، سو اِن ہی الفاظ میں دعا مانگ کر فارم جمع کروادینے ہیں۔

تعلق مع اللہ کا بہترین ذریعہ، دعا:

ہر چیز اللہ سے مانگے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔
صوفیہ کے ہاں تعلق مع اللہ کے لیے مستقل بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کروائی جاتی ہیں،

اللہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا یہ ایک آسان طریقہ ہے کہ ہر چیز اللہ سے مانگو۔ دل ہی دل میں اللہ سے باتیں کرتے رہو۔ اے اللہ! بجلی چلی گئی، گرمی لگ رہی ہے، مجھے ذرا راحت پہنچادے۔ ہر چیز دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتے کرتے مانگیں۔

یہ وہ چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کے تعلق کو قائم کرتی ہے، اس تعلق کو باقی رکھتی ہے، اور اس تعلق کو بڑھاتی ہے۔ تعلق مع اللہ کو قائم کرنا، باقی رکھنا، اور بڑھانا یہ تینوں اس (دل ہی دل میں اللہ سے مانگنے) سے ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر چیز میں اور ہر موقع پر دعا کے طریقے بتلائے ہیں، ایسی دعائیں کہ زندگی میں ایک دعا بھی قبول ہوگئی تو ہمارا بیڑا پار ہوگیا۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت کی دعا سکھلائی: بسم اللہ والصلاۃ والسلام علیٰ رسول اللہ، یہ درود شریف مع تسمیہ، پھر اللّٰھم افتح لي أبواب رحمتك۔[1] (اے اللہ! اپنی رحمت کے دروازے میرے لیے کھول دے) کسی کی پوری زندگی میں یہ ایک دعا ہی قبول ہو جائے تو بیڑا پار ہے، سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ ایسی ایسی دعائیں سکھلائیں کہ ایک دعا ہی اس کے زندگی بھر کے معاملات کو درست کرنے کے لیے کافی ہو جائے گی۔ گویا اللہ تعالیٰ اس آیت کے ذریعہ ہمیں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ہم سے مانگو ہمارے بھکاری بن جاؤ، ہر چیز ہم سے مانگو۔

حدیث شریف میں وارد ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر جوتے کا تسمہ (چپل کی پٹی) ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگیں۔[2] ایک آدمی سوچ سکتا ہے کہ چپل کی پٹی ٹوٹی اس

---

(۱) أخرجه النسائي في الكبریٰ: ۹۸۳۸ (ط: مؤسسة الرسالة) وفي عمل اليوم والليلة: ۹۰ (ط: مؤسسة الرسالة) والبخاري في التاريخ الكبير ۱/۱۵۹ (ط: دائرة المعارف العثمانية، حيدر أباد، دكن) وغيرهم. **(نوٹ: یہ وہ مصادر ہیں جن میں صلوٰۃ و دعا ایک ساتھ وارد ہے)**

(۲) أخرجه أبو يعلیٰ في مسنده: ۴۵۶۰ (ط: دار المأمون للتراث، دمشق) وغيره.

میں اللہ سے مانگنا ہے؟ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں یہی بتلا رہے ہیں کہ تمہاری ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی سے مانگو، اللہ ہی کی طرف رجوع کرو۔ چھوٹے سے چھوٹی چیز کو بھی معمولی مت سمجھو، اصل تو ہمارا مانگنا ہے، کس سے مانگ رہے ہیں؟ ہمارے مانگنے کا تعلق اللہ سے ہو۔ اللہ کے علاوہ ہم کسی کے سامنے بھی اپنی مانگ پیش نہ کریں۔ اگر ایسا مزاج بن جائے کہ ہر چھوٹی بڑی حاجت اللہ سے مانگیں تو پھر دیکھو! اللہ کے ساتھ کیسا تعلق پیدا ہوتا ہے!!!

ہم خرما وہم ثواب:

آدمی کی دعا کی کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ اس کا دل مکمل اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الدعاء مخ العبادة (دعا عبادت کا مغز ہے)[1] عبادت کی روح ہے۔ یعنی ایک عبادت میں جو توجہ مقصود ہوتی ہے وہی توجہ اور کیفیت دعا میں بھی مطلوب ہے۔ اور دعا خود مستقل عبادت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: إن الدعاء هو العبادة (دعا عبادت ہے)[2] باری تعالیٰ حکم فرماتے ہیں: ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ. (الغافر:٦٠) (تم مجھ سے مانگو، میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا) آگے فرماتے ہیں: اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ. (الغافر:٦٠) (جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں- یعنی دعا مانگنے سے اتراتے ہیں- وہ جہنم میں داخل ہوں گے) دعا یعنی ہم اپنی حاجتیں اللہ سے مانگ رہے ہیں، اور اس کو اللہ تعالیٰ عبادت کا نام دے رہے ہیں۔ ہم خرما وہم ثواب جیسا معاملہ ہے، کھجور بھی کھاؤ اور ثواب بھی ملے۔ تو ہم اپنی حاجتیں اللہ سے مانگ رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی ہو رہی ہے۔

---

(۱) أخرجه الترمذي: ۳۳۷۱ (ط: مطبعة مصطفیٰ البابي الحلبي، مصر) وغيره.

(۲) أخرجه الترمذي: ۳۳۷۲ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر) وغيره.

ایک غلط فہمی:

بعض لوگ دعا یہ سوچ کر نہیں مانگتے کہ جتنا وقت دعا میں صرف ہوگا، اتنی دیر میں دو رکعت نماز پڑھ لوں، قرآن کا ایک رکوع پڑھ لوں، تسبیح پڑھ لوں، گویا وہ لوگ دعا کو عبادت نہیں سمجھ رہے ہیں، یہ غلط فہمی ہورہی ہے، دعا خود عبادت ہے۔ دعا بھی عبادت کا ایک طریقہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ہم کو بتلایا ہے، اس لیے کہ دعا کے ذریعے بندہ کا اللہ تعالیٰ سے ایک تعلق قائم ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے گا، مانگتا رہے گا، مانگتا رہے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ چوبیس گھنٹے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا۔ یہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو پیدا کرنے والی چیز ہے اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔

کوئی دھندا ہے یا نہیں......؟؟؟

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: من لم يسأل الله يغضب عليه. (جو آدمی اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس سے ناراض ہوتے ہیں)[1] دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا داتا ہو، بڑے سے بڑا سخی ہو، آپ دیکھیں گے کسی نے اس کے پاس مانگا، اس نے دیا۔ دوسری مرتبہ مانگا تو پھر دیا، تیسری مرتبہ مانگا، پھر دیا۔ چوتھی مرتبہ مانگا، تب بھی دیا، پانچ چھ مرتبہ دے گا، اس کے بعد اگر مانگے گا تو وہ کیا کہے گا؟: ''ارے! تو تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے، کوئی دھندھا ہے یا نہیں؟'' یعنی بڑے سے بڑا دینے والا، اور بڑے سے بڑا داتا، اور بڑے سے بڑا سخی بھی ہوگا تب بھی اس کی زبان پر یہ الفاظ آئیں گے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے کہ آپ دن میں سو مرتبہ بھی مانگیں گے، تب بھی اللہ آپ سے راضی اور خوش ہوں گے، آپ کو اللہ کا قرب

---

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۳۳۷۳ (ط: مصطفىٰ البابي الحلبي، مصر) وغيره.

حاصل ہوگا۔ کیوں کہ مانگنا خود اللہ نے عبادت قرار دیا ہے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں:

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرة:۱۸۶) (اے نبی! جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں، تو میں قریب ہوں) اس آیت کا انداز بھی عجیب ہے! کہ دوسری جگہوں پر تو انداز یہ ہے یسألونك، قل اے نبی! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں، آپ ان سے کہیے۔ لیکن یہاں سیدھا ہی ہے کہ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ (اے نبی! جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں) اب براہ راست اللہ آگئے: فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ (میں قریب ہوں) اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (دعا کرنے والا جب مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں) آپ اس کو یوں کہہ دیجیے، یہ آیا ہی نہیں، سیدھا اللہ تعالیٰ نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، یہ دعا کا عجیب انداز ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

دعا کی خاصیت یہ ہے کہ آدمی کتنا ہی پریشان ہو، دکھی اور دردمند ہو، ایسی حالت میں اگر سچے دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر مانگے گا، تو طبیعت میں ایک سکون کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ وہ ساری بے چینی دور ہو جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دل پر کسی نے مرہم رکھ دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ جیسا داتا ہمیں ملا ہے اور جو خود ہمیں حکم دیتا ہے کہ مجھ سے مانگو نہیں مانگو گے تو اللہ ناراض ہوں گے، قرآن اور حدیث کہتے ہیں۔ اور مانگنے پر اللہ تعالیٰ

خوش ہوتے ہیں اوراس کے باوجود بھی ہم نہ مانگیں، تو یہ ہماری ہی کوتاہی ہے۔اور پھر مانگنے کا یہ سلسلہ جتنا ہم بڑھائیں گے اتنا ہی ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہوگا، گویا اللہ کے ساتھ تعلق کو قائم کرنے کی بہت سی شکلیں ہیں، بہت سے طریقے ہیں، اس کے لیے مستقلاً مجاہدے کیے جاتے ہیں،لوگ عبادتیں کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، رات بھر نماز پڑھتے ہیں، دن بھر روزے رکھتے ہیں اور بھی شکلیں اختیار کی جاتی ہیں، اور یہاں دعا کے ذریعے بندے نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی عجیب مہربانی ہے، اس کی رحمت ہے کہ دعا کے ذریعے بندے کو اپنے قریب کر دیتا ہے۔

اللہ کے بھکاری بن جاؤ:

چناں چہ حقیقت یہ ہے کہ اس اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں ہمیں یہ بھی بتلایا گیا کہ تم اللہ کے در کے بھکاری بن جاؤ، سب کچھ اللہ سے مانگو، بعض لوگ کہتے ہیں: ہمارے پاس تو بھیک کا پیالہ بھی نہیں ہے، تو حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ بھیک کا پیالہ بھی اللہ سے مانگو، ہر چیز اللہ سے مانگو۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ فرما رہے ہیں کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگو، اس کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے؟

تو یہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسا عجیب وغریب نسخہ بتلایا ہے کہ اس کے ذریعہ بندے کا تعلق اللہ کی ذات سے ایسا قائم ہوجاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں ایک تو عبدیت کا تعلق قائم ہوا، اور ساتھ ہی ساتھ ساری حاجتیں بھی پوری ہوگئیں۔ ہر وقت، دل ہی دل میں، زبان سے بولے بغیر دل سے بھی مانگا جاتا ہے۔ یعنی آدمی دل سے اللہ کی طرف متوجہ رہے، اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرے کہ اللہ! ایسا کر

دے، اللہ! ایسا کردے۔ کسی کام کے لیے کہیں جارہے ہیں، گھر سے نکلیں تو دل ہی میں اللہ سے عرض کریں: اے اللہ! کوئی سواری مل جائے، سواری مل گئی، اے اللہ! میں عافیت کے ساتھ منزل پر پہنچ جاؤں، منزل پر پہنچ گئے، اے اللہ! میں جس کام کے لیے آیا ہوں عافیت کے ساتھ میرا وہ کام ہو جائے۔

کیسا داتا!! کیسا سخی!!

دعا مانگنے کے ساتھ ساتھ ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کریں، سواری کے لیے دعا بھی مانگے، اور جہاں سواری ملی، تو الحمد للہ کہے۔ ہمارا حال کیا ہے؟ دعا تو مانگتے ہیں؛ لیکن دعا مانگنے کے بعد جہاں وہ کام ہو گیا تو جیسے اللہ کو جانتے ہی نہیں! دوسری حاجت مانگنے میں لگ جاتے ہیں۔ وہ حاجت جو اللہ نے پوری کی اس پر اللہ کا کچھ شکریہ؟ دنیا میں تو انسان کسی کو کوئی چیز دیتا ہے، تو آدمی فوراً اس کا شکریہ ادا کرتا ہے، اور اللہ کا شکریہ ادا کرنے کا دھیان ہی نہیں!!! باری تعالیٰ فرماتے ہیں: لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ (ابراهيم :۷) (اگر تم شکر گزاری کروگے تو میری نعمتوں میں اضافہ کروں گا) لیکن ہمارا مزاج ایسا بنا ہوا ہے کہ ہم اپنی حاجتوں کے معاملے میں اتنے خودغرض بنے ہوئے ہیں کہ جو حاجت ہم نے مانگی، اللہ نے پوری کی، پھر بھی اس کا شکر ادا کیے بغیر دوسری حاجت مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اللہ بھی کتنا کریم! کیسا داتا، کیسا سخی!! کہ اس کی پہلی نعمت کا شکریہ ادا نہیں کیا تو بھی دیتا ہے۔

انسان ایسا کرے گا؟ کسی انسان کے پاس کوئی چیز مانگی، اس کا ابھی شکریہ ادا نہیں کیا اور دوسری چیز مانگی تو کیا کہے گا؟ وہ پہلے والی کا تو ابھی ٹھکانہ نہیں!!! لیکن اللہ تعالیٰ ہے کہ بیسیوں چیزیں آپ نے مانگی کسی کا شکریہ ادا نہیں کیا، تو بھی مانگتے جاؤ، لیتے جاؤ، مانگتے جاؤ،

لیتے جاؤ۔ وہاں کوئی گرفت ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ دینے بیٹھے ہیں، وہ تو چاہتے ہیں کہ تم مانگو لیکن ساتھ میں اگر شکریہ بھی ادا کریں گے، تو اللہ کی نعمت کا حق بھی ادا ہوگا، اور ساتھ ہی ساتھ اللہ راضی بھی ہوں گے، اور اللہ کی طرف سے نعمت میں اضافہ ہوگا۔

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک ایسا نسخہ بتلایا ہے کہ اس کے ذریعہ سے بندہ اپنا تعلق اللہ کی ذات کے ساتھ قائم کرسکتا ہے۔ بس مانگو۔ کسی کو واسطہ بنانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کے کسی نیک بندے سے دعا کی درخواست کی، کوئی حرج نہیں؛ لیکن خود اللہ کے ساتھ اپنا رشتہ ایسا قائم کرو اور اتنا مانگو کہ بس! اللہ ہی سے مانگنے میں لگے رہو، جتنا اللہ پر یقین بڑھے گا، اللہ دیتا رہے گا۔

حضرت اقدس تھانویؒ کا ایک معمول:

حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں: ''کوئی آدمی میرے پاس آتا ہے تو وہ اپنی بات کہے اس سے پہلے بلاتخلف فوراً میرا دل اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، اور میں اللہ سے دعا کرتا ہوں: اے اللہ! تیرا یہ بندہ یہاں آیا ہے، تو نے بھیجا ہے، جس کام کے لیے بھی بھیجا ہو تو اُس کا کام میرے ذریعہ سے اچھا کرادے، کسی مشورے کے لیے آیا ہے تو میں اس کو صحیح مشورہ دوں، دعا کے لیے آیا ہے تو میں دعا دوں، یعنی وہ اپنی حاجت پیش کرے، بتائے اس سے پہلے دل اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتا۔'' جب ہم اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے کام بھی بن جائیں گے۔

عبادت صرف اللہ کی:

اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں تیسرا پہلو یہ ہے کہ اے اللہ! تیری ہی عبادت

کرتے ہیں، یعنی جن اعمال وافعال کا تعلق عبادت سے ہے وہ اللہ کے ساتھ خاص ہیں، مثلاً سجدہ، یہ عبادت کا ایک عمل ہے، وہ اللہ ہی کو کیا جائے گا، رکوع اللہ ہی کو کیا جائے گا، وہ قیام جس میں عبادت مقصود ہو، ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا وہ اللہ ہی کو کیا جائے گا۔ گویا عبادات کے جتنے بھی طریقے ہیں، اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں ہوں گے۔ ہم نے کہہ دیا أشهد أن لا إله إلا الله میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، کوئی معبود نہیں، جتنی بھی عبادت کی شکلیں ہیں، وہ اللہ ہی کے لیے کی جائیں گی، اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں کی جائیں گی۔ سجدہ اللہ ہی کو کیا جائے گا۔

براہِ راست:

جو لوگ بزرگوں کے مزارات پر جا کر سجدہ کرتے ہیں، بعض لوگ تو اس کی یوں تاویل کرتے ہیں کہ ہم تو اِن کو اللہ تک پہنچنے کا واسطہ بناتے ہیں، یہ تو وہی بات ہے جو مشرکین کہا کرتے تھے، مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى (الزمر: ۳) (ہم ان بتوں کی عبادت اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب کریں) یہی دلیل وہ بتوں کی عبادت کے لیے دیتے تھے۔ آج یہی دلیل اولیاء کے مزارات پر سجدہ کرنے والے، سجدہ کرنے پر دیتے ہیں۔ سجدہ تو اللہ کے ساتھ خاص ہے، اللہ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ نہیں کیا جائے گا۔ عبادت کی جتنی بھی شکلیں ہیں، جن جن اعمال وافعال کے ذریعہ عبادت انجام دی جاتی ہے، وہ اللہ کے ساتھ خاص ہیں۔

تیری ہی عبادت، اور تجھ ہی سے مدد:

یہاں ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، اور دنیا میں ہم بہت

سارے کاموں کے لیے دوسروں کی مدد حاصل کرتے ہیں۔ بیمار ہوئے، ڈاکٹر کی مدد حاصل کی، مکان بنانا ہے، مستری کی مدد حاصل کی۔ تو یہ اسباب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دار الاسباب بنایا ہے، تو بحیثیت اسباب کے اِن اسباب کو اختیار کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، اس کی اجازت دی ہے؛ لیکن ان اسباب کے اندر بھی ہماری نظر اللہ پر ہو کہ اصل ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والی ذات اللہ کی ہے۔ اثر ان اسباب میں نہیں ہے۔

اثر کروں یا نہ کروں؟

ایک بہت بڑے ڈاکٹر جن کی زندگی اسی ڈاکٹری کے پیشے میں گزری، بڑے ماہر تھے، ان کا مطب بھی بڑا آباد رہتا تھا، اور اس لائن کی کئی تنظیموں کے وہ ذمہ دار تھے، وہ کہتے ہیں: میری پوری زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ جب ہم دوا کسی کے لیے دیتے ہیں، تو دوا جب اس کے پیٹ میں جاتی ہے، تو وہ اللہ سے پوچھتی ہے کہ میں اپنا اثر کروں یا نہ کروں؟ وہاں سے اجازت ملتی ہے تو وہ اپنا اثر دکھاتی ہے ورنہ نہیں۔ مزید وہ کہتے ہیں: ہم نے دیکھا کہ ایک دوا، ایک بیماری کے لیے، ایک بیمار کو دی، اس کو اثر کیا۔ اور وہی دوا، اسی بیماری کے لیے، دوسرے کو لکھ دی، تو فائدہ نہیں ہوا۔ معلوم ہوا دوا میں کچھ نہیں ہے۔ فائدہ کس میں ہے؟ اللہ کے حکم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس میں تاثیر ڈال دیتے ہیں، اور اللہ چاہتے ہیں تو فائدہ ہوتا ہے۔ تو ہماری نگاہ اسی پر ہو۔ اسباب پر نگاہ نہ ہو۔

نظر اللہ پر ہو:

آپ نے دکان کھولی اور سامان لاکر اندر ڈال دیا، تو گاہک کون بھیجے گا؟ خریدنے والے تو اللہ ہی بھیجے گا نا؟ آپ سب کچھ لاکر کے بیٹھ گئے؛ لیکن تاکتے رہو! ہم نے ایسی

دکانیں دیکھی ہیں۔ دو دکانیں ایک جیسی ہیں، دونوں مال بھی ایک ہی کمپنی کا رکھتے ہیں؛ لیکن ایک کی دکان خوب چل رہی ہے، اور دوسرا بیٹھ کر کے تکتا رہتا ہے۔ اس ایک آدمی کی دکان پر خریدنے کے لیے گاہکوں کے دل میں جو بات ڈالی، وہ کس نے ڈالی؟ گاہک اللہ بھیجے گا۔ ہم کچھ بھی کر لیں! جب تک اللہ گاہک نہیں بھیجیں گے ہماری تجارت کیسے چلنے والی ہے؟ اس لیے کوئی بھی سبب اختیار کیا جائے تو ہمارا اس پر ایمان ہونا چاہیے، یقین ہونا چاہیے کہ اس سبب میں اثر ڈالنے والی ذات بھی اللہ کی ہے۔

کھانا کھایا تو کھانے میں تاثیر اللہ تعالیٰ ڈالیں گے تو بھوک مٹے گی، ورنہ بہت سوں کو جوع البقر کی بیماری ہو جاتی ہے، کھانا کھاتے ہیں؛ لیکن بھوک نہیں مٹتی، پانی پیتے ہیں؛ لیکن پیاس نہیں بجھتی۔ یہ کیا ہے؟ معلوم ہوا کھانا بھوک نہیں مٹاتا، پانی پیاس نہیں بجھاتا؛ بلکہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ جو کچھ ہے اللہ کے حکم سے۔ اللہ ہی سے مدد مانگو۔ اسباب اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ نگاہ ہماری اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے۔

بعض کافر بعض مؤمن:

بخاری شریف میں روایت ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر ایک رات بارش ہوئی، فجر کی نماز کے بعد نبی کریم ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اس بارش کی وجہ سے بعض بندے میرے کافر بنے، اور بعض میرے مؤمن بنے۔ جنہوں نے یوں کہا کہ یہ بارش اللہ کی رحمت سے اتری، وہ گویا مجھ پر ایمان لائے۔ اور جو یوں کہتے ہیں یہ فلاں ستارے کی چال کی وجہ سے، فلاں نچھتر (نکشتر) کی وجہ سے یہ بارش برسی، انہوں نے میرے ساتھ کفر کیا۔[۱]

---

(۱) أخرجه البخاري: ۹۹۱.

عرب ایسا کہا کرتے تھے۔تو حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی خود اسباب کو مؤثر سمجھتا ہے تو یہ کفر ہے۔ ہاں! سبب کے طور پر ہو؛ لیکن سبب کے ساتھ یوں سمجھنا چاہیے کہ تاثیر ڈالنے والی ذات کون ہے؟ اللہ۔

علاج ڈاکٹروں سے کرانے کی بھی شریعت نے اسی شرط کے ساتھ اجازت دی کہ آپ یوں سمجھیں کہ اس علاج سے فائدہ کب ہوگا؟ جب اللہ چاہیں گے۔آج یہ بات ذہن میں نہیں رہی ۔ فقہ کی کتابوں میں بھی فقہا نے یہ بات لکھی ہے کہ کسی طبیب سے علاج کراتے ہوئے اس خیال اور ارادے کے ساتھ علاج کرانا چاہیے کہ میں اس کی دوا استعمال کرتا ہوں ؛لیکن دوا میں شفا دینے والا اللہ ہے، دوا نہیں ۔آج کیا ہوگیا؟ مولانا صاحب! فلاں ڈاکٹر کے پاس جاؤ نا! اچھا ہوجائے گا۔لوگ ایسے انداز سے بولتے ہیں گویا اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا رکھی ہے، کہ تم جاؤ گے اور شفا ہو جائے گی ۔نہیں ! شفا تو اللہ دیتا ہے۔اس لیے میں تو کہتا ہوں: علاج کے معاملے میں بہت اونچا ڈاکٹر استعمال نہیں کرنا چاہیے، ذرا کم درجہ کا رکھنا چاہیے، تو نظر ڈاکٹر پر نہیں رہے گی ؛ کس پر رہے گی؟ اللہ پر رہے گی ۔ اونچے ڈاکٹر کو استعمال کروگے تو اللہ سے نظر ہٹ کر کے ڈاکٹر کی طرف چلی جائے گی ،تو جو مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہوگا۔اللہ ہی کو اصل ماننا ہے۔اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عطا فرمائے۔

سورۂ فاتحہ

(قسط-۵)

(مؤرخہ: ۸/ جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۴/ فروری ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝٤ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝٥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝٧

گذشتہ سے پیوستہ:

سورۂ فاتحہ چل رہی ہے، اب تک اس کی چار آیتیں ہوئی ہیں، اس کو تازہ کرلیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (جو سب پر مہربان اور بہت مہربان ہے)۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (جو روز جزاء یا روز حساب کا مالک ہے)۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں)۔

یہ چار آیتیں ہوگئی ہیں۔اب یہ پانچویں آیت ہے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (اے اللہ! تو ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما)۔

اس کو یاد بھی کر لیجیے، کئی روز سے سبق ہو رہا ہے، ایک ایک آیت بھی یاد کریں گے، تو یاد ہو جائے گی-ان شاء اللہ-تاکہ نماز میں جب پڑھیں، تو ذہن میں رہے کہ جو ہم پڑھ رہے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (اے اللہ! تو ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما) اللہ تعالیٰ سے جو مدد مانگی جاتی ہے (یعنی ہم اللہ ہی سے مدد مانگتے ہیں) وہ تمام چیزوں میں مانگی جاتی ہے؛ لیکن ہماری سب سے بڑی ضرورت صراط مستقیم ہے۔ اسی کو یہاں مانگنا سکھایا گیا ہے۔اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔

ہدایت کے دو معانی:

عربی زبان میں لفظ ہدایت دو معنیٰ ادا کرنے کے لیے آتا ہے:

(۱) إراءة الطريق (صرف راستہ بتلا دیا جائے): ایک آدمی آپ سے پوچھتا ہے کہ مجھے اسٹیشن جانا ہے، اسٹیشن تک رہنمائی کرو۔ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ یہاں بیٹھے بیٹھے اس سے یوں کہیں کہ مسجد سے نکلو، نکل کر بائیں طرف چلو، پھر راستہ آئے گا تو دائیں

طرف مڑ جانا، پھر ایک کشادہ راستہ آئے گا، وہاں سے آگے بڑھنا، راستہ میں پل آئے گا اس کو پار کرنا۔ اس طرح فلاں راستہ، فلاں راستہ، یہاں تک کہ آپ نے اسٹیشن تک کی ساری تفصیل اس کو زبانی بتلادی۔ اس کو اراءۃ الطریق کہا جاتا ہے۔

(۲) إیصال إلی المطلوب: یعنی آپ سے کوئی پوچھے کہ اسٹیشن تک میری رہنمائی کیجیے، تو آپ نے کہا: چلو آؤ! آپ نے اس کو اپنی بائک پر اپنے پیچھے بٹھادیا، اور اسٹیشن پہنچ کر اُتار دیا، ہاتھ پکڑ کر لے گئے کہ یہ اسٹیشن ہے۔ اس کو ایصال الی المطلوب کہتے ہیں۔ ہدایت کی یہ دو شکلیں ہیں۔

صراطِ مستقیم مانگو!

یہاں صراطِ مستقیم سے جو ہدایت مانگی جارہی ہے، وہ دوسری قسم ہے۔ اے اللہ! ہم کو صراطِ مستقیم پر پہنچادے۔ جو تفصیلات بتلائی جاتی ہیں وہ تو پورا قرآن ہے، آپ جب قرآن کریم پڑھیں گے تو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی تفصیلات بتلائی ہیں، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ سیدھا راستہ کون سا ہے، یہ بتایا ہے، اور قرآن کریم میں بھی سب کچھ بتایا گیا ہے۔ تو ہدایت کا پہلا طریقہ یہاں مراد نہیں ہے، بلکہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (اے اللہ! تو ہمیں سیدھے راستے پر لاکر کھڑا کردے) ہماری انگلی پکڑ کر وہاں پہنچادے۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ سے مانگی جارہی ہے، اس لیے کہ یہ تفصیلات تو سب کو بتلائی گئی ہیں، مؤمن ہو، کافر ہو، منافق ہو، ایمان لایا ہو، نہ لایا ہو۔ یہاں جو صراطِ مستقیم مانگا گیا ہے وہ یہی ہے کہ اے اللہ! بس، تو ہم کو صراطِ مستقیم پر لاکر کھڑا کردے۔

اور دیکھیے! صراطِ مستقیم میں کوئی تفصیل نہیں کی گئی، سیدھا راستہ کہاں کا؟ کس کا؟ مطلق

رکھا گیا ہے۔عربی زبان میں جب مفعول کو مطلق رکھا جاتا ہے،تو سب مراد ہوتے ہیں۔یعنی ہر چیز کا سیدھا راستہ۔اے اللہ! دنیا اور آخرت کے تمام امور میں ہمیں سیدھا راستہ بتلا۔

سب کچھ اس میں آجاتا ہے:

دنیا کے کاموں میں: جیسے ہم تجارت کرنا چاہتے ہیں تو تجارت کا سیدھا راستہ ہم کو بتلادے،تجارت کا وہ طریقہ جس سے تو راضی ہوتا ہے،ہم اسی کے مطابق تجارت کریں،اور آسانی کے ساتھ اپنے مقصود کو پالیں۔ اگر ہم زِراعت کرنا چاہتے ہیں تو زراعت کے سیدھے راستہ کی رہنمائی ہمیں عطافرما،ہم کو اس پر لاکر کے کھڑا کردے،ہم اس کو بآسانی اپنا لیں،اور مقصود تک پہنچ جائیں۔ہم بیمار ہیں،علاج کرانا چاہتے ہیں،تو اے اللہ! علاج کے سلسلہ میں جو صراط مستقیم ہے اس کی طرف رہنمائی فرما۔اس سلسلہ میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں، بہت سی مرتبہ مشورہ دینے والوں کے مشورہ کے نتیجہ میں آدمی الجھن میں پڑ جاتا ہے کہ ہم علاج کے لیے کون سی شکل اختیار کریں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دعا سکھلائی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ. یہ دعا مانگو،اور اس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے دل میں جو ڈالا جائے اس کے مطابق آپ کو علاج کا طریقہ اپنانا ہے۔الحاصل ہر چیز میں اللہ سے صراط مستقیم مانگنا ہے،چاہے دنیوی امور ہوں یا اخروی امور ہوں،اللہ تعالیٰ ان تمام امور کو صحیح طریقہ سے،صحیح نیت کے ساتھ،شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق ہم سے انجام دلوائیں۔اگر ہمیں یہ حاصل ہوگئی،اگر ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صراط مستقیم مل گیا تو ہمارا کام بن گیا۔بظاہر یہ چھوٹا سا جملہ ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ تین کلمے ہیں، اھدنا اور الصراط اور المستقیم لیکن سب کچھ اس میں آجاتا ہے۔

خلاصے کا خلاصہ:

اسی لیے لوگوں نے کہا ہے: پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے، اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہے۔ پہلی تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی پھر ہم نے اللہ ہی کی بندگی کا اقرار کیا، اللہ ہی سے مدد مانگنے کا اقرار کیا اور اب ہم اللہ سے یہ سوال کر رہے ہیں: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ اے اللہ! ہر چیز (دین، دنیا) میں سیدھا راستہ ہمیں بتلا دے اور اس کے مطابق ہم سے عمل کروا لے۔ گویا تو ہم کو وہاں لا کر کھڑا کر دے۔ قرآن و حدیث میں اس کی تفصیلات ہیں؛ لیکن اس دعا کے ذریعہ ہم جو مانگ رہے ہیں وہ یہی مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں تو اس سلسلہ میں سیدھے راستے پر لا کر کے کھڑا کر دے، ہمیں کوئی زحمت نہ ہو، کسی قسم کی گمراہی میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے، اس انداز سے صراط مستقیم کا سوال کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ ابھی بتلایا ہدایت میں یہ سب آجاتا ہے۔ ہم آخرت کے اعتبار سے اللہ پر ایمان لائیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں، فرائض و واجبات کی ادائیگی کا اہتمام کریں، جائز ناجائز کے مطابق اپنی زندگی کو استوار کریں، یہ سب کر لیں گے تو ہمارا کام بن جائے گا۔

یہی دعا حدیث میں:

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی یہی صراط مستقیم، یہی ہدایت اللہ سے خاص طور پر دعا کر کے مانگی ہے۔ چناں چہ حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا وارد ہے: اللّٰهم إن قلوبنا و نواصينا وجوارحنا بيدك لم تملكنا منها شيئا فإذا فعلت ذالک بنا فكن أنت ولينا

واهدنا إلى سواء السبيل.[۱] (اے اللہ! بے شک ہمارے دل، ہماری پیشانیاں، اور ہمارے اعضاء، ہماری آنکھیں، ہمارے کان، ہماری زبان، ہمارے ہاتھ، ہمارے پاؤں، ہماری ہر چیز تیرے قبضۂ قدرت میں ہے، تو نے ہمیں ان میں سے کسی چیز کا مالک نہیں بنایا، کوئی اختیار ہمارے پاس نہیں ہے۔ جب تیرا یہ معاملہ ہے ہمارے ساتھ، تو ہی ہمارا کارساز بن جا، اور ہم کو سیدھے راستے پر لا کر کھڑا کر دے)۔ تفصیلات تو قرآن و حدیث میں بھی ہے، لیکن صرف ان تفصیلات کو سننے سے کام نہیں بنتا، جب تک اللہ تعالیٰ ہمیں وہاں لا کر کھڑا نہ کر دے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم کو مانگا گیا ہے۔

اس دعا سے قبل دو باتوں کا اہتمام کرلے:

اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کا اہتمام کیا جائے۔ اور آدمی اس دعا سے پہلے دو چیزوں کا اہتمام کرلے: (۱) عزم مصمم (۲) اپنی قدرت میں جتنا ہے اتنا کرلے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگے تو اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرماتے ہیں۔ مثلاً: ایک آدمی تجارت کرنا چاہتا ہے، تو تجارت کے سلسلہ میں شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق مجھے تجارت کرنی ہے، یہ عزم مصمم کرلے، کیسے ہی حالات کیوں نہ پیش آئیں، کیسی ہی رکاوٹیں کیوں نہ پیش آئیں، کیسی ہی مشکلات کا کیوں سامنا نہ ہو؛ لیکن اسی طریقہ کے مطابق میں اپنی تجارت کروں گا، یہ عزم مصمم۔ اور اپنی طاقت کے مطابق اس پر عمل کرنا بھی شروع کر دے۔ اور اس میں جو رکاوٹیں آئیں ان رکاوٹوں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اے اللہ! ہماری رہنمائی فرما، ہمیں وہاں تک پہنچا دے۔

---

(۱) أخرجه أبو نعيم في الحلية: ۸/ ۳٦۷ (ط: مكتبة الخانجي، القاهرة) والخطيب في التاريخ ۱۵/ ۲٦۴ (ط: دار الغرب الإسلامي) والمتقي الهندي في كنز العمال: ۲/ ۱۸۲ (ط: مؤسسة الرسالة)

کہیں گناہ میں پھنسنے کا، گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو اس وقت بھی یہی عزم کرلیں، کچھ بھی ہو جائے، کیسی ہی صورت کیوں نہ ہو، ہم اس گناہ کا ارتکاب نہیں کریں گے، اور ساتھ ہی ساتھ اس گناہ سے بچنے کے لیے ہمارے مقدور میں جتنا ہے، ہمارے بس میں جتنا ہے وہ کر گزریں، اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں، تو اللہ تعالیٰ راستے کھول دیتا ہے۔

عبرة لاولی الالباب:

سیدنا حضرت یوسفؑ کا واقعہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا، قرآن میں جتنے بھی واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ کوئی قصے کہانی تھوڑے ہیں! بلکہ ان سے سبق دینا مقصود ہوتا ہے۔ سیدنا حضرت یوسفؑ سے زلیخا نے مطالبہ کیا۔ اب زلیخا کون ہے؟ وہ تو ان کے آقا کی بیوی ہے، ان کی خواہش پوری کرنے کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے لیے سارے اسباب مہیا کر دیے، دروازے بند کر دیے، دروازوں پر تالے لگا دیے، اور پھر خالی کہنا نہیں؛ بلکہ با قاعدہ عملی طور پر حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے بھی کوشش کی، ان کا دامن پکڑا۔ اس موقع پر حضرت یوسفؑ اگر یہ سوچتے کہ اب تو میں بالکل بے بس ہوں، اب تو میرے لیے اس چیز کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں ان کی بات پر عمل کروں۔ اس لیے کہ دروازے بھی بند ہیں، نہ کوئی آ سکتا ہے، نہ کوئی میری مدد کے لیے آئے گا، نہ میں باہر نکل سکتا ہوں، کیوں کہ تالے لگے ہوئے ہیں۔ سامنے تالا موجود ہے پھر بھی حضرت یوسفؑ نے اپنا ارادہ پختہ کرلیا، مجھے اس گناہ پر عمل نہیں کرنا ہے، اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرنا ہے، اور پختہ ارادہ کرلیا کہ اس گناہ سے مجھے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ اور اس عزم کے ساتھ پھر اپنی طاقت میں جتنا تھا کہ اس کے ہاتھ سے اپنے آپ کو چھڑا کر کے دروازے کی طرف بھاگے،

حالاں کہ دروازے پر تالے لگے ہوئے ہیں، دروازہ بند ہے۔ دوسرا آدمی یوں سوچتا کہ بھاگ کر بھی کیا کروں گا؟ وہاں جا کر بھی کچھ کام تو ہونے والا نہیں ہے! لیکن نہیں؛ حضرت یوسفؑ نے ہتھیار نہیں ڈالے، اتنا (دروازے تک) بھاگنا تو اپنے ہاتھ میں تھانا، اتنا تو کرلیا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں دروازے کے پاس پہنچے، خود ہی تالا ٹوٹا، دروازہ کھلا، باہر اپنے آقا کو پایا۔

بہرحال! کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی اللہ کے حکم پر عمل کرنے کا عزم مصمم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی طاقت میں اس پر عمل کرنے کے لیے جتنا کچھ ہوسکتا ہے وہ کرگزرے اور آگے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ سے مدد مانگے، تو پھر دیکھو! اللہ تبارک تعالیٰ ساری رکاوٹیں دور کردیں گے، اور اس کے لیے عمل کی راہیں اللہ تعالیٰ آسان کردیں گے۔ یہی دعا اللہ تعالیٰ سے مانگنی ہے۔ اور ہمیں اپنی زندگیوں کو اسی کے مطابق بنانا ہے، اسی کی کوشش کرنی ہے۔

گویا ایک آدمی زبان سے دعا مانگے؛ لیکن اس دعا کے تقاضے کے مطابق عمل نہ کرے، اس کا گناہ سے بچنے کا عزم نہ ہو، اور کہے: اللہ! بدنگاہی سے میری حفاظت فرما لیکن بدنگاہی سے بچنے کے لیے عزم مصمم نہیں کرتا، بدنگاہی سے بچنے کے لیے اپنی طاقت میں، اپنے بس میں، اپنی قدرت میں جتنا ہے وہ کرتا نہیں ہے اور پھر یوں کہتا ہے کہ: میں تو بے بس ہوں۔ کس طرح ہوگا؟ یہ دونوں کام تو کرنے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں۔

......تو دعا نہیں، مذاق ہے:

پہلے یہ دونوں کام کیے بغیر اگر دعا مانگیں گے تو وہ دعا نہیں؛ مذاق ہے۔ سیدھی بات

ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اس کے مطابق ہی کرنا ہے تو اس کے لیے یہ دو کام جب کریں گے، پھر دعا مانگیں گے تو حقیقی معنی میں طلب ہوگی، دعا ہوگی، اور اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد بھی فرمائیں گے۔ ورنہ نہ تو عزم مصمم ہو، نہ اپنے مقدور بھر جو کچھ کر سکتے ہیں اس کے کرنے کا اہتمام ہو، خالی زبان پر یہ ہو کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ یہ تو یوں سمجھیے کہ ایک جھوٹا مطالبہ ہے، طلب صحیح نہیں ہے، صحیح طلب تو اسی وقت کہلائے گی جب پہلے ہماری طرف سے دو کام عمل میں آ جائیں، تو پھر تیسرا ہماری طرف سے دعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے جو مطالبہ کیا گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس مطالبہ کو پورا فرمائیں گے۔ ورنہ ہم تو دل سے نہیں چاہتے، ہم نے اس کے لیے عزم مصمم نہیں کیا، ہم نے اس کے لیے اپنی طرف سے جو کوشش کر سکتے ہیں وہ کوشش نہیں کی، اور پھر ہم یہ امید رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ کام کروائیں اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ۔ (هود:۲۸) کیا ہم زبردستی تمہارے سر تھوپیں گے، جب کہ تم دل سے اس کو چاہتے نہیں ہو؟ دل سے آدمی چاہے، اس کے لیے عزم مصمم کرے، عملی اقدام بھی جتنا اس کی طاقت میں ہے، بس میں ہے وہ کر گزرے، اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے راہ کھول دیں گے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ روزانہ، ہر نماز میں، اور نماز کی ہر رکعت میں گویا ہم کو یہ دعا سکھلائی گئی۔ جب یہ پڑھیں تو پڑھتے ہوئے ہمیں اس کا احساس ہونا چاہیے۔ جو لوگ اس کے معانی کو جانتے ہیں وہ بھی اس کے اوپر سے غفلت کے ساتھ گزر جاتے ہیں، اور اس کی طرف سے بے اعتنائی کے ساتھ گزر جاتے ہیں، کیا مانگا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ٹیپ ریکارڈ کا ایک بٹن ہے، دبا دیا اور ٹیپ چل رہی ہے، ہماری نماز کا بھی ایسا حال ہو گیا ہے۔

ہر ہر جملہ جب ہماری زبان سے نکلے تو یہ دعا دل کی گہرائیوں سے ہماری زبان پر

آنی چاہیے، پھر دیکھو! اللہ تعالیٰ اس کے کیسے اثرات اس پر مرتب کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کیسے نوازتے ہیں ۔ ہر رکاوٹ کو ان شاء اللہ دور کر دیں گے ، ہر پریشانی کو اللہ تعالیٰ ختم کر دیں گے، ہر مشکل کو اللہ تعالیٰ آسان فرمادیں گے؛ لیکن بس! بات وہی ہے کہ اللہ سے دل کی گہرائی سے اس کی طلب ہو، اور اس طلب سے پہلے جو دو شرطیں ہیں -عزم مصمم اور اپنی قدرت کے مطابق اس پر عمل کرنے کی- وہ دونوں شرطیں پوری ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔

سورۂ فاتحہ

(قسط-٦)

(مؤرخہ ۱۵/جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق ۴/مارچ ۲۰۱۸ء شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

آموختہ:

سورۂ فاتحہ کی چار آیتیں ہو چکی ہیں، دوبارہ ان کا ترجمہ کر لیتے ہیں تا کہ ذہن نشین ہو جائیں۔ یہ سورت چوں کہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے، اس لیے ضرورت ہے

کہ اس کی ہر ہر آیت کا مطلب اور ترجمہ ہمیں یاد ہو، تاکہ جب نماز میں پڑھیں تو اس کو سمجھ کر دھیان اور توجہ کے ساتھ پڑھیں۔ اس لیے سننے والوں سے بھی درخواست ہے کہ اس کے ترجمہ ومعانی کو اپنے دل ودماغ میں محفوظ کرلیں۔

۞ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)۔

۞ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے)۔

۞ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (جو روز جزاء یا روز حساب کا مالک ہے)۔

اس دنیوی زندگی کے بعد دوسری زندگی ہے، میدان حشر میں اللہ تعالیٰ کے حضور ہمیں اپنی دنیوی زندگی کے تمام اعمال کا حساب دینا ہے، کوئی بچ نہیں سکتا۔ اُس دن اللہ تبارک وتعالیٰ کی ملکیت اور اس کی بادشاہت کا ظہور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ روز جزاء کا مالک ہے، یعنی مالک تو اللہ تعالیٰ آج بھی ہیں؛ لیکن دنیا میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کو بھی چیزوں کی مجازی ملکیت عطا فرمائی ہے۔

حقیقی مالک، اللہ:

میں اور آپ کپڑا پہنے ہوئے ہیں، کپڑے کے ہم مالک کہلاتے ہیں۔ ہماری جیب میں جو پیسے ہیں، ہم اس کے مالک کہلاتے ہیں، اپنے مکان کے مالک کہلاتے ہیں، اگرچہ ملکیت حقیقی نہیں ہے، حقیقی ملکیت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے؛ لیکن ہم مالکِ مجازی ہیں۔ دنیا میں فائدہ اٹھانے کا اللہ تعالیٰ نے ہم کو موقع دیا ہے۔ یہ سب املاک بھی اُس دن نہیں رہیں گی۔ کسی کے پاس کچھ نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ قبروں سے جب اٹھائیں گے، تو بدن پر کپڑا نہیں

ہوگا، پاؤں میں جوتا نہیں ہوگا، جیسا ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، ویسا اٹھایا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں برہنہ پا، برہنہ بدن، اور بغیر ختنہ کیے ہوئے اٹھائے جائیں گے۔[۱] باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: كَمَا بَدَأْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (الانبیاء: ۱۰۴) کسی کی کوئی چیز نہیں، سب چیزوں کے مالک حقیقت میں بھی اللہ اور ظاہری اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ ہوں گے۔ کسی کی کوئی حکومت نہیں، اللہ تعالیٰ خود سوال کریں گے: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ. (الغافر: ۱۶) (آج کس کی حکومت ہے؟) کوئی جواب دینے والا نہیں ہوگا، اللہ تبارک وتعالیٰ خود ہی جواباً فرمائیں گے: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (ایک اللہ کی جو غلبہ والا ہے) تو یہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا استحضار ہونا چاہیے۔ یہ آیتیں جب پڑھیں تو اس وقت اس کا تصور ہونا چاہیے۔

یہ بات گزر چکی کہ اس سورت کے منجملہ اسما کے ایک نام سورة الصلاة ہے۔ اس لیے کہ یہ سورت نماز میں پڑھی جاتی ہے۔ جب بندہ نماز میں پڑھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں، اس کا استحضار ہونا چاہیے۔

اجابت از درِ حق بہر استقبال......:

مسلم شریف کی روایت ہے: بندہ جب نماز میں پڑھتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے) تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: حمدني عبدي (میرے بندے نے میری حمد بیان کی، میری تعریف کی) یہ استحضار ہونا چاہیے۔ چناں چہ آدمی جب پڑھے تو قدرے ٹھہر جائے، گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے جواب دیا جارہا ہے اس کا تصور کرے۔

---

(۱) أخرجه البخاري: ٦١٦١ ومسلم: ٢٨٥٩.

شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کے متعلق نقل کیا جاتا ہے- بڑے اولیا وصوفیا میں سے تھے- کہ نماز میں جب میں سورۂ فاتحہ پڑھتا ہوں تو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ پر ٹھہرتا ہوں اور اللہ کا جواب سنے بغیر آگے نہیں بڑھتا۔ اللہ کے ایسے بھی بندے ہیں!!! اور آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا، اور آپ کا ارشاد حق ہے: اللہ تعالیٰ نے میرے اس پڑھنے کے جواب میں یہ فرمایا۔ اگرچہ میں نے اپنے ضعف حس کی وجہ سے نہیں سنا؛ لیکن اللہ نے فرمایا ہے۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: جب بندہ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ پڑھتا ہے، تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اثنیٰ عليّ عبدي (میرے بندے نے میری ثنا بیان کی) اور جب بندہ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ (جو روز جزاء کا مالک ہے) پڑھتا ہے، تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: مجّدني عبدي (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی) اِن تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ (اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) عبادت اللہ کی ہوتی ہے تو یہ آدھا حصہ تو اللہ کے لیے ہوا۔ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ (تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) یہ بندے کی حاجت پوری ہوئی۔ اس لیے اس کے جواب میں کہا: هذا بيني و بين عبدي ولعبدي ماسأل (یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کو وہ ملا، یا میں نے دیا جو اس نے مانگا) اور آگے جب پڑھتا جائے گا: اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ تو اللہ تعالیٰ فرماتے جائیں گے: هذا لعبدي ولعبدي ماسأل ، هذا لعبدي ولعبدي ماسأل (یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو جا مانگا وہ میں نے اس کو دیا۔[۱] لہٰذا یہ استحضار ہونا چاہیے۔

---

(۱) أخرجه مسلم: ۳۹۵.

آمدم برسرِ مطلب:

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما) پر پہنچے تھے، اس سلسلہ میں بتلایا تھا کہ ہر چیز میں سیدھا راستہ دنیوی امور میں بھی، اور اخروی امور میں بھی۔

ہم تجارت کرتے ہیں تو اس میں بھی اللہ سے مانگیں: اے اللہ! ہم کو تیرا راستہ بتلا دے، اُسی کے مطابق ہم حلال طریقہ سے تجارت کریں۔ اور تجارت میں کوئی غلط چیز جس کو تو نے منع فرمایا ہے ہم اس کا ارتکاب نہ کریں۔ گویا اس میں سیدھا راستہ۔ ہم علاج معالجہ کے لیے جا رہے ہیں تو اس میں بھی سیدھا راستہ۔ اور جس کے پاس جائیں اس کے اوپر بھی اللہ تعالیٰ بیماری کی حقیقت منکشف فرمائے اور اس کا علاج بھی اللہ تعالیٰ منکشف فرمائے۔ تو اگر آدمی ہر چیز میں سوال کرے گا اور اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ پڑھتے ہوئے سوچے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ولعبدي ماسأل کا پروانہ ہوگا۔

معلومات کو معمولات بناؤ!!!

شروع میں یہ بات گزر چکی کہ اس کی فضیلت کے سلسلہ میں احادیث میں وارد ہیں: ایک مرتبہ حضرت جبریلؑ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور آسمان سے ایک آواز آئی، انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور فرمایا: آج آسمان کا ایک ایسا دروازہ کھلا جو آج تک کبھی نہیں کھلا، اور آج اس سے ایک فرشتہ اترا جو کبھی زمین پر نہیں آیا تھا، اور اس نے آ کر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کی امت کو دو نور عطا فرمائے جو کسی کو پہلے نہیں دیے گئے،

جو آدمی اس سے دعا کرے گا اللہ اس کو قبول فرمائیں گے۔[۱] اللہ نے دعا سکھلائی اور اللہ نے یہ دعا ہر نماز، بلکہ نماز کی ہر رکعت میں ہم پڑھتے تو ہیں؛ لیکن اس کو پڑھتے وقت جو توجہ، دھیان اور استحضار ہونا چاہیے وہ نہیں ہے۔ ایک عادت بن گئی ہے کہ روزانہ ہماری زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے چلے جاتے ہیں اور ہمارا خیال کسی اور چیز کی طرف ہوتا ہے، تو اس کا حقیقی فائدہ ہم کو نہیں پہنچتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس کا اہتمام کریں۔ کوشش کریں اور اس کی عادت ڈالیں۔

بہر حال! یہ پانچویں آیت تھی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (اے اللہ! تو ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما) ہر چیز میں، دنیا و آخرت کے تمام کاموں میں۔

صراط مستقیم کیا ہے......؟؟

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یہ چھٹی آیت ہے۔ صراط مستقیم کیا ہے؟ صراط مستقیم بتلایا جا رہا ہے، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں پر انعام فرمایا ان کا راستہ۔

دوسری جگہ سورۂ نساء میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ۔ (النساء:٦٩) جو لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت اور فرماں برداری کرتے ہیں، تو جب انہوں نے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ گزاری تو اللہ تعالیٰ قیامت میں بھی اُن کو ان بندوں کے ساتھ -جن پر اللہ کا انعام ہوا- رکھیں گے، ویسے جو مقام اور

(۱) أخرجه مسلم:۸۰٦

مرتبہ اُن کا ہے وہ تو نہیں ؛ لیکن وہاں آسانی کے ساتھ وہ ملاقات کر سکیں گے ۔ جیسے سفر میں ہمارا کوئی رفیق ہے، فرسٹ کلاس میں بیٹھا ہوا ہے، اس کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے، ہم فرسٹ کلاس میں چوں کہ نہیں بیٹھ سکتے ؛ لیکن باقاعدہ اس گاڑی کا ٹکٹ ہمارے پاس ہے تو ملاقات کے لیے جائیں تو کم سے کم اتنی گنجائش تو نکلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تمام لوگوں کو- جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا اہتمام کرتے ہیں- موقع دیا جائے گا کہ ان کی ملاقات جب چاہیں کر لیں، ان کا دیدار کر لیں۔

منعم علیہ کون؟

ایک صحابی نے آکر نبی کریم ﷺ سے درخواست کی تھی: اے اللہ کے رسول! مجھے آپ کے ساتھ ایسی محبت ہے، آپ کو دیکھے بغیر مجھے چین نہیں پڑتا، گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کی یاد آتی ہے تو آجاتا ہوں اور دیکھ لیتا ہوں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ دنیا میں تو میں کر لیتا ہوں، آخرت میں کیا ہوگا؟ تو پھر اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ بتایا گیا۔ جن پر انعام کیا گیا ہے وہ کون ہیں؟

اس آیت میں بتلایا گیا کہ مِّنَ النَّبِيِّنَ.

انبیاء تو وہ جماعت ہے جن پر اللہ تبارک وتعالیٰ وحی بھیجتے ہیں۔ نبوت کسی آدمی کی اختیاری چیز نہیں ہے، کوئی آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے نبی نہیں بن سکتا ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا انتخاب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض بندوں کو چنتے ہیں، اور ان پر فرشتوں کے ذریعہ وحی بھیجتے ہیں، اور ان کو اس بات کا پابند کیا جاتا ہے کہ وحی کے ذریعہ جو پیغامات تم کو دیے گئے ہیں، ہمارے ان پیغامات کو دوسرے بندوں تک پہنچاؤ۔ انبیاء سے

اللہ تعالیٰ دوسرے بندوں کی اصلاح کا کام لیتے ہیں۔اب جب نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اب نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ ویسے قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نازل ہوں گے ؛ لیکن ان کی بعثت تو حضور ﷺ سے پہلے ہو چکی ہے۔

وَ الصِّدِّيْقِيْنَ اور دوسری جماعت جن پر اللہ کا انعام ہوا وہ صدیقین کی ہے۔ یعنی اپنے ظاہر اور باطن سے وہ اللہ کے نبیوں کی تصدیق کر چکے، یعنی اللہ کے نبیوں کو ماننا، ظاہر سے بھی اور باطن سے بھی۔ گویا ان کے ماننے کے معاملہ میں انہوں نے کوئی دلیل نہیں مانگی، بغیر دلیل کے، سچے دل سے ان کو تسلیم کیا۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو جب اپنی نبوت سے آگاہ کیا تو فوراً ایمان لے آئے، انہوں نے نبوت کی کوئی دلیل نہیں مانگی۔ آپ ﷺ جب معراج سے واپس تشریف لائے، تو ابھی تک حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس بات پہنچی نہیں تھی، اور لوگوں کو معلوم ہوا تو اُن سے کہنے لگے کہ تم جن پر ایمان لائے وہ کیا کہتے ہیں معلوم ہے؟ تو حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا: اگر وہ کہتے ہیں، تو صحیح ہے۔ دلیل کے بغیر سچے دل سے جو تسلیم کر لے، جی جان سے ان کی صداقت کی گواہی دے تو اس کو صدیق کہا جاتا ہے۔

وَ الشُّهَدَآءِ تیسری جماعت ہے شہدا۔ اللہ کے دین کے لیے وہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں، تو یہ تیسری جماعت ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔

وَ الصّٰلِحِيْنَ چوتھی جماعت صالحین۔ نیک بندے جو ہر طاعت کا اہتمام کرتے ہیں، اور اللہ کی منع کی ہوئی ہر چیز سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں، ذرہ برابر بھی اس میں کمی کوتاہی نہیں

کرتے۔ طاعت کا مکمل طور پر اہتمام اور مناہی سے مکمل طور پر اجتناب، یہ صالحین کی جماعت ہے۔ پس آیت کریمہ میں بتلایا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی برکت سے اُس کا حشر بھی انبیاء وصدیقین وغیرہم کے ساتھ ہوگا۔[۱]

آدمی کو چاہیے کہ اللہ کی اطاعت کا ایسا اہتمام کرے کہ کسی بھی طاعت کے معاملہ میں، اس کی بجا آوری میں کوئی کمی کوتاہی نہ ہونے پائے، اور کسی بھی معصیت سے بچنے کے معاملہ میں بھی کوئی کمی کوتاہی نہ ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

دیکھو! یہاں صراط مستقیم کی وضاحت میں کہا گیا: ان لوگوں کا راستہ جن پر اللہ نے انعام کیا، اس کے ذریعہ ایک بہت بڑی حقیقت بتلائی گئی اور ایک غلط فہمی کو دور کیا گیا۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن ہمارے پاس ہے، اور ہم عربی زبان جانتے ہیں، یا اگر چہ ہم عربی زبان نہیں جانتے؛ لیکن آج کل تو قرآن کے ترجمے بکثرت ہو گئے ہیں، ہم اپنے طور پر قرآن کا مطالعہ کر کے اس کے مطابق عمل کر لیں گے، یہ ہماری ہدایت کے لیے کافی ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم کسی سے پوچھیں کہ فلاں عالم کیا کہتے ہیں؟ اور فلاں صالح کیا کہتے ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ اگر ہدایت کا راستہ پانا چاہتے ہو تو اس منعَم علیہ جماعت-جن پر اللہ کا انعام ہوا- کی صحبت اختیار کرو۔ ان کی صحبت اختیار کرو گے تو ہی آپ کو ہدایت کا راستہ ملے گا۔

اللہ تعالیٰ کا دستور یہی رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتابیں بھیجیں، کتابیں انسان کی

(۱) أخرجه الطبراني في الصغير: ۵۲ (ط: مكتب الإسلامي دار عمار، بيروت).

ہدایت کے لیے ہی بھیجی جاتی ہیں، قرآن میں بھی اللہ نے ہدایت کا راستہ کھول کر بیان کر دیا ہے- میں نے جہاں ہدایت کی وضاحت کی تھی وہاں بتلایا تھا کہ ہدایت کی ایک قسم ہے راستہ بتلا دینا، وہ تو اللہ تعالیٰ نے بتلا ہی دیا ہے، سب کے لیے، مؤمن ہو، کافر ہو، ہر ایک کے سامنے کھلی ہوئی کتاب ہے-؛ لیکن اللہ تعالیٰ منزل مقصود تک پہنچادیں، یہ اصلی ہدایت ہے۔ ایصال الی المطلوب، اسی کا سوال کیا جارہا ہے۔ اور یہ ہدایت کب ملے گی؟ جب کہ ان کی صحبت اختیار کی جائے گی۔ ان کی صحبت ہی سے آپ کو صحیح راستہ ملے گا۔

کتاب اللہ اور رجال اللہ:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کتابیں نازل کیں، کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ کا بھی سلسلہ رکھا، کبھی ایسا تو نہیں ہوا کہ کتاب اتاری ہو اور اس کے ساتھ نبی اور پیغمبر نہ بھیجا ہو، جتنی بھی کتابیں اللہ نے بھیجی ہیں نبی اور پیغمبروں پر ہی بھیجیں۔ ایسا تو ہوا کہ پیغمبر بھیجا، ساتھ میں کتاب نہیں ہے۔ پہلے بھیجی ہوئی کتاب کے تابع بنا دیا، الگ سے کتاب نہیں دی گئی؛ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب بھیجی ہو اور ساتھ میں نبی اور پیغمبر کو نہ بھیجا ہو، نہیں! پیغمبر اور نبی ہوں گے تب ہی کتاب پر عمل کا طریقہ معلوم ہوگا۔ قرآن میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ. (النحل:۴۴) (ہم نے یہ نصیحت کی کتاب، یہ قرآن آپ پر اتارا، تاکہ آپ ان لوگوں کے لیے قرآن کی ہدایتوں کو واضح کریں) گویا قرآن کے بتلائے ہوئے راستے کو نمونہ پیش کر کے عملی طور پر بتلانا یہ پیغمبروں کا اور جنہوں نے پیغمبروں کی صحبت اٹھائی -صدیقین، شہدا اور صالحین- ان کا کام ہے۔ ان کے ساتھ رہو گے تو ہی آپ کو ہدایت کا راستہ ملے گا۔ صرف قرآن کے مطالعہ سے

نہیں ۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مشرکین نے کہا تھا: لَوۡ لَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ۔(الزخرف:۳۱) (یہ قرآن دو بستیوں (مکہ مکرمہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟) اللہ تعالیٰ چاہتے تو اس پر قدرت رکھتے تھے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تمام حضرات لیٹے ہوئے ہیں، صبح کو جب اٹھیں تو تکیہ کے پاس قرآن رکھا ہوا ہو، نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسمان سے اعلان کر دیا جاتا کہ تمہارے پاس اللہ کی کتاب رکھ دی گئی ہے، اس کا مطالعہ کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ لیکن ایسا نہیں کیا۔ بلکہ کتاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے رجال اللہ یعنی اللہ کے مخصوص بندے، پیغمبروں کو بھی بھیجا۔ توریت بھیجی تو حضرت موسیٰؑ پر بھیجی، زبور بھیجی تو حضرت داودؑ پر، انجیل حضرت عیسیٰؑ پر، قرآن حضرت نبی کریم ﷺ پر۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اکیلی کوئی کتاب بھیجی۔ اکیلی کتاب سے ہدایت نہیں پھیلتی۔

صحبت ضروری ہے:

دنیوی علوم وفنون بھی خالی کتاب پڑھنے سے نہیں آتے۔ میڈیکل سائنس ہے، کوئی ڈاکٹر بننا چاہتا ہے، ڈاکٹری کی کتابیں چھپی ہوئی موجود ہیں، ایک آدمی بہترین انگریزی زبان جانتا ہے، وہ یہ دعویٰ کرے کہ میں میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر بن جاؤں گا اور مریضوں کا علاج کروں گا، تو اگر وہ علاج کرے گا تو قبرستان آباد کرے گا۔ کسی ڈاکٹر کی صحبت میں رہے بغیر خالی میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھنے سے وہ ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح دوسری اقسام ہیں، جیسے کوکنگ (cooking) یعنی کھانا پکانا ایک فن ہے۔ تو کھانا پکانے کے سلسلہ میں بے شمار کتابیں دکانوں پر آپ کو ملیں گی۔ اردو میں: فلاں دسترخوان، فلاں

دستر خوان۔ گجراتی میں بھی ملتی ہیں؛ لیکن اب کوئی آدمی صرف ان کتابوں کو پڑھے، کسی باورچی کی صحبت اس نے اختیار نہیں کی، وہ صرف کتابیں دیکھتا ہے، ان کتابوں میں بریانی کا طریقہ بھی لکھا ہے، قورمہ کا طریقہ بھی لکھا ہوا ہے، قورمہ بنائے گا تو قورمہ تو بننے والا ہی نہیں ہے، پتہ نہیں کیا بن جائے گا؟ جب تک کسی باورچی کی صحبت اختیار نہیں کرے گا، وہاں تک پکا نہیں سکتا۔

کپڑے سینے (Tailoring) کے فن کے سلسلہ میں بھی آپ کو دکانوں پر بہت ساری کتابیں ملیں گی، کوئی آدمی محض ان کتابوں کو پڑھ کر درزی بننا چاہے، تو کپڑا تو کیا سیے گا کاج بنانا بھی نہیں آئے گا۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ درزی کی صحبت اختیار کرے، گویا دنیا کے علوم وفنون بھی خالی کتابیں پڑھنے سے نہیں آتے؛ بلکہ جو ان فنون کے جاننے والے ہیں، ماہر ہیں، ان کی صحبت اختیار کرو، اور ان کی تربیت میں رہو گے، تب یہ چیزیں آئیں گی۔ اس کے بعد کتابیں پڑھو گے تو وہ کتابیں آپ کو فائدہ پہنچائیں گی، ورنہ خالی کتابوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ خالی قرآن پڑھ کر کوئی آدمی ہدایت کے راستہ پر چلنا چاہے تو ناممکن ہے۔ پیغمبروں کی ہدایت کے بغیر یہ ہدایت کا راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔

جو لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہماری ہدایت کے لیے تو قرآن کافی ہے، قرآن کے ترجمے ہو گئے ہیں، تفسیریں ہو گئی ہیں، ہم خود ہی ان تراجم وتفاسیر سے قرآن سمجھ کر اس کے مطابق عمل کر کے ہدایت کا راستہ پالیں گے، وہ نہیں پا سکتے۔ یہی طریقہ ہے کہ جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے، جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے ان کی صحبت اختیار کرو۔ اسی لیے کہا گیا صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا۔ اور وہ کون لوگ ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں دوسری جگہ وہ چار جماعتیں بتلائی ہیں۔

مثبت ومنفی:

دیکھو! ہدایت کے راستے کو اللہ تعالیٰ نے دونوں حیثیتوں سے محدود کر دیا:

(۱) مثبت حیثیت سے: ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔

(۲) منفی حیثیت سے: وَ لَا الضَّآلِّیْنَ نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا، اور نہ ان کا راستہ جو بھٹکے ہوئے ہیں۔

نیک صحبت اختیار کرو اور غلط صحبت سے اپنے آپ کو دور رکھو، تب ہی ہدایت کا راستہ پا سکتے ہو۔ ورنہ تو ہدایت کا راستہ ملنے والا نہیں ہے۔

مغضوب علیھم کون؟

اب الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ کہا گیا ہے کہ جن پر غضب ہوا وہ کون ہیں؟ اُس زمانے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہود کی طرف اشارہ کر کے بالتعیین بتلایا۔ ترمذی شریف میں حضرت عدی بن حاتمؓ کی روایت میں وارد ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو بتلایا تھا کہ جن پر غضب نازل ہوا وہ یہود ہیں۔[۱] علما فرماتے ہیں کہ ان کے سامنے حق آیا، لیکن انہوں نے اس کو اختیار نہیں کیا، سب یہودی جانتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی اللہ کے واقعی آخری پیغمبر ہیں، جن کے متعلق اگلی کتابوں میں بشارت آئی ہے؛ لیکن انہوں نے اس کو مانا نہیں، کیوں؟ حسد کی وجہ سے۔

---

(۱) أخرجه الترمذي: ۲۹۵۴ (ط: مصطفیٰ البابي الحلبي، مصر).

یہود بے بہبود:

حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کے دو بیٹے تھے: حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ۔ اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے۔ ان ہی کا دوسرا نام اسرائیل تھا، ان کے بارہ بیٹے تھے اور ان بارہ بیٹوں سے جو اولادیں چلیں وہ بنو اسرائیل کہلائیں، یہی لوگ یہود کہلاتے ہیں۔ پھر جتنے بھی انبیاء حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ تک آئے وہ سب کے سب بنو اسرائیل میں سے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اگلی ساری کتابوں (توریت، زبور، انجیل) میں نبی آخر الزمان کو بھیجنے کی بشارت دی اور نشانیاں بتائیں۔ ان میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ وہ بنو اسماعیل سے ہوں گے۔ ان کی دوسری ساری علامتیں بتلائیں تو اب تک سارے انبیاء یہود کے خاندان میں آئے، جس کی وجہ سے ان کو یہ گھمنڈ تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ آخری نبی بھی ہمارے اندر ہی آئیں گے، لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں پیدا کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی آخر الزمان بنایا گیا تو جاننے کے باوجود کہ یہ نبی ہیں، نہیں مانا۔

بہت سی مرتبہ جاننے کے باوجود عمل نہ کرنا، اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ اس معنیٰ کر کے ان کو مغضوب علیھم کہا گیا، کہ ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ اور عیسائی راہِ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں، ان کو گمراہ کہا گیا ہے۔ لہٰذا نہ اُن لوگوں کا راستہ جن پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا غضب نازل ہوا، اور نہ ان لوگوں کا جو صحیح راستہ سے بھٹک گئے۔ بلکہ ان لوگوں کا راستہ بتا جن پر اللہ کا انعام ہوا، اور وہ جماعتیں بھی اللہ نے متعین کر کے بتلا دی ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی تعیین کر دی۔ اب بندے بآسانی اس پر چل سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے لیے صراطِ مستقیم پر چلنا آسان فرمائے۔

آمین؛ امت محمدیہ کی خصوصیت:

جب اس کو پڑھیں تو آمین کہیں، آمین کا معنیٰ ہے اے اللہ! ہماری دعا قبول فرما، استجب دعوتنا یہ آمین بھی حضور ﷺ نے اس امت کی خصوصیت بتلائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر جو چیزیں امت محمدیہ کو عطا فرمائیں ان میں سے ایک آمین بھی ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہود اس پر بھی تم پر حسد کرتے ہیں کہ ان کو یہ چیز کیوں ملی؟

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۂ فلق

(قسط-۱)

(مؤرخہ ۲۲/ جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۰/ مارچ ۲۰۱۸ء شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطن الرجيم ○ بسم الله الرحمن الرحيم ○

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ﴿۱﴾ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾ وَ مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ وَ مِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ﴿۴﴾ وَ مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾.

بسم الله الرحمن الرحيم. قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ﴿۳﴾ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۙ۬ الۡخَنَّاسِ ﴿۴﴾ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّةِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾.

معوِّذتین:

یہ قرآن پاک کی آخری دو سورتیں ہیں، سورۂ فلق اور سورۂ ناس۔ ان کو معوِّذتین

بھی کہتے ہیں۔

معوِّذتین، واو کی تشدید اور واو کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے گا یعنی آدمی کو اللہ کی پناہ دلانے والی، ان کو پڑھے گا، تو اللہ تعالیٰ آدمی کو اپنی پناہ میں لے لیتے ہیں۔ معوَّذ، وہ جس کو پناہ دی جاتی ہے، تو عام طور پر اردو میں معوَّذتین بولتے ہیں اس طرح نہیں پڑھیں گے؛ بلکہ معوِّذتین، واو کے زیر کے ساتھ یہ صحیح قرار دیا گیا ہے۔

بینک میں جمع کرنے کی ضرورت نہیں:

یہ دو سورتیں ایک خاص نسبت سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے نازل فرمائیں۔ اس سے قبل ایک چیز بنیادی طور پر بتلا دوں کہ قرآن شریف میں کئی سورتیں اور کئی آیتیں ایسی ہیں جو کسی خاص واقعہ کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نازل فرمائیں۔ مشرکین، یہود یا مسلمانوں کی طرف سے کوئی سوال کیا گیا، اور اُس سوال کے جواب کے طور پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک آیت، چند آیتیں یا کوئی سورت نازل فرمائی۔

جیسے: (۱) حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ثعلبہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا (ابھی زکوٰۃ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا) کہ ہمارے کچھ غلام اور متعلقین ہیں، ہم ان پر کیا خرچ کریں؟ تو آیت نازل ہوئی: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ.(البقرۃ:۲۱۹) (اے نبی! یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کے راستہ میں کیا خرچ کریں؟ تو آپ جواب دے دیجیے کہ جو مال تمہارے پاس بچے وہ خرچ کردو) تمہاری ضرورت تم نے پوری کرلی، جو بچا، اس کو بینک میں جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کو خرچ کردو۔ زکوٰۃ سے پہلے یہ حکم نازل ہوا تھا۔[۱]

(۱) تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۱۹۔

(۲) بخاری شریف میں روایت ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کی بنجر زمین - خرابہ - سے گزر رہے تھے، میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھا، وہاں کچھ یہودی بیٹھے ہوئے تھے، آپ کا گزر اُن کے پاس سے ہوا، وہ نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے کہ ان سے سوال کریں؟ یہودیوں کی عادت تھی، وہ شرارت کرتے رہتے تھے، نبیٔ کریم ﷺ کو چھیڑتے رہتے تھے، اور سوالات کرتے تھے، اور ان کا مقصد یہ ہوتا کہ ہم ایسا سوال کریں جس کا یہ جواب نہ دے سکیں؛ تا کہ ہمیں یہ کہنے کا موقع ملے کہ اگر یہ اللہ کے سچے نبی ہوتے، تو ہمارے سوال کا جواب دیتے۔

چناں چہ حضور ﷺ کو دیکھ کر ان کو شرارت سوجھی، ایک نے کہا: روح سے متعلق سوال کیجیے، پھر دوسرے نے کہا: بھئی! تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ اللہ کے سچے نبی ہیں تم پوچھوگے تو وہ جواب دیں گے!!! کوئی ایسی بات نہیں کہیں گے جو تمہیں ناگوار ہو، کاہے کو پوچھتے ہو؟ تم جس مقصد کے لیے پوچھنا چاہتے ہو تمہارا وہ مقصد تو حاصل ہونے والا نہیں ہے، پھر بھی بعض نے کہا: نہیں! ہم ضرور پوچھیں گے، چناں چہ انہوں نے روح کے متعلق سوال کیا۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ: حضور ﷺ کے ہاتھ مبارک میں کھجور کی ایک ٹہنی تھی، جس سے ٹیک لگاتے ہوئے آپ چل رہے تھے، جیسے عصا سے ٹیک لگایا جاتا ہے۔ جب ان لوگوں نے سوال کیا تو آپ ﷺ کھڑے ہو گئے، اور اُن کو کوئی جواب نہیں دیا، میں سمجھ گیا کہ آپ ﷺ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا، اور میں اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ وحی نازل ہوتے وقت نبی کریم ﷺ کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ آپ کا چہرۂ انور سرخ ہو جاتا، اور سخت سردی میں بھی آپ کی پیشانی مبارک سے پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح لڑھکتے تھے، خراٹوں کی سی آواز آتی تھی، چناں چہ یہ کیفیت شروع ہوگئی۔ وہ کیفیت جب ختم ہوئی تو

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وحی کے نزول کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ پس جب وحی نازل ہو گئی، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیت پڑھی: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا. (الاسراء:۸۵)[۱]

مفسرین کی اصطلاح میں اس واقعہ (یہودیوں کے سوال کرنے) کو ان آیات کا شانِ نزول اور سببِ نزول کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہودیوں کے سوال کے جواب کے طور پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

شانِ نزول:

کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی واقعہ پیش آیا اور اس سلسلہ میں لوگوں کو ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی، تو اس پر آیتیں نازل ہوئیں، تو وہ واقعہ ان آیات کا شانِ نزول، سببِ نزول ہوا۔ یعنی ان آیات کے اترنے کا سبب یہ واقعہ بنا (لیکن وہ حکم، ہدایت اور وہ تعلیم قیامت تک کے لیے ہوگی، مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے) تو یہ شانِ نزول ایک خاص اصطلاحی لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت یا اس سورت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے جانے کا سبب یہ ہوا۔ تو جب بھی درس کے دوران یوں کہیں گے کہ اس کا شانِ نزول یا سببِ نزول یہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس آیت یا سورت کو نازل فرمایا۔

بوقتِ ہجرت مدینہ منورہ میں آباد اقوام:

ان دونوں سورتوں کا بھی ایک شانِ نزول ہے۔ مکہ میں یہودی نہیں تھے، وہاں

(۱) صحیح البخاري: ۱۲۵ و ۴۷۲۱ و ۷۲۹۷ و ۷۴۵۶ و ۷۴۶۲.

قریش ہی قریش تھے، عرب ہی عرب تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ آئے تو مدینہ منورہ میں دو قومیں آباد تھیں: (۱) عرب، جن کا مذہب بت پرستی تھا۔ اور ان کے دو قبیلے تھے: اوس اور خزرج۔ (۲) اور یہودی، یہ اہل کتاب بھی کہے جاتے تھے، یعنی وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے پہلے آسمانی کتاب دی گئی ہو۔ چوں کہ یہودی حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان لاتے ہیں، اور حضرت موسیٰؑ پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے توریت نازل فرمائی، لہٰذا حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والی اس قوم کو اہل کتاب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر اللہ تعالیٰ نے انجیل نازل فرمائی اور حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان لانے والے عیسائی کہلاتے ہیں، ان کو بھی اہل کتاب کہا جاتا ہے۔ چناں چہ وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے ان کے نبی کے واسطہ سے کتاب دی گئی، وہ اہل کتاب کہے جاتے ہیں۔ جیسے ہمیں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطہ سے قرآن پاک عطا فرمایا۔ تو یہ دو قومیں یہود اور نصاریٰ، اہل کتاب کہلاتی ہیں۔

چناں چہ یہود مدینہ منورہ میں ان عربوں کے ساتھ آباد تھے، یہودی چوں کہ اہل کتاب ہیں، ان کے نبی پر اللہ کی طرف سے عطا کردہ کتاب ان کے پاس تھی۔ اور اس کے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ تھا، مدرسے تھے، وہاں توریت پڑھائی جاتی تھی، اور پڑھانے والے بڑے بڑے علماء تھے، جیسے آج کل ہمارے مدارس اور ان میں پڑھنے والے طلبہ اور علماء ہیں، اس زمانے میں یہودیوں کے مدارس تھے۔ آج بھی ہیں۔

جب یہود میں زنا کا قصہ ہوا:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد یہودیوں میں ایک

قصہ ہوا کہ ایک مرد نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا۔ (یہود کے یہاں زنا کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا (پتھر مار کر ختم کر دینا) تھی۔ ہر زنا کی سزا، چاہے وہ زنا کرنے والے شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ **اسلام میں زنا کرنے والے اگر غیر شادی شدہ اور آزاد ہیں تو ان کی سزا ۱۰۰ ر کوڑے ہیں، غلام ہیں تو ۵۰ ر کوڑے۔ اور شادی شدہ ہیں اور آزاد ہیں تو ان کی سزا رجم (یعنی پتھر مار کر ختم کر دینا) ہے۔** بہر حال! یہودیوں کے سماج میں یہ زنا کا قصہ پیش آیا، تو ان یہودیوں نے سوچا کہ یہ نئے نبی آئے ہیں، ان کی شریعت بہت آسان ہے، اس میں بڑی سہولتیں ہیں، آج ہم اپنے آدمیوں کا فیصلہ ان کے پاس کرائیں۔

اس موقع پر علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: ان کی بے وقوفی دیکھو! دین میں داخل ہوئے بغیر اس دین کی جو فیسیلیٹی ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ارے بھائی! پہلے ایمان تو لاؤ، مسلمان تو بنو، پھر اس دین کی سہولتوں سے فائدہ اٹھاؤ! مسلمان تو بنتے نہیں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو!

خیر! وہ آئے، اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا کہ ان دو مرد اور عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، آپ ان کا فیصلہ کر دیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ جو فیصلہ کریں گے وہ بہت آسان ہوگا، سہولت والا ہوگا۔ تو حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے یہاں اگر کوئی زنا کرے تو اس کی سزا کیا ہوتی ہے؟ تمہاری کتاب میں کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا: ہمارے یہاں تو کوئی زنا کرتا ہے تو اس کو سواری پر الٹا بٹھاتے ہیں، منہ کالا کرتے ہیں، اور اس کا ڈھنڈورا پٹوا دیتے ہیں۔ گویا ایک طرح کی اس کی فضیحت (بدنامی) کروا دیا، یہ سزا ہوگئی۔ انہوں نے یہ کہا تو حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری کتاب توریت میں سنگساری اور رجم کا حکم نہیں ہے؟ تو انہوں نے کہا: نہیں ہے۔ ان کا عالم ابن صوریا تھا، وہ

وہاں کے مدرسہ میں بڑا مدرس تھا، وہ ساتھ آیا تھا، اس نے کہا: ہماری کتاب میں یہ نہیں ہے۔

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے:

اس مجلس میں حضرت عبد اللہ بن سلامؓ جو پہلے یہودی تھے اور یہود کے بہت بڑے عالم تھے، توریت سے واقف تھے، موجود تھے۔ انہوں نے کہا: کیا توریت میں آیت رجم نہیں ہے؟ لاؤ! توریت لاؤ! فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (توریت لاؤ! اور اس کی تلاوت کرو، اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو) (آل عمران: ۹۳) تو وہ توریت لائے، اور جو اُن کا عالم تھا، وہی پڑھتا تھا، اس نے آیت رجم پر اپنی ہتھیلی رکھ دی، اور اوپر نیچے کا پڑھنے لگا۔ تو حضرت عبد اللہ بن سلامؓ جو ایمان لا چکے تھے، انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹایا کہ یہ پڑھو۔ چناں چہ ہاتھ کے نیچے آیت رجم نکلی، سنگساری کا حکم تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب رجم کا حکم ہے، تو کرو رجم!!! وہ سوچ کر آئے تھے کہ کچھ آسان فیصلہ ہوگا، انہوں نے سوچا کہ کیا سوچ کر گئے تھے اور کیا ہو گیا! الٹا ہم اپنے یہاں رکھتے تو وہ اپنا کالے منہ والا فیصلہ ہو جاتا۔ حالاں کہ انہوں نے توریت کے حکم میں تحریف اور ردو بدل کر دیا تھا، اور کالا منہ کرنا ان کی شریعت کا حکم نہیں تھا۔ چناں چہ انہوں نے یوں سوچا کہ اگر ہم یہی ردو بدل والا کرتے تو فائدہ میں رہتے، یہ تو مار کھانی پڑی۔ چناں چہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی کے پڑوس میں جہاں جنازے پڑھے جاتے تھے وہاں ان دونوں کو رجم کیا گیا۔[۱] خیر! میں نے تو یہ قصہ اس لیے بیان کیا تھا کہ ان کے یہاں بھی مدرسے تھے، علما تھے۔

---

(۱) صحيح البخاري: ۱۳۲۹ و ۳۶۳۵ و ۴۵۵۶ و ۶۸۱۹ و ۶۸۴۱ و ۷۳۳۲ و ۷۵۴۳.

یہود کو حضور کی رسالت کا یقین تھا:

حاصل یہ ہے کہ یہود نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔ حضور ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے، تو عرب میں اوس وخزرج ہی ایمان لائے تھے، اور آپ ﷺ نے ان یہودیوں کے ساتھ صلح کا معاملہ کیا کہ ہم آپس میں امن وامان کے ساتھ رہیں گے، آپس میں لڑیں گے نہیں، اور کسی کے دشمن کے مقابلہ میں اس دشمن کی مدد نہیں کریں گے۔ یہ طے ہوا تھا، یہودیوں نے صلح تو کی تھی؛ لیکن اندرونی طور پر وہ مسلمانوں کو اور نبیٔ کریم ﷺ کو تکلیف پہنچانے کا کام کرتے رہتے تھے۔ اور اس سے قبل یہ بات گزر چکی کہ یہود بالیقین جانتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں، جس نبی کو اللہ تعالیٰ نبیٔ آخر الزمان، خاتم النبیین بنا کر بھیجنے والے تھے وہ یہی ہیں، ان کی توریت میں باقاعدہ اس کی بشارت سنائی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نبی آخر الزمان کو بھیجیں گے، ان کی یہ یہ نشانیاں ہوں گی، وہ ساری نشانیاں جو اپنی کتاب میں تھیں اس کے مطابق وہ لوگ دیکھ رہے تھے، اور اس کی وجہ سے ان کو اس بات کا یقین تھا۔

یعرفونه کما یعرفون أبناءهم:

چناں چہ روایتوں میں آتا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کا پہلا قیام قباء میں رہا، قباء میں آپ ﷺ ۱۴ یا ۲۴ روز تک ٹھہرے۔[۱]

---

(۱) قال أنس رضي الله عنه: ...... فأقام النبي صلى الله عليه وآله وسلم فيهم أربع عشرة ليلة. (صحيح البخارى: ۴۲۸) قال العيني: و هذه رواية الأكثرين و كذا فى رواية أبي داود عن شيخه مسدد و فى رواية المستملى و الحموي "أربعا و عشرين ليلة" و عن الزهري "أقام فيهم بضع عشرة ليلة" وعن عويمر بن ساعدة "لبث فيهم ثماني عشرة ليلة ثم خرج" اھ. (عمدة القاري: ۴/ ۲۵۹ ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

اسی زمانہ میں قبیلۂ بنونضیر کا ایک سردار حُی بن اخطب، جو ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کا باپ تھا؛ عالم اور بڑے دبدبہ والا بھی تھا، تو وہ فوراً اپنے بھائی ابو یاسر بن اخطب کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے اور دیکھنے کے کے لیے - کہ یہ وہی نبی ہیں - قبا گیا اور رات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گزاری۔ صبح جب گھر آیا تو اس کے بھائی کے ساتھ بات چیت ہوئی، تو بھائی نے پوچھا: یہ وہی ہیں؟ وہی یعنی آخری نبی جن کی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیشین گوئی دی ہے؟ تو اس نے کہا: واللہ! یہ وہی ہیں۔ تو بھائی نے کہا: أتعرفه و تثبته (کیا تو اس کو جانتا اور اس کو تسلیم کرتا ہے؟) تو حی بن اخطب نے کہا: جی ہاں! پھر بھائی نے پوچھا: تیرے دل میں اس کے باب میں کیا بات ہے؟ تو حی بن اخطب نے کہا: بخدا! تادم حیات اس سے دشمنی رکھوں گا، پس وہ ایمان نہیں لایا۔[۱] دیکھو! یہ گفتگو دو بھائیوں کے درمیان گھر میں ہوئی تھی، اس کو سننے والی حضرت صفیہؓ تھیں، انہوں نے بعد میں بتایا تھا۔ بہر حال! وہ یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ اللہ کے سچے نبی ہیں، قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ.(سورة البقرة:۱۴۶) (اے نبی! یہ لوگ آپ کی نبوت کو اور آپ کے نبی ہونے کو ایسا جانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو جانتے ہیں) ایک باپ اپنے بیٹے کا بیٹا ہونا یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ یہ یقینی طور پر میرا بیٹا ہے اسی طرح یہ لوگ بالیقین جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

---

(۱) الروض الأُنف(۴/ ۳۱۱، ط: دارإحياء التراث العربي ، بيروت)و إحياء علوم الدين (۳/ ۱۹۰)(ط: دارالمعرفة بيروت) قال العراقي: رواه ابن اسحاق في السيرة قال: حدثني عبدالله بن أبي بكر بن محمد بن عمرو بن حزم قال: حدثت صفية فذكره نحوه وهو منقطع أيضا (أي بين عبدالله بن أبي بكر و صفية رضي الله عنهم) (تخريج أحاديث إحياء علوم الدين: ۴/ ۱۸۴۳)(ط: دار العاصمة للنشر، الرياض).

اس سے بھی زیادہ:

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے آیت کریمہ: **يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ** کے متعلق پوچھا کہ یہ لوگ حضور ﷺ کا نبی ہونا ایسا جانتے ہیں، جیسا اپنے بیٹوں کا بیٹا ہونا جانتے ہیں۔ تو حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: میں ان کو اپنی اولاد سے زیادہ جانتا ہوں، حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیوں؟ تو انہوں نے کہا: ایک باپ اپنے بیٹے کا بیٹا ہونا اس لیے جانتا ہے کہ یہ میری بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے؛ لیکن ممکن ہے کہ اس کی بیوی نے خیانت کی ہو، اور کسی دوسرے سے تعلق قائم کیا ہو، اور اس کا نطفہ قرار پا گیا ہو، اور اس سے بیٹا پیدا ہوا ہو، یہ تو محض اپنا بیٹا ہونے کو جانتا ہے؛ اندر کی بات اس کو معلوم نہیں۔ **تو حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ بیٹے کے بیٹا ہونے کے یقین میں تو گڑبڑ ہوسکتی ہے؛ لیکن ان کے اللہ کا رسول ہونے میں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔** حضرت عمرؓ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔[1] یہودی حضور ﷺ کا نبی ہونا بالیقین جانتے تھے۔

یہ ہم میں سے نہیں:

یہودی ایمان نہیں لائے۔ کیوں نہیں لائے؟ حسد کی وجہ سے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے توریت، انجیل، اگلی آسمانی کتابوں اور دوسرے صحیفوں میں بھی نبی کریم ﷺ کے آنے کی خبر تو دی تھی، نشانیاں بھی بتلائی تھیں؛ لیکن یہ نہیں بتلایا تھا کہ وہ کون سے خاندان میں آئیں گے؟ آنے والے ہیں اور آئیں گے، یہ بات تم لوگوں کو بتاؤ، اور آئیں تو ان پر

(۱) الكشاف للزمخشري و مفاتيح الغيب للرازي، سورة البقرة: ۱۴۶.

ایمان لانا، اللہ نے پہلے تمام نبیوں سے عہد لیا کہ اگر تمہاری زندگی میں وہ آخری نبی آئیں تو تم ان پر ایمان لاؤ گے۔قرآن میں اس عہد کا تذکرہ ہے۔لیکن یہ یہود سمجھتے رہے کہ آخری نبی ہمارے اندر ہی آئیں گے۔

اس سے قبل گزر چکا کہ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے: (۱) حضرت اسحاق (۲) حضرت اسماعیلؑ۔حضرت اسحاق کے ایک بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے۔حضرت یعقوب ہی کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔اور انہیں کے بارہ بیٹے تھے۔ان کی نسل میں جو لوگ پیدا ہوئے وہ سب یہودی کہلائے۔تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ کے بعد جتنے بھی نبی آئے وہ سب حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں آئے، اور سب بنو اسرائیل کہلائے۔حضرت عیسیٰ بھی بنو اسرائیل میں سے ہیں۔لیکن آخری نبی کو اللہ نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں بھیجا۔وہ سب کے اوپر بھاری ہو گئے۔چناں چہ یہودی یوں سمجھتے تھے کہ اب تک جیسے نبی بنو اسرائیل میں سے آئے تو آخری نبی بھی بنو اسرائیل ہی میں سے آئیں گے؛ لیکن انہوں نے جب دیکھا کہ بنو اسماعیل میں سے آئے، عربوں میں آئے، تو ان کو حسد ہو گیا کہ ہم میں کیوں نہیں آئے؟ **آج دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یوں سمجھتے ہیں کہ خوبی، کمال ہمارے ہی اندر ہونا چاہیے، دوسروں میں وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔یہ یہی یہودیوں والی فطرت** ہے۔تو یہ یہودی اسی لیے ایمان نہیں لائے کہ یہ آخری نبی اسماعیل کی اولاد میں کیوں آئے؟ بنو اسرائیل میں کیوں نہیں آئے؟ بلکہ ان کو اس معاملہ میں اتنی شدت ہے کہ حضرت جبرئیلؑ سے بھی یہ لوگ دشمنی رکھتے ہیں کہ یہ وحی ان کے پاس لے کر کیوں آئے؟ حضرت جبرئیلؑ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اپنی مرضی سے آئے تھے؟ اللہ کے حکم سے لائے؛ لیکن وہ یوں کہتے ہیں انہوں نے دوسرے کو بھیج دی۔جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں۔

جانتے ہیں، مانتے نہیں:

حاصل یہ ہے کہ یہودیوں کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ بڑی دشمنی تھی۔ حالاں کہ شروع میں جب حضور ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو بہت سے احکام میں حضور ﷺ ان کی موافقت کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی صریح حکم نازل نہ ہوا ہو، تو حضور ﷺ یہودیوں کی موافقت کو پسند کرتے تھے، تاکہ ان کی دل جوئی ہو، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہوں؛ لیکن جتنی ان کی دل جوئی کی گئی وہ اتنے زیادہ اکڑتے گئے اور ان کی دشمنی اور زیادہ شدت اختیار کرتی گئی۔ یہاں تک کہ بعد میں حکم دیا گیا کہ ان کی مخالفت کرو۔

چناں چہ یہودی حضور ﷺ پر اسی حسد کی وجہ سے کہ آپ بنواسماعیل میں کیوں آئے؟ بنواسرائیل میں کیوں نہیں آئے؟ آپ ﷺ پر ایمان نہیں لائے۔ حالاں کہ ان سب کو یقین تھا کہ یہ آخری نبی، جن کی بشارتیں، علامتیں، نشانیاں بتلائی گئیں وہ یہی ہیں۔ ساری نشانیاں دیکھ رہے ہیں، جان رہے ہیں پھر بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اسی حسد کی وجہ سے وہ حضور ﷺ کو بہت ساری تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ ایسی تکلیفیں پہنچانا ان کا مزاج بن گیا تھا۔ قرآن میں اس کا تذکرہ موجود ہے: وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْۤا اَذًی کَثِیْرًا وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (اٰل عمران: ۱۸۶) (تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی وہ اور جو مشرک ہیں، ان سے تم بہت تکلیف دینے والی باتیں سنو گے؛ لیکن اس وقت تم صبر کرنا) قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے۔

تو یہ یہودی مختلف طریقوں سے تکلیف پہنچاتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سحر:

اسی سلسلہ میں یہ امر پیش آیا کہ ان لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کرایا۔ یہ واقعہ فتح الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب حدیبیہ سے لوٹے، اس کے بعد محرم ۷ھ میں جادو کا واقعہ پیش آیا۔[1] البید بن اعصم نامی ایک شخص تھا، یہ اصل تو انصار کی ایک شاخ بنو زریق سے تعلق رکھتا تھا، لیکن یہ سب حلیف اور دوست تھے، ان کا یہودیوں کے ساتھ دوستانہ عہد اور ایگریمینٹ ہوا تھا۔ تو یہ لبید بن اعصم یہودیوں کا حلیف تھا، اس نے خود اپنی بچیوں اور بیٹیوں کو جادو سکھلا کر خود بھی شریک ہوا اور بیٹیوں کے ذریعہ جادو کرایا۔[2]

جادو کرانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کنگھے سے سر اور داڑھی کو کنگھا کرتے تھے اس کنگھے کے کچھ دندانے، اور کنگھا کرنے کے بعد نکلنے والے کچھ بال استعمال کیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک یہودی لڑکا آیا کرتا تھا، اس کو پھسلا کر اس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بال مبارک اور کنگھے کے کچھ دندانے حاصل کیے، اور اس میں جادو کیا۔ اور کمان کی تانت پر گرہیں لگائیں۔[3]

اس لیے کہ جس پر سحر کیا جاتا ہے اس کے جسم کی کوئی چیز (ناخن، بال وغیرہ) ہونی چاہیے۔ یا کوئی ایسی چیز جو اس کے استعمال میں رہی ہو۔ اس کے بغیر جادو نہیں ہوتا۔

---

(۱) الطبقات الکبریٰ لابن سعد (۱۵۲/۲، ط: دار الکتب العلمیة، بیروت) و فتح الباري لابن حجر (۲۲۶/۱۰، دار المعرفة، بیروت).

(۲) قال ابن سعد : قال إسحاق بن عبد الله : فأخبرت عبد الرحمٰن بن کعب بن مالك بهذا الحديث فقال: إنما سحره بنات أعصم أخوات لبيد وكن أسحر من لبيد وأخبث إلخ . . . . . (الطبقات الکبریٰ: ۱۵۲/۲).

(۳) الطبقات الکبریٰ لابن سعد (۱۵۲/۲، ط: دار الکتب العلمیة، بیروت) و فتح الباري لابن حجر (۲۲۶/۱۰، دار المعرفة، بیروت).

جادو میں کچھ ایسے کلمات پڑھے جاتے ہیں جن کے ذریعہ شیاطین کو خوش کیا جاتا ہے، ان کلمات کو سن کر وہ خوش ہوتے ہیں، اور ان کو جو کہا جائے وہ کرتے ہیں۔ یعنی جادوگر ان کلمات کو بول کر کے ان کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔ ہر سال وہ اس کی تجدید کرتے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ پڑھیں گے تو یہ کلمات سن کر وہ شیطان ایسا مطیع اور فرماں بردار بن جاتا ہے، کہ اس سے کہا جائے کہ اس کو نقصان پہنچاؤ، تو برابر اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ ہم تو ساری دنیا کے احسانات برداشت کر کے بھی اللہ کی اتنی فرماں برداری نہیں کرتے جتنا یہ شیطان اپنے خوشامدی کی کرتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس تانت کے اوپر پڑھ پڑھ کر گیارہ گرہیں لگائی گئیں، پھر اس تانت میں وہ بال اور کنگھے کے دندانے رکھے گئے۔

اور بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور ﷺ کا موم کا ایک چھوٹا سا پتلا بنایا، اس میں چھوٹی چھوٹی گیارہ گرہیں لگائیں۔[1] بہرحال! جادو کا عمل تیار تھا، اس کو نر کھجور کے شگوفہ کے کوَر میں بند کر کے بنو زریق کے ایک کنویں میں ایک بڑے پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس کنویں کا نام بئر ذی اروان تھا۔

جادو کا اثر، ذاتِ رسالت پر:

اس سحر کا اثر یہ ہوتا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے کوئی کام نہیں کیا ہے اور آپ ﷺ یوں سمجھتے تھے کہ وہ کام کیا ہے۔ چناں چہ بخاری شریف میں ہے: كان يرىٰ أنه يأتي النساء ولا يأتيهن.[2] دراصل یہ جادو بیویوں کے ساتھ تعلق کے معاملہ میں کیا گیا تھا کہ آپ ﷺ نے بیویوں کے ساتھ صحبت نہیں کی؛ لیکن اس جادو کے اثر کی وجہ سے یوں سمجھتے تھے کہ

---

(۱) بحر العلوم للسمرقندي (۳/۶۳۷، ط: دار الفكر، بيروت).

(۲) صحيح البخاري: ۵۷۶۵.

صحبت کی۔ بس! یہ تھا وہ اثر۔ چھ مہینے تک یہ اثر رہا۔[۱] اور اس جادو کے نتیجہ میں آپ ﷺ اپنے آپ کو ایسا محسوس کرتے تھے کہ میں بندھا ہوا ہوں۔ آپ ﷺ کو بہت تکلیف ہوتی تھی، اس جادو کا اور کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کے فرضِ منصبی (آنے والے احکام اور وحی کو دوسرے بندوں تک پہنچانے) میں اس جادو کا کوئی اثر نہیں تھا۔

کوئی بڑے سے بڑا جادوگر بھی کسی نبی پر ایسا جادو نہیں کرسکتا، جس کے اثر سے وہ اپنے فرضِ منصبی اور اپنی ڈیوٹی کی ادائیگی میں کوتاہی کرے، یہ ناممکن ہے۔ تو اس جادو کی وجہ سے آپ ﷺ کی فیملی زندگی پر اثر ہوا۔ اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ ایک گھٹن اور تکلیف محسوس کرتے تھے۔

جادو کا توڑ؛ دعا کی طاقت:

بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ میرے یہاں رات کو تشریف لائے، میری باری کا دن تھا؛ لیکن حضور ﷺ دعا میں مشغول رہے۔ دعا و دعا اور مسلم شریف میں تین مرتبہ آیا ہے۔[۲] یعنی خوب دعا کی۔

اس تین مرتبہ لفظِ دعا پر حضرت شیخ زکریاؒ نے بڑی اچھی بات لکھی، فرماتے ہیں:

---

(۱) أخرجه الإمام أحمد في مسنده: ۲۳۸۲۶ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت) وقال الحافظ ابن حجر: وقع في رواية أبي ضمرة عند الإسماعيلي فأقام أربعين ليلة، وفي رواية وهيب عن هشام عند أحمد: ستة أشهر، ويمكن الجمع بأن تكون الستة أشهر من ابتداء تغير مزاجه والأربعين يوماً من استحكامه. (فتح الباري: ۱۳/ ۲۰۶، ط: دار طيبة، الرياض) وقال السهيلي لم أقف في شيئ من الأحاديث المشهورة على قدر المدة التي مكث النبي ﷺ فيها في السحر حتى ظفرت به في جامع معمر عن الزهري أنه لبث ستة أشهر كذا قال وقد وجدناه موصولاً بالإسناد الصحيح فهو المعتمد. (الروض الأُنف: ۴/ ۲۰۰-۲۰۱، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت، ت: السلامي)

(۲) صحيح مسلم: ۲۱۸۹.

سحر کے اثر کو دور کرنے لے لیے سب سے مؤثر چیز دعا ہے۔ رو رو کر اللہ سے مانگو، تو اللہ تعالیٰ اس کا راستہ نکالیں گے۔[۱]

پھر خواب میں دو آدمی آئے، وہ دو فرشتے تھے، ایک حضرت جبرئیلؑ، وہ سر کے پاس بیٹھے۔ اور دوسرے حضرت میکائیلؑ، پاؤں کے پاس بیٹھے۔ اب حضرت جبرئیلؑ حضرت میکائیلؑ سے پوچھ رہے ہیں کہ ان کو کیا ہوگیا؟ تو حضرت میکائیلؑ نے جواب دیا: ان پر جادو کیا گیا ہے۔ انھوں نے پوچھا: کس نے جادو کیا؟ تو جواب میں کہا: لبید بن اعصم نے۔ کس چیز میں جادو کیا؟ تو کہا: کنگھے اور اس سے نکلے ہوئے بالوں میں۔ وہ کہاں رکھا؟ تو کہا: نر کھجور کے شگوفے میں۔ اس کو کہاں دفن کیا؟ کہا: ذی اروان نامی کنویں میں پتھر کے نیچے۔ یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں بتلایا گیا۔

اللہ نے حل بتلا دیا:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدار ہوئے، تو مجھ سے کہا: عائشہ! میں نے اللہ تعالیٰ سے جو چیز پوچھی تھی، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا حل بتلا دیا ہے۔ یعنی وہی دعا کی تھی کہ مجھے کیا تکلیف ہے؟ تو خواب میں بتلا دیا کہ یہ جادو ہے، جو آپ پر کیا گیا ہے۔[۲] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مخصوص صحابہ حضرت علیؓ، حضرت عمارؓ، اور دو اور صحابی رضی اللہ عنہم تھے۔[۳] ان کو لے کر گئے اور سب کچھ اندر سے نکالا اور ختم کیا۔ اگر جادو کی ترتیب اور اس کا سیٹنگ ختم کر دیا جائے، تو جادو کا اثر بھی ختم ہوجاتا ہے۔ چناں چہ ترتیب ختم کردی اور اس کو ایک جگہ دفن کر دیا۔

---

(۱) الأبواب والتراجم: ۲/۱۵۱ (ط: دار البشائر الإسلامية، بيروت، لبنان).

(۲) صحيح البخاري: ۵۷۶۴ و ۵۷۶۵.

(۳) جبير بن إياس الزرقي وقيس بن محصن الزرقي (الطبقات الكبرى لابن سعد ۲/ ۱۵۲ و ۱۵۳، ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

احسن إلى من اساء إليك کی عملی تصویر:

حضور ﷺ نے دوسرے مسلمانوں کے سامنے بھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے لوگوں کو کیوں نہیں بتلایا؟ لوگوں کو بتلا دیتے کہ اس آدمی نے یہ حرکت کی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھے اللہ نے شفا دے دی، اب میں نہیں چاہتا کہ کسی آدمی کے خلاف فتنہ بھڑکاؤں۔[1] وہ آدمی منافق تھا۔ اگر آپ ﷺ اظہار کر دیتے، تو صحابہ کو حضور ﷺ کے ساتھ جو محبت تھی حضور ﷺ کے پسینے کے قطرے کی جگہ پر اپنے خون کو بہانے والے، وہ اس آدمی کے تو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے، لہٰذا حضور ﷺ نے کسی کو نہیں بتایا اور اخیر تک پتہ نہیں چلنے دیا۔ **اور وہ منافق آپ ﷺ کی مجلس میں آتا تھا، پھر بھی آپ ﷺ نے اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں فرمائی۔ یہ حضور ﷺ کے اخلاق ہیں، آپ ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ ایسا ہو تو اپنے دشمن کے ساتھ اس طرح معافی کا معاملہ کرو۔** تو آپ ﷺ نے ایسا معاف کیا کہ لوگوں کو بتایا بھی نہیں۔ اور آج کیا ہوتا ہے؟ حالاں کہ آپ ﷺ کو یہ جادو کس نے کیا؟ کس طرح کیا؟ یہ وحی کے ذریعہ بتایا گیا تھا۔ اس لیے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ حضرت جبرئیلؑ اور میکائیلؑ نے اللہ کے حکم سے آ کر بتایا تھا تب بھی آپ نے کسی کو نہیں بتایا کہ کس نے جادو کیا ہے۔

عامل کا کہنا معتبر نہیں:

آج کس نے جادو کیا؟ کوئی بات یقینی نہیں ہے۔ اور آدمی دشمنی نکالنا شروع کر دیتا ہے۔ عامل لوگوں کو بھی چاہیے کہ کسی کو یہ نہ کہیں کہ فلاں نے کیا۔ آپ علاج کر لیجیے۔ لوگ

---

(۱) صحیح البخاري: ۵۷۶۴.

بعض مرتبہ اس چکر میں پڑتے ہیں کہ بتاؤ کس نے کیا؟ کیوں کہ عامل جن چیزوں کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں وہ کوئی وحی نہیں ہے۔ شریعت میں کسی کے خلاف ثبوت کے لیے یہ مسئلہ ہے کہ اولاً وہ آدمی خود اقرار کرے کہ میں نے یہ حرکت کی ہے، یا دو عینی گواہ جنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، اپنے کانوں سے سنا ہو وہ گواہی دیں، تو کسی چیز کا ثبوت ہوسکتا ہے۔ ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا طریقہ کسی چیز کے ثبوت کا نہیں ہے۔ صرف عامل کہہ دے یہ معتبر نہیں۔

ایک سبق:

حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں نقل کیا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے القول الجمیل میں ایک جگہ چور کے معلوم کرنے کا عمل بتلایا ہے۔[۱] تو اس کے نیچے لکھا ہے کہ یہ اس لیے نہیں ہے کہ آپ کسی پر الزام لگاؤ؛ بلکہ اس لیے ہے کہ اس کے ذریعہ آپ اندرونی طور پر تحقیق کر کے چپکے سے اس کو بتا سکتے ہو کہ دیکھو! یہ پتا چلا ہے وہ

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۴/ ۸۶ و ۸۸ والقول الجمیل (مخطوط عربی) ص: ۴۴۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" میں فرماتے ہیں: چور کی پہچان کے لیے دو آدمیوں کو بدھنا تھما دیا جائے جسے وہ اپنے کلمے کی دونوں انگلیوں سے پکڑلیں، مشکوک شخص کا نام کاغذ پر لکھ کر اسے بدھنے میں ڈال دے، "من المکرمین" تک سورۂ یٰسٓ پڑھے، اگر وہی شخص چور ہوگا تو بدھنا گھوم جائے گا، اگر نہ گھومے تو دوسرے آدمی کا نام اس میں ڈال کر پھر یہی عمل دہرایا جائے، اسی طرح تمام مشکوک آدمیوں کا نام ڈالتا جائے اور "من المکرمین" تک پڑھتا جائے، چور کا نام سامنے آجائے گا۔ (القول الجمیل فی بیان سواء السبیل (مترجم) ص:۹۹، ط: تصوف فاؤنڈیشن، لاہور) نیز حضرت فرماتے ہیں: ویجب علی من اطلع علی السارق بامتثال هذه أن لا یجزم بسرقته ولا یشیع فاحشته بل یتبع القرائن فإنما هي طریق اتباع القرائن. قال اللہ تعالیٰ: ولا تقف ما لیس لک به علم. (القول الجمیل (مخطوط عربی) ص: ۴۴)

نوٹ: حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ (۴/ ۸۶ و ۸۸) میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے حوالے سے جو عمل نقل کیا ہے، وہ اُس عمل کے موافق نہیں ہے، جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی کتاب القول الجمیل میں نقل کیا ہے۔ پس یہی کہا جائے گا کہ حضرت تھانویؒ نے یہ عمل شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کسی اور کتاب سے نقل کیا ہے، یا پھر نقل میں خطا ہے۔ المعصوم من عصمه الله. واللہ أعلم۔۔۔

مان لے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ قطعی اور یقینی طور پر اس پر الزام لگانا درست نہیں۔ کیوں کہ یہ کوئی شرعی ثبوت نہیں۔ شرعی ثبوت دو ہی ہیں جس کا ذکر اوپر ہو چکا کہ وہ آدمی خود اقرار کرے یا دو نیک، صالح، عادل مسلمان گواہی دیں تب بات بن سکتی ہے۔

دیکھو! ہم لوگوں کے لیے اس میں بڑا سبق ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ بتایا، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اظہار نہیں کیا، بلکہ اس آدمی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا خاص خیال کیا۔ اور ہم صرف گمانوں کی بنیاد پر کیا کیا کر ڈالتے ہیں!!!

بہر حال! یہ واقعہ پیش آیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریلؑ کے ساتھ یہ دو سورتیں نازل فرمائیں۔ ان میں گیارہ آیتیں ہیں، سورۂ فلق میں پانچ ہیں اور سورۂ ناس میں چھ ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو پڑھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھتے جاتے تھے اور تانت پر جو گیارہ گرہیں لگائی گئی تھیں، وہ کھلتی جاتی تھیں، اور جو موم کا پتلا بنایا گیا تھا اس میں جو سوئیاں چبھوئی گئی تھیں وہ بھی نکلتی جاتی تھیں۔

جب یہ عمل ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بندھا ہوا تھا، اب کھل گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جادو کے لیے یہ عمل نازل فرمایا۔ اگر علاج کے لیے آدمی یقین کے ساتھ اس کو انجام دے، تو اس سے ان شاء اللہ فائدہ ضرور ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل میں ہم لوگوں کے لیے بڑا سبق ہے۔

جادو کا حکم:

اب جادو کا مسئلہ بھی جاننا چاہیے کہ جادو کا کیا حکم ہے؟ دیکھو! جن طریقوں سے جادو کیا جاتا ہے، اس میں آدمی کچھ کلمات پڑھتا ہے، کچھ بول بولتا ہے، جن کے ذریعہ ان

شیاطین کو خوش کیا جاتا ہے، اور ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جس پر جادو کیا جائے اس کو تکلیف پہنچتی ہے، اکثر وہ کفریہ کلمات ہوتے ہیں۔ یعنی اس جملہ کے زبان سے نکالنے کی وجہ سے آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے۔ بسا اوقات کچھ اعمال کرواتے ہیں، بعض مرتبہ تو باقاعدہ بچوں کو اغوا کر لیتے ہیں، قتل کر دیتے ہیں، بعض دیویوں پر ان کی بلی چڑھاتے ہیں، اور اسی طرح قرآن کو نجاست میں ڈالتے ہیں۔ اس کے بغیر جادو سیکھ ہی نہیں سکتے۔ **الحاصل جادو میں ایسے کام یا ایسے کلمات کروائے اور کہلوائے جاتے ہیں کہ نتیجۃً آدمی ان کی وجہ سے ایمان سے نکل جاتا ہے۔ سو یہ ایک خطرناک چیز ہے۔ اگر ایسا کفریہ کام یا کلام نہیں ہے تب بھی وہ حرام ہے۔** اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: تم سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے اپنے آپ کو بچاؤ، اس میں ایک جادو کو بھی ذکر فرمایا ہے۔[1] یہ اعلیٰ درجہ کا حرام ہے۔ اور اسلامی حکومت میں اگر سحر ثابت ہو جائے یا وہ اقرار کر لے، تو اس کے لیے بڑی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

---

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۲۸۵۷ ومسلم برقم: ۱۴۵ وغيرهما.

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورۂ فلق

(قسط-۲)

(مؤرخہ ۲۹/جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۸/مارچ ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۝

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝۴ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵ ۔

یہ سورۂ فلق ہے، گزشتہ مجلس میں سورۂ فلق اور سورۂ ناس (معوّذتین) کا شانِ نزول تفصیل سے بتلایا تھا، اب اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی خاص صفت:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (آپ کہہ دیجیے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ مانگتا ہوں)

فلق رات کے اندھیرے سے صبح کی نمودار ہونے والی روشنی کو کہتے ہیں، جس کو پَو پھٹنا کہتے ہیں۔ رات بھر اندھیرا رہا، صبح اللہ تبارک وتعالیٰ روشنی پھیلا کر رات کے اندھیرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کر دیتے ہیں۔ اور اپنی قدرت سے لوگوں کے قلوب میں امید پیدا کرتے ہیں کہ رات گئی، دن نمودار ہوا، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک خاص صفت ہے کہ وہ رات کے بعد دن کو لاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اسی صفت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ کی پناہ حاصل کی گئی کہ میں صبح کے مالک کی پناہ چاہتا ہوں۔

اللہ ہی کی پناہ حاصل کیجیے:

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (ہر اس چیز کی برائی اور شر سے جو اس نے پیدا کی ہے)

اس دوسرے جملہ میں تمام مخلوقات کی برائی سے پناہ چاہی گئی ہے۔ چوں کہ سب کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی ان میں موجود برائیوں اور ان شرور سے بچا سکتے ہیں، اسی لیے اللہ کی پناہ حاصل کی جاتی ہے۔ جیسے کوئی آدمی کسی کی ملاقات کے لیے جائے اور گھر کے صحن میں خطرناک قسم کا کتا حفاظت کے لیے رکھا گیا ہے، جو ہر آنے والے پر حملہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، تو یہ جانے والا کیا کرے گا؟ اسی مالکِ مکان کو اطلاع کرے گا کہ بھئی! میں آپ کے یہاں آنا چاہتا ہوں؛ مگر آپ کے اس کتے کو قابو میں کیجیے، اس کی طرف سے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے، اس سے میری حفاظت کا بندوبست کیجیے۔ یہ کام مالک ہی کرے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں، ان تمام کے شر سے اگر کوئی ہمیں بچا سکتا ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس لیے اللہ ہی کی پناہ حاصل کرنی چاہیے۔ چناں چہ اس دوسری

آیت میں جن چیزوں سے پناہ حاصل کی جاتی ہے اس میں ابتداءً ایک عام لفظ استعمال کیا یعنی ہر اُس چیز کے شر سے جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی، اس میں تمام مخلوقات شامل ہوگئیں۔

مخلوقات میں عامۃً دونوں حیثیتیں ہوتی ہیں: خیر اور شر۔ اللہ تعالیٰ نے بعض مخلوقات کو چھوڑ کر دنیا کی تمام مخلوقات میں خیر اور شر دونوں کو رکھا ہے۔ فرشتے اور حضرات انبیاء معصوم ہیں۔ اور خیر کے حاصل کرنے اور شر سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آدمی نیا لباس پہنتا ہے تو دعا کرتا ہے: اللّٰهم لك الحمد أنت كسوتنيه إني أسئلك من خيرهٖ و خير ماصُنع له و أعوذبك من شرهٖ و شر ماصنع له.[۱] یا سوار ہو، تو دعا پڑھتا ہے: اللّٰهم إني أسئلك من خيرها و خير ما جبلت عليه.[۲] گویا اس خیر کا سوال کرتا ہوں جس کے لیے یہ پیدا کی گئی ہے، اور اس شر سے حفاظت چاہتا ہوں جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ چناں چہ ہر چیز میں خیر و شر کا پہلو موجود ہے۔ لہٰذا مخلوقات کے شر سے پناہ چاہی گئی ہے اور پناہ دینے والی ذات اللہ ہی کی ہے۔ اس لیے پہلے ہمیں تمام مخلوقات کے شر سے پناہ چاہنے کا حکم دیا گیا۔

تین برائیوں سے پناہ:

اس کے بعد تین برائیاں ایسی ہیں، جن سے خصوصی طور پر پناہ چاہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (اور میں اندھیری رات کے شر سے پناہ چاہتا ہوں جب وہ پھیل جائے)

غاسق اندھیرے کو بھی کہتے ہیں اور اندھیری رات کو بھی۔ رات کا اندھیرا جب چھا

---

(۱) أخرجه أبو داود في سننه: ۴۰۲۰، (ط: المكتبة العصرية، صيدا، بيروت) وغيره.

(۲) أخرجه ابن ماجه في سننه: ۱۹۱۸ (ط: دار احياء الكتب العربية، فيصل عيسى البابي الحلبي) و الحاكم في المستدرك: ۲۸۱۲ (ط: دار الحرمين للطباعة والنشر والتوزيع) و النسائي في الكبرىٰ: ۱۰۰۲۱ (ط: مؤسسة الرسالة).

جاتا ہے، اور ہر چیز پر اس کا اثر آجاتا ہے، اس کے بعد بہت سی چیزوں سے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **جب سورج غروب ہوتا ہے، تو شیاطین اور جنات باہر نکل پڑتے ہیں، اسی لیے حدیث شریف میں اس وقت بچوں کو گھر میں رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔**[۱] کیوں کہ یہ شیاطین اور جنات اس وقت ادھر ادھر منتقل ہوتے ہیں؛ یہ بچے کہیں ان کی زد میں نہ آجاویں۔ جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے، تو شیاطین، جنات، درندے، سانپ، بچھو اور حشرات الارض اپنے بلوں سے باہر آتے ہیں، لہٰذا ان کے شر سے بھی پناہ چاہی گئی ہے۔ اسی طریقہ سے چوری کرنے والے، لوگوں کو نقصان پہنچانے والے بھی اپنا کام رات کو ہی کرتے ہیں۔ ان کے شر سے بھی پناہ چاہی گئی۔ جادو کرنے والے بھی اپنا عمل عام طور پر رات کے اندھیرے میں کرتے ہیں، سو ان سے بھی پناہ چاہی گئی ہے۔ بہر حال! جتنی بھی نقصان پہنچانے والی چیزیں ہیں، ان کے اثرات زیادہ تر رات کے وقت ہوتے ہیں، اس لیے خاص طور پر رات کے شر سے پناہ چاہی گئی ہے۔

حسی اور معنوی اندھیرا:

اندھیرا ایک تو حسی ہوتا ہے اور ایک اندھیرا معنوی ہوتا ہے۔ جیسے: کفر و شرک کا اندھیرا، فسق و فجور کا اندھیرا، معاصی اور گناہوں کا اندھیرا، بداخلاقیوں کا اندھیرا، گمراہیوں کا اندھیرا۔ قرآن کریم میں مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (البقرة:۲۵۷) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہاں یہ حسی اندھیریاں مراد نہیں ہیں؛ بلکہ معنوی اندھیریاں مراد ہیں، کفر و شرک کی گمراہیاں مراد ہیں۔ اور نور سے مراد ایمان کا نور ہے۔ چناں چہ معنوی اندھیریوں سے بھی پناہ چاہی گئی

---

(۱) أخرجه البخاري: ۳۲۸۰ ومسلم: ۲۰۱۲.

ہے۔ یہ چیزیں بھی انسان کو شدید نقصان پہنچاتی ہیں۔ ہم لوگ اس کا تذکرہ تو کرتے ہیں کہ آج کل ماحول بڑا خطرناک ہے، برائیاں پھیلی ہوئی ہیں، اندھیرا ہی اندھیرا ہے؛ لیکن اس سے پناہ چاہنے کے لیے جو تدبیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائی گئی ہے، اس کا جس قدر اہتمام ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا۔ اس سورت کو پڑھتے وقت آدمی اس بات کا بھی تصور کرے۔

روز اول سے انابت کا اہتمام ہو:

وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (اور ان [شخصیتوں اور جانوں] کی برائی سے جو گرہوں پر پھونک مارتی ہیں)

نفَث کا معنیٰ ہے کچھ پڑھ کر کے دم کرنا اس طور پر کہ تھوک کے کچھ ذرات بھی باہر نکلیں۔ جادو کے وقت جادوگر کی طرف سے جو کلمات پڑھے جاتے ہیں، اُن میں شیاطین وغیرہ سے مدد چاہی جاتی ہے، شرکیہ کلمات پڑھ کرتا گوں پر گرہیں لگا کر اس پر دم کرتے ہیں اسی کو نفَث کہتے ہیں۔ تو جادو کے لیے جادوگر عام طور پر یہی ترکیب اختیار کرتے ہیں، لہٰذا ان کے جادو کے شر سے پناہ چاہنا ہے۔

نفّٰثٰت کا ترجمہ بہت سوں نے تو عورتوں سے کیا ہے؛ لیکن صاحب روح المعانی اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ ایسا ترجمہ کیوں نہ کیا جائے جو ہر قسم کے جادوگروں کو (عورتیں ہوں یا مرد) شامل ہو۔ چناں چہ نفّٰثٰت کو نفوس کی صفت قرار دیا گیا، یعنی من شر النفوس النفّٰثٰت یعنی ان جانوں کے شر سے جو گرہوں پر جادو کرنے کے لیے پھونک مارتی ہیں۔[۱] تو جادوگر کے شر سے بھی پناہ چاہی گئی ہے۔ جس آدمی پر جادو کیا جاتا ہے عموماً اس کو پتہ نہیں

---

(۱) روح المعاني ۱۵/ ۵۲۰و ۵۲۱ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

چلتا کہ وہ اپنے آپ کو بچانے کی تدبیر کر سکے۔ مدتوں تک تو آدمی پریشان رہتا ہے، آدمی بیماری سمجھتا ہے، مختلف علاج ومعالجے کرتا ہے، پھر بڑی مشکل سے اس کی تشخیص ہوتی ہے کہ یہ تو سحر ہے، پھر اس کے علاج کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تو سب کچھ جانتے ہیں، لہٰذا اگر پہلے ہی دن سے اللہ کی پناہ کا اہتمام کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں، اور بچنے کی شکل پیدا فرماتے ہیں۔

گھٹن؛ حسد کا پہلا درجہ:

وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے)

حسد کہتے ہیں کسی کی نعمت کو دیکھ کر دل کے اندر گھٹن پیدا ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو دولت دی، اب آدمی دیکھتا ہے کہ اس کو دولت کیوں ملی؟ اس کی دولت کی وجہ سے اس کے دل میں تنگی اور گھٹن سی پیدا ہوتی ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے کوئی عہدہ عطا فرمایا، کسی کا کاروبار خوب چل رہا ہے، دوکان خوب چل رہی ہے، فیکٹری خوب چل رہی ہے، اس کو دیکھ کر اس کے دل میں گھٹن ہو رہی ہے کہ اس کے پاس یہ نعمت کہاں سے آ گئی؟ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی کو مقبولیت عطا فرماتے ہیں، اس کے کسی کام کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، اور دیکھنے والوں میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں گھٹن پیدا ہوتی ہے، اسی گھٹن کو حسد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ گھٹن حسد کا پہلا درجہ ہے۔

دوسرا درجہ اور اس کا علاج:

دوسرا درجہ یہ ہوتا ہے کہ اس گھٹن کے بعد وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ یہ نعمت اس کے پاس کیوں ہے؟ اس سے یہ نعمت چھن جانی چاہیے۔ ان دو درجوں میں پہلا درجہ غیر اختیاری ہے۔

آدمی کے اختیار کو اس میں دخل نہیں، آدمی کے نہ چاہتے ہوئے بھی، غیر اختیاری طور پر دل میں خیال آجاتا ہے؛ لیکن امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ آدمی کو چاہیے کہ اس کی طرف سے غافل نہ رہے؛ بلکہ اس خیال کو جمنے ہی نہ دے، اس سے پہلے ہی دل کو اس سے پاک و صاف کرنے کی کوشش کرے۔[1]

گھٹن کا علاج:

(۱) توبہ واستغفار:

چناں چہ اس پہلے مرحلے میں اللہ سے توبہ استغفار کرے، معافی چاہے کہ اے اللہ! میرے دل میں اس آدمی کی اس نعمت سے متعلق گھٹن کیوں آرہی ہے؟ تو یہ کیفیت ختم کر دے۔ اور اللہ سے توبہ کرے۔ یہ توبہ کا پہلا مرحلہ ہے۔

(۲) ترقی کی دعاء:

دوسرا مرحلہ یہ ہے اس آدمی کے لیے ترقی کی دعاء کرے۔ یہ بڑا سخت مرحلہ ہے، بہت کڑوی گولی ہے۔ لیکن بھائی! بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ جب تک کڑوی گولیاں استعمال نہ کرے، وہاں تک وہ ٹھیک نہیں ہوتی ہیں۔ جیسے کسی کو لرزہ والا بخار (ملیریا) ہوگیا ہو تو کوینائن (Quinine) استعمال کرنی ہی پڑے گی، بغیر کوینائن کے وہ جانے والا نہیں ہے۔ تو علاج کے اس دوسرے مرحلہ میں اس کے لیے دعا کرے کہ اے اللہ! اس کی اس نعمت میں برکت عطا فرما۔ اس کی وجہ سے دل کٹے گا، گویا دل پر آرہ چل رہا ہے، یہی اس کا علاج ہے، اس کے بغیر یہ چیز جانے والی نہیں ہے۔

---

[1] إحياء علوم الدين للغزالي: ۳/۱۹۰-۱۹۲ (ط: دار المعرفة، بيروت).

(۳) لوگوں میں تعریف:

علاج کا تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرے۔اس کی خوبیوں کو بیان کرے۔اس کے دل میں تو گھٹن ہو رہی تھی، یہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اس کی تعریف کریں، جب اس سے اس کی مقبولیت نہیں دیکھی جاتی تھی تو بھلا اپنی زبان سے اس کی تعریف کرنا یہ کتنا مشکل کام ہے!!! اس سے بھی دل پر آرے چلیں گے۔یہ دوسری کڑوی ٹیبلیٹ ہے۔یہ تین چیزیں ہیں، ان تین چیزوں کا اہتمام کریں گے، تو دل کی کیفیت بدلے گی۔

گھٹن کو دل ہی دل میں رہنے نہ دیں، رہنے دیں گے تو یہ اندر جمے گی، اور ترقی کرے گی، پھر اس کا علاج مشکل ہو جائے گا۔اور گھٹن کی کیفیت عام طور پر ہر ایک کے دل میں پیدا ہوتی ہے، بعضوں کو کبھی کبھی دل میں خیال آتا ہے؛ لیکن اس کو فوراً دور کرنے کے لیے اللہ کے حضور توبہ واستغفار اور جس کے لیے یہ کیفیت پیدا ہو رہی ہے اس کے لیے ترقی کی دعا اور لوگوں کے اندر اس کی تعریف، یہ تین چیزیں کریں۔

دوسرا مرحلہ اس کی نعمت چھن جانے کی تمنا کا تھا۔یہ بھی کبھی غیر اختیاری ہوتا ہے۔اس کے متعلق بھی امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اس دوسرے مرحلے میں بھی آدمی کو مطمئن ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیے؛ بلکہ اس کی طرف خاص توجہ کر کے علاج کی طرف دھیان دینا چاہیے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بیماری اندر سرایت کر جائے۔[1]

یہ خطرناک ہے:

تیسرا مرحلہ اختیاری ہے۔وہ یہ ہے کہ نعمت چھن جائے اب تک تو یہ خیال تھا، اب

---

(۱) إحیاء علوم الدین للغزالي: ۳/۱۹۱-۲۰۰.

وہ نعمت اس کے ہاتھ سے نکالنے کے لیے آپ تدبیریں کر رہے ہیں۔ جہاں اس کو اونچا مقام ملا تھا، جس ادارے کی طرف سے ملا تھا، یا جس کے ماتحت یہ کام کرتا ہے، اس کے ذمہ دار کی طرف سے اس کو یہ مقام دیا گیا تھا، اس کے پاس جا کر اس کی جھوٹی شکایتیں کرنا، اس کے متعلق اس کو بدگمان کرنا؛ تاکہ وہ اس کے پاس سے یہ کام واپس لے لے۔ بہت سے یہی کرتے ہیں۔ چناں چہ یہ کوشش اختیاری ہے۔ یا اس کو بدنام کرنے کے لیے مستقلاً جھوٹی خبریں چلانا، اس کی غیبت کرنا، اس کے متعلق لوگوں میں بدگمانیاں پیدا کرنا، جھوٹا پروپیگنڈا کرنا، یہ اختیاری چیز ہے۔ یہ تیسرا درجہ خطرناک ہے، لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ یہ پیدا ہونے سے قبل ہی پہلے دو درجوں میں ہی اس کے علاج کی طرف خصوصی توجہ کرے، اور اس کا طریقہ وہی ہے جو ابھی گزرا کہ توبہ واستغفار ہو۔ اور جس کے متعلق یہ چیز دل میں پیدا ہوئی ہے اس کے لیے دعاؤں کا اہتمام ہو، اور لوگوں کے سامنے اس کی خوبیوں کا پوری بشاشت کے ساتھ تذکرہ کیا جائے۔ ورنہ یہ بیماری ایسی خطرناک ہے کہ آدمی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔

حسد ایک آگ:

لوگ جادو بھی اسی لیے کرواتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے خلاف کچھ کر نہیں سکتے، لہٰذا اس کو تکلیف پہنچانے کے لیے جادو والا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ کسی جادوگر سے رابطہ کرتے ہیں، باقاعدہ پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ یہ کوئی نیکی کے لیے پیسہ خرچ کرنا ہوا؟ اس کو پیسہ دے کر اس آدمی کے خلاف جادوئی عمل کرواتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تکلیف میں گرفتار ہوتا ہے۔

اور جادوئی عمل میں کبھی کفریہ باتیں یا کبھی کفریہ کام کرنے پڑتے ہیں، تو آدمی کفر تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ حسد ایسا خطرناک مرض ہے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی ایمان تک سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اگر تیسرے درجہ کی وجہ سے یہ کام نہ کریں تو بھی دل میں جو گھٹن ہے وہ تو ایک ایسی آگ لگی ہوئی ہے، جو اندر ہی اندر اس کو جلانے کا کام کر رہی ہے۔ اس لیے اس کو دور کرنے لیے جو تدبیر بتائی گئی اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ حسد کی آگ آدمی کو کھا جاتی ہے۔

حسد بڑا خطرناک مرض ہے، اس سے بہت ساری مصیبتیں پیدا ہوتی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ خود آدمی اس کا علاج کرے، اس کی طرف توجہ کرے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ باری تعالیٰ نے اس کے لیے مستقل ایک آیت وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ نازل فرمائی ہے۔

حاسد مت بنیے:

دیکھو! آدمی کے دل میں غیر اختیاری خیال آیا، گھٹن پیدا ہوئی، پھر یہ خیال آیا کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے، یہ غیر اختیاری ہے۔ یہ حاسد تو ہے؛ لیکن اس نے ابھی کوئی کارروائی شروع نہیں کی ہے۔ اور تیسرا درجہ جو بتایا، کارروائی شروع کی تو اب آپ پر تکلیف آئے گی۔ پہلے دو درجے تک محسود پر کوئی تکلیف نہیں ہے، حاسد خود ہی اپنی آگ میں جل رہا ہے؛ لیکن اگر یہ حسد یہاں ختم نہیں ہوا اور آگے بڑھا تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ محسود کے لیے تکلیف میں مبتلا ہونے کی نوبت آئے گی۔ اور کون کس پر حسد کرتا ہے؟ پتہ چلتا نہیں ہے، اسی لیے اللہ کی پناہ حاصل کرے، وہ سب کے دلوں سے واقف ہے، وہی حسد کرنے والے کے

شر سے بچا سکتے ہیں۔اس لیے خاص طور پر اللہ کی پناہ حاصل کی گئی ہے۔ چناں چہ حسد سے اپنے آپ کو خاص طور سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آسمان وزمین میں سب سے پہلا گناہ؛ حسد:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے تفسیرِ عزیزی میں لکھا ہے کہ سب سے پہلا گناہ جو آسمان میں ہوا وہ بھی حسد،اور سب سے پہلا گناہ جو زمین میں ہوا وہ بھی حسد۔

آسمان میں: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو پیدا کیا اور ان کو مقام عطا فرمایا تو شیطان نے آپ پر حسد کیا۔

زمین میں: حضرت آدم کے دو بیٹے ہابیل اور قابیل تھے۔ ہابیل کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی وہ قابیل سے دیکھی نہیں گئی اور نتیجۃً اس نے اپنے بھائی کو قتل کرنے کی سازش کی اور قتل کیا۔[۱] تو مطلب یہ ہے کہ یہ حسد آدمی کو کہاں تک پہنچاتا ہے؟ قتل تک کرواتا ہے۔ تو آدمی کو چاہیے کہ اس حسد کی بیماری سے اپنے آپ کو چھٹکارا دینے کے لیے بھرپور کوشش کرے۔

حسد، ایک حماقت:

حسد ایک حماقت ہی ہے۔ حسد کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مال کیوں دیا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ عہدہ کیوں دیا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ عزت کیوں دی؟ اللہ تعالیٰ نے یہ مقبولیت کیوں دی؟ گویا اللہ تعالیٰ ایک نعمت اپنے بندے کو دے رہے ہیں، اس پر اس حاسد کو اعتراض ہے۔ تو یہ اعتراض کس پر ہو رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ پر!!! اگر آپ اپنے

---

(۱) تفسیر عزیزی پارۂ عم،ص:۶۹۰،ط: کتب خانہ فیض ابرار، انکلیشور، گجرات۔

ماتحتوں میں سے کسی کو کوئی چیز دیں، کوئی انعام دیں تو آپ کے ماتحتوں میں سے کوئی آپ پر اعتراض کرے کہ یہ آپ نے کیوں دیا؟ تو کیا آپ اس کو برداشت کر سکیں گے؟ نہیں۔ آپ اس کو سخت سے سخت سزا دیں گے۔ بھائی! تو کون بولنے والا؟ میری چیز تھی، میں نے اس کو دی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ. (الجمعة: ۴) اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ. (النساء: ۵۴) یہ حسد کرنے والے؛ اللہ نے جس کو اپنے فضل سے نعمت دی ہے، اس پر حسد کرتے ہیں؟ ان کو کڑھن ہوتی ہے؟ ان کے پیٹ میں درد ہوتا ہے؟ بھائی! اللہ نے اس کو اپنے فضل سے دیا، آپ کے پیٹ میں کیوں درد ہوتا ہے؟ آپ کیوں تکلیف میں پڑ رہے ہیں؟ **حاصل یہ ہے کہ یہ براہ راست اللہ تعالیٰ پر اعترض ہے، یہ بڑا خطرناک مرحلہ ہے، اس سے آدمی ایمان تک سے محروم ہو جاتا ہے۔** اس لیے یہاں اس سورت میں اس سے پناہ چاہی گئی ہے کہ حاسد جب حسد پر اترتا ہے، اور تکلیف پہنچانے کے لیے میدان میں آتا ہے، تو مسئلہ بڑا سنگین ہو جاتا ہے۔ اس کے شر سے اللہ ہی حفاظت فرمائے۔ لہٰذا ہمیں خود بھی اپنے آپ کو حسد سے بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

دین کو مونڈنے والی:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: إياكم و الحسد فإنه يأكل الحسنات كما تأكل النار الحطب.[1] تم اپنے آپ کو حسد سے بچاؤ، اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھاتی ہے۔ یعنی آگ سے لکڑی ختم ہو جاتی ہے تو حسد کی وجہ سے نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے: قد دب إليكم داء الأمم قبلكم: الحسد

---

(۱) أخرجه البخاري في تاريخه تعليقا: ۱/۲۷۲ (ط: دائرة المعارف العثمانية حيدر آباد، دكن) و أبو داود في سننه: ۴۹۰۳ وغيرهما.

و البغضاء. هی الحالقة، لا أقول: تحلق الشعر، ولكن تحلق الدين. إلخ أو كما قال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم.[۱]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ: تم میں رفتہ رفتہ وہ دو چیزیں آرہی ہیں، جو اگلی امتوں میں تھیں: حسد اور دشمنی۔ یہ مونڈنے والی ہیں، میں نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈتی ہیں، بلکہ دین کو مونڈتی ہیں۔ جو آدمی اس میں مبتلا ہوتا ہے وہ غیبت کرے گا، تہمتیں لگائے گا، اس کو تکلیف پہنچانے کی تدبیریں کرے گا، یہاں تک کہ سب کچھ کر ڈالتا ہے۔ الحاصل یہ چیز آدمی کو دین سے محروم کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس لیے حسد سے اپنے آپ کو نہایت اہتمام کے ساتھ بچانے کی ضرورت ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس مرض سے بھی اور اس مرض میں جو گرفتار ہیں ان کی وجہ سے جو تکلیفیں پہنچ سکتی ہیں ان سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین یارب العالمین.

(۱) أخرجه الترمذي في جامعه: ۲۵۱۰ (ط: مطبعة مصطفىٰ البابي الحلبي، مصر) وغيره.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ ناس

(قسط-۱)

(مؤرخہ ۶/رجب المرجب ۱۴۳۹ھ مطابق: ۲۴/مارچ ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم۝

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّةِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾

یہ معوذتین کی دوسری سورت ہے، پہلی سورۂ فلق تھی، اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور یہ دوسری سورۂ ناس ہے۔ دونوں کا شان نزول اور سبب نزول بتلایا جا چکا ہے۔ اب یہاں اس کا ترجمہ دیکھتے ہیں۔

دونوں سورتوں میں فرق:

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ (اے نبی! آپ کہیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے

پروردگار کی)

ان دونوں سورتوں میں بڑا فرق ہے۔

فرق یہ ہے کہ سورۂ فلق میں پناہ صرف اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ذکر کر کے اس کے واسطے سے مانگی گئی، اسی کی پناہ حاصل کی گئی۔ اور جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی تھی وہ کل چار ہیں: (۱) تمام مخلوق جو اللہ نے پیدا کی۔ (۲) اندھیری رات کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے، پھیل جائے۔ (۳) گرہوں پر پھونک مارنے والی جانیں۔ (۴) حسد کرنے والے کے شر اور حسد سے، جب کہ وہ حسد کرنے پر آوے۔ جن سے پناہ مانگی گئی ہے وہ کل چار ہیں، اور جس کی پناہ حاصل کی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ایک ذات ہے۔ اس لیے کہ یہاں دنیوی مصائب سے پناہ چاہی گئی ہے۔ اور یہ مصائب صرف انسانوں کے ساتھ خاص نہیں ہیں؛ بلکہ دیگر مخلوقات کو بھی پیش آسکتی ہیں، اس لیے اللہ کی ایک صفت رب الفلق کو بیان کیا گیا۔

اور سورۂ ناس میں ہے کہ میں تمام لوگوں کے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔ انسانوں کا تذکرہ اس لیے کیا کہ اس میں جس مصیبت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ دنیوی نہیں؛ بلکہ اخروی ہے، اور اس کا تعلق انسانوں سے ہے، دوسری مخلوقات کو یہ مصیبت پیش نہیں آتی، انسان اور جنات ہی کو پیش آتی ہے، اور انسان کو زیادہ پیش آتی ہے؛ اس لیے یہاں رب الناس کا تذکرہ کیا گیا کہ میں پناہ چاہتا ہوں تمام لوگوں کے پروردگار کی۔

مَلِكِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے بادشاہ کی)

اِلٰهِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے معبود کی پناہ چاہتا ہوں)

اخروی نقصان بڑا ہے:

یہاں اللہ کی تین صفات کا تذکرہ کیا گیا: (۱) صفت ربوبیت (۲) صفت ملوکیت

(۳) صفت الوہیت۔ گویا تین صفات کے واسطے سے اللہ کی پناہ حاصل کی گئی۔ اور جس چیز سے پناہ چاہی گئی ہے وہ ایک ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دوسری سورت میں معوَّذ منہ- وسوسہ ڈالنے والا شیطان- کتنا خطرناک ہے!!! یہ اخروی مصیبت ہے، دین سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ اس وسوسہ کی وجہ سے خدانخواستہ ایمان برباد ہو گیا، تو آخرت خراب ہو جائے گی۔ **سورۂ فلق میں جن چار چیزوں سے پناہ مانگی گئی تھی ان کا تعلق اور ان کا نقصان صرف دنیوی ہے۔ اور سورۂ ناس میں مذکور چیز کا تعلق آخرت سے ہے، اس لیے اس میں بڑا اہتمام کیا گیا، اور اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے حوالے سے اللہ کی پناہ چاہی گئی۔**

پروردگار جس کی پرورش کرتا ہے وہ اس کی حفاظت کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کا پروردگار ہے تو ان کی حفاظت کا بھی انتظام کریں گے۔ بادشاہ اپنی رعیت کی حفاظت کا اہتمام کرتا ہے، اور معبود اپنی عبادت کرنے والوں کی حفاظت کا اہتمام کرتا ہے۔ گویا یہاں تین تین طریقوں سے حفاظت کو مدنظر رکھا گیا، اور پھر جو پناہ چاہی گئی وہ ایک شر سے کہ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔

الوسواس عربی زبان کا مصدر ہے؛ یہاں اسم فاعل کے معنیٰ میں ہے، اور مصدر جب اسم فاعل کے معنیٰ میں لیا جائے، تو مبالغہ مقصود ہوتا ہے، یعنی بہت زیادہ وسوسہ ڈالنے والا۔ اور اتنا ہی نہیں کہ وسوسہ ڈالے؛ بلکہ خناس وسوسہ ڈال کر پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔ خَنَسَ-یَخْنِسُ کا معنیٰ پیچھے چھپ جانا ہے۔ لہٰذا اگر وہ جنات و شیاطین میں سے ہے، تو نظر نہیں آتا، پھر مزید برآں کہ وہ وسوسہ ڈال کر چھپ بھی جاتا ہے۔

وسوسہ کیسے ڈالتا ہے؟:

حدیث شریف میں آتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **شیطان انسان کے قلب پر اپنی سونڈ رکھتا ہے۔ جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے، تو پیچھے چھپ جاتا ہے اور جب ذکر سے غافل ہوتا ہے، تو قلب میں وسوسے ڈالنے لگتا ہے۔**[۱] جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ مچھر کاٹنے کے لیے آتا ہے تو کیسا اپنی سونڈ رکھتا ہے۔ ایک بزرگ نے عالم مکاشفہ میں شیطان کو دیکھا تو اسی شکل میں دیکھا کہ وہ انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے؛ لیکن انسان جب اللہ کو یاد کرتا ہے، اللہ کا ذکر کرتا ہے، تو وہ فوراً پیچھے کھسک جاتا ہے۔ گویا بہت زیادہ پیچھے کو چھپنے والا اور بہت زیادہ وسوسہ ڈالنے والا۔ وسوسہ بھی ڈالتا ہے اور جوں ہی اللہ کا ذکر ہوتا ہے، ویسے ہی پیچھے چھپ بھی جاتا ہے۔

وسوسہ کیا ہے......؟

شیطان برائی کے وسوسے ڈالنے کے لیے دل کے راستہ سے اپنا اثر پیوست کرتا ہے، دل سے باتیں کرتا ہے۔ وسوسہ کیا ہے؟ شیطان کا انسان کے دل سے باتیں کرنا۔ ہمیں آواز تو سنائی دیتی ہے دل میں، وہ سامنے آتا ہے، لیکن نظر نہیں آتا۔ اسی طرح شیطان انسانی قلوب میں اپنا اثر پیوست کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (چاہے جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے)

---

(۱) أخرجه ابن أبی الدنيا في مكايد الشيطان: ۱/ ۱۹ (ط: المركز العربي للكتاب، الأمارات العربية المتحدة-الشارقة-) و أبو يعلیٰ الموصلي في مسنده: ۷/ ۲۷۸ (ط: دار المأمون للتراث، دمشق) و ابن عدي فی الكامل: ۴/ ۱۲۹ (ط: دار الكتب العلمية بيروت، لبنان).

دونوں میں سے ہوسکتا ہے، شیاطین جن کی ایک قسم ہے۔ كَانَ مِنَ الْجِنِّ۔ (الکھف: ۵۰)
باری تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں۔ ابلیس سب شیطانوں کا باوا ہے، یہ بھی جنات کی قسم سے تھا۔

انسان بھی وسوسہ ڈالتے ہیں:

وسوسہ ڈالنے والے صرف شیاطین ہی نہیں؛ انسان بھی ہوتے ہیں۔ شیاطین نظر نہیں آتے، اور انسان نظر آتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کو برائی کی ترغیب دیتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ دوسروں کے سامنے اُن غلط کاموں کی خوبیاں اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ سن کر کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ یہی ہے وسوسہ اندازی۔
چناں چہ اس سورت میں وسوسہ ڈالنے والا چاہے جنات ہو یا انسان، دونوں سے پناہ چاہی گئی ہے۔ چوں کہ اس کا نقصان آخرت سے متعلق ہے، اس لیے اس کا بڑا اہتمام کیا گیا۔
شیطان ہی انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ بہت سی مرتبہ تو اس کے وسوسہ ڈالنے کی وجہ سے لوگ ایمان سے محروم ہوجاتے ہیں، یا اس کی ایمان سے محرومی کی کوشش تو رہتی ہے؛ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اور کبھی بجائے ایمان سے محرومی کے؛ گناہوں اور فسق و فجور کے وسوسے ڈالتا ہے، اور کبھی انہی وسوسوں کے نتیجہ میں آپس کے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ بھائی- بھائی میں لڑائی ہوتی ہے، میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا ہے، اور اسی جھگڑے کے نتیجہ میں طلاق کی نوبت آتی ہے۔ یہ سب کون کراتا ہے؟ شیطان!

گھریلو جھگڑے ایک وظیفہ:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ شیطان پانی پر اپنا تخت بچھاتا ہے اور پھر اپنے چیلوں

چپاٹوں، چھوٹے چھوٹے شیاطین، شتونگڑوں سے رپورٹ لیتا ہے، وہ سب اس کے سامنے آکر اپنے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ میں فلاں آدمی کے پیچھے رہا، وہ نماز پڑھنے کے لیے جا رہا تھا، تو اس کو نماز پڑھنے نہیں جانے دیا، دوسرے کام میں لگا دیا۔ فلاں آدمی فلاں نیک کام کرنے جا رہا تھا، میں نے اس کو وہاں سے ہٹا کر دوسرے کام میں مشغول کر دیا۔ اس طرح ہر ایک اپنا کارنامہ بیان کرتا ہے۔ وہ سب سے کہتا ہے: تم نے کچھ نہیں کیا اسی دوران ایک آکر کہتا ہے کہ میں نے میاں بیوی میں لڑائی جھگڑا کرایا، یہاں تک کہ طلاق کی نوبت آگئی۔ تو وہ اسے اپنے قریب کرتا ہے اور کہتا ہے: نِعم أنت (تو بڑا اچھا آدمی ہے) یہاں تک کہ اسے گلے لگا لیتا ہے۔[1] **چناں چہ جو طلاقیں واقع ہوتی ہیں، میاں بیوی کے جھگڑے ہوتے ہیں، ان میں بھی شیطان کی وسوسہ اندازی کا دخل ہوتا ہے۔ اور اس سے حفاظت کا طریقہ یہی ہے کہ ان سورتوں کو بکثرت پڑھنے کا معمول بنایا جائے۔** جہاں میاں بیوی کے جھگڑے بہت ہوتے ہوں اس کا بہت آسان وظیفہ ہے کہ اس سورت کو پڑھنے کا اہتمام کیا جائے۔ شیطان کی وسوسہ اندازی کی وجہ سے ہی ایسا ہوتا ہے۔

نماز کا وسوسہ:

آدمی کو جو وسوسے ڈالے جاتے ہیں ان کو علما نے لکھا ہے اور بعض روایتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے، جیسے نماز میں وسوسہ۔ بخاری شریف کی روایت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: جب اذان ہوتی ہے تو شیطان اذان کی آواز سن کر ہوا چھوڑتا ہوا بھاگتا ہے۔[2] اس لیے کہ جو بھی

---

(۱) أخرجه مسلم برقم: ح ۲۸۱۳.

(۲) أخرجه البخاري برقم: ۶۰۸.

اذان کی آواز سنے گا، اللہ تعالیٰ نے اس پر لازم کردیا ہے کہ وہ گواہی دے، اور شیطان گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس لیے شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کے کان میں اذان کی آواز نہ آئے۔ اس لیے وہ بھاگتا ہے، اور بھاگ کر ایسی جگہ چلا جاتا ہے، جہاں اذان کی آواز نہ آئے۔ پھر واپس آجاتا ہے۔ پھر جب نماز کے لیے اقامت کہی جاتی ہے، تو چوں کہ اقامت بھی أحد الأذانین (دو اذانوں میں سے ایک اذان) کہلاتی ہے، وہی کلمات اقامت کے بھی ہیں، پھر بھاگ جاتا ہے۔ پھر جب اقامت پوری اور نماز شروع ہوتی ہے تو وہ انسان کے دل پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جو چیزیں اس کو نماز سے پہلے یاد نہیں تھیں، جن کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں تھا، نماز کی نیت باندھی نہیں کہ یہ یاد کر، یہ یاد کر سب اس کو یاد دلاتا ہے۔ عجیب عجیب چیزیں اس کو یاد دلاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی قراءت بھی بھول جاتا ہے، اس کو غلطی ہوجاتی ہے۔ یہ نماز کا وسوسہ ہے۔[1]

وضو کا وسوسہ:

وضو نماز کا مقدمہ ہے، وضو میں بھی وسوسہ ڈالتا ہے۔ وضو میں وسوسہ ڈالنے والا مستقل ایک الگ شیطان، جس کا نام ولھان ہے۔[2] **بعض لوگ وضو میں بھی وسوسہ کا شکار ہوتے ہیں، وضو کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو آدھا آدھا گھنٹے، ایک ایک گھنٹے تک ان کا وضو ہی ختم نہیں ہوتا، یہ شیطان کا اثر ہوتا ہے۔** ظاہر ہے کوئی آدمی کب تک اس کا مقابلہ کرے گا؟ کچھ مدت کے بعد آدمی مایوس ہوکر کہ بھئی! یہ ہمارے بس کا نہیں ہے، نماز ہی چھوڑ دے گا۔ اور اس کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ **اور ان وسوسوں کا علاج بھی یہی ہے کہ اس**

---

(۱) ورد ھذا فی الحدیث الضعیف الذي خرّجه الترمذي في جامعه برقم: ۵۷.

(۲) ورد ھذا فی الحدیث الضعیف الذي خرّجه الترمذي في جامعه برقم: ۵۷.

کے ان وسوسوں پر عمل نہ کیا جائے۔

اب تو بغیر وضو کے ہی نماز پڑھوں گا:

حضرت گنگوہیؒ کے متعلق لکھا ہے: حضرت فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ وضو کر کے اٹھا، تو خیال آیا کہ کہنی ذرا خشک رہ گئی ہے، تو گیا اور اس کو دھولیا۔ تاکہ شک دور ہو جائے۔ اس کے بعد نماز کی نیت باندھنا ہی چاہتا تھا کہ پھر خیال آیا کہ دوسری بھی خشک رہ گئی ہے، پھر جا کر اس کو دھویا۔ تاکہ یہ شبہ بھی باقی نہ رہے۔ پھر نماز کی نیت باندھنا ہی چاہتا تھا کہ خیال آیا کہ پاؤں کا ٹخنہ ذرا خشک رہ گیا ہے۔ جب یہ خیال آیا تو سوچا کہ یہ تو گڑ گھنٹال ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ: میں نے کہا: اب تو میں بغیر وضو کے ہی نماز پڑھوں گا۔ پھر نہیں گیا۔ اس کا یہی ایک علاج ہے۔

موطا امام مالک میں ہے: حضرت سعید بن مسیبؒ - جو کبارِ تابعین میں سے ہیں ان - کے پاس ایک آدمی آیا، اور کہا: جب میں نماز کی نیت باندھتا ہوں، تو نماز میں یہ خیال آتا ہے کہ کچھ قطرہ نکلا، کچھ تری مجھے محسوس ہوتی ہے۔ تو حضرت سعید بن مسیبؒ نے کہا کہ وہ میری ران پر بہہ کر نیچے اترے گا، تب بھی نماز نہیں توڑوں گا۔[۱] شیطان اس طرح نماز سے ہٹانا چاہتا ہے۔

وہم کا علاج:

بخاری شریف میں ہے: ایک آدمی کے متعلق حضور ﷺ سے عرض کیا گیا کہ وہ نماز کی نیت باندھتا ہے تو اس کو خیال آتا ہے کہ ہوا خارج ہوئی۔ اور اس کی وجہ سے وہ نماز توڑ کر

---

(۱) الموطأ للامام مالک: ۵۶ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت، لبنان).

وضو کے لیے جاتا ہے۔ اور اس کو بار بار یہ وہم ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ گیس کی وجہ سے ہوا مخرج تک آکر واپس چلی جاتی ہے؛ لیکن آدمی کو یوں خیال آتا اور شبہ ہوجاتا ہے کہ شاید ہوا نکلی ہو اور وضو ٹوٹ گیا ہو۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تک آواز نہ سنے یا بو محسوس نہ کرے تب تک نماز نہ توڑے۔[1] اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ جس کو یہ مرض نہیں ہے، اس کو یقین ہے کہ ہوا نکلی، پھر وہ یوں کہے کہ میں نے آواز تو سنی نہیں۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو وہم کا شکار ہو، اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیماری سے نکالنے کے لیے ایک تدبیر بتلائی۔ ورنہ اصل تو یہ ہے کہ **جب کسی کو وضو کے ٹوٹنے کا یقین ہوجائے تو چاہے بد بو محسوس ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، آواز سنی ہو یا نہ سنی ہو، وضو کرنا ہے۔**

آئندہ مجلس میں وساوس کے موضوع پر ان شاء اللہ، اللہ نے توفیق دی تو مستقلاً بات کریں گے۔ ابھی تو ترجمہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی۔

مَلِكِ النَّاسِ تمام لوگوں کے بادشاہ کی۔

اِلٰهِ النَّاسِ تمام لوگوں کے معبود کی۔

مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ ۔ الَّذِىۡ يُوَسۡوِسُ فِىۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ اس وسوسہ ڈالنے والے کی برائی اور شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔

مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ چاہے وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

بہرحال! معوذتین کے خاص خاص فضائل ہیں۔ اور خاص مقصد کے لیے نازل کی گئی تھیں، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مختلف مواقع پر اس کے پڑھنے کی تاکید فرمائی اور

---

(۱) أخرجه البخاري: ۱۳۷.

ان کے فضائل بیان کیے ہیں۔

[۱] پریشانی کے وقت معوّذتین کا ورد:

ابوداود شریف کی روایت ہے، حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ جحفہ اور ابواء کے درمیان تھا کہ اچانک آندھی آئی، اور سخت اندھیرا ہوگیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس کے ذریعہ اس مصیبت سے اللہ کی پناہ مانگنے لگے، یعنی ان کو پڑھنے لگے، اور فرمایا: اے عقبہ! ان سورتوں کے ذریعہ اللہ کی پناہ حاصل کرو! کیوں کہ ان جیسی اور کوئی چیز نہیں جس کے ذریعہ کوئی پناہ لینے والا پناہ حاصل کرے۔ اور پھر آپ نے ہمیں نماز پڑھائی اور یہی دونوں سورتیں نماز میں پڑھیں۔[۱]

دیکھو! بارش کے موسم میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خوب اندھیرا چھا جاتا ہے، بارش کی وجہ سے ایک طوفان کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے؛ لیکن ہمیں کبھی ان سورتوں کے پڑھنے کا خیال نہیں آتا۔ اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

[۲] پریشانی کے وقت پڑھنے کا عمل:

حضرت معاذ بن عبداللہ بن خبیبؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم ایسی رات میں جس میں بارش ہو رہی تھی اور سخت اندھیرا بھی تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاش کرنے کے لیے نکلے، چناں چہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پالیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہو۔ میں نے عرض کیا: کیا کہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب صبح اور شام ہو سورۂ قل ھو اللہ احد، سورۂ قل اعوذ برب الفلق

---

(۱) أخرجه أبو داود في سننه برقم: ۱۴۶۳.

اور سورۂ قل اعوذ برب الناس تین بار پڑھ لو۔ یہ عمل کرلو گے تو ہر ایسی چیز سے تمہاری حفاظت ہو جائے گی جس سے پناہ لی جاتی ہے۔(یعنی ہر موذی سے اور ہر بلا سے محفوظ ہو جاؤ گے)[۱]

کبھی معوذات، جمع کا صیغہ بھی بولا جاتا ہے تو اس میں سورۂ قل ھو اللہ بھی شامل کر لی جاتی ہے۔

[۳] فرض نمازوں کے بعد پڑھنے کا معمول

حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ ہر نماز کے بعد معوذات پڑھا کروں۔[۲]

اس کی عادت بنالو تو بہت اچھی بات ہے۔

[۴] سفر میں، نماز فجر میں:

حضرت عقبہ بن عامرؓ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے عقبہ! کیا میں تمہیں دو بہترین سورتیں نہ بتاؤں؟ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس دونوں سورتیں سکھائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اندازہ ہوا کہ مجھے زیادہ خوشی نہیں ہوئی، جب فجر کی نماز کے لیے اترے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں سورتوں کی نماز میں تلاوت فرمائی۔ اور نماز سے فارغ ہو کر فرمایا: بولو عقبہ! تم نے کیسا دیکھا؟ (یہ فرما کر آپ نے ان دونوں کی فضیلت بتائی)[۳]

---

(۱) أخرجه الترمذي في جامعه: ۳۵۷۵ وأبو داود في سننه: ۵۰۸۲.

(۲) أخرجه أحمد في المسند: ۱۷۴۱۷ (ط: مؤسسة الرسالة) وأبو داود في سننه: ۱۵۲۳ وغيرهما.

(۳) أخرجه أبو داود فی سننه: ۱۴۶۲.

[۵] رات کا ایک عمل:

بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ روزانہ رات کو جب حضور ﷺ بستر پر تشریف لاتے تو سورۂ قل ھو اللہ احد، سورۂ قل اعوذ برب الفلق اور سورۂ قل اعوذ برب الناس پڑھ کر ہاتھ کی دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر ان میں اس طرح پھونک مارتے تھے کہ کچھ تھوک بھی پھونک کے ساتھ نکل جاتا تھا۔ پھر دونوں ہتھیلیوں کو پورے بدن پر جہاں تک ممکن ہوتا تھا، پھیر لیتے تھے۔ یہ ہاتھ پھیرنا سر اور چہرے سے اور سامنے کے حصے سے شروع فرماتے تھے، اور یہ عمل تین بار کرتے۔[۱]

[۷] بیماری کا ایک عمل:

بخاری شریف میں ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ کو جب کوئی تکلیف ہوتی تھی تو اپنے جسم پر سورۂ قل اعوذ برب الفلق اور سورۂ قل اعوذ برب الناس پڑھ کر دم کیا کرتے تھے، (جس کا طریقہ اوپر گزرا) پھر جس مرض میں آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس میں، میں (حضرت عائشہؓ) یہ عمل کرتی تھی۔ (چوں کہ بیماری کی شدت کی وجہ سے حضور ﷺ بول نہیں سکتے تھے، پڑھ نہیں سکتے تھے) کہ میں دونوں سورتیں پڑھ کر آپ کے ہاتھ مبارک پر دم کر دیتی تھی، پھر آپ ﷺ کے ہاتھوں کو آپ کے جسم پر پھیر دیتی تھی۔ آپ کے ہاتھوں سے برکت کے حصول کے لیے۔[۲]

بہر حال! یہ سورتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں، ان کو پڑھنے کی عادت ڈالو، صبح اور شام

---

(۱) أخرجه البخاری: ۵۰۱۷.

(۲) أخرجه البخاری: ۵۰۱۶.

تو یقیناً پڑھا کرو، اور ہر نماز کے بعد اگر پڑھیں تو بہت اچھا ہے۔ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہر مصیبت سے حفاظت فرمائیں گے۔

آج کل لوگ شکایت کرتے ہیں کہ فلاں نے یہ کر دیا، فلاں نے جادو کر دیا، کچھ کالا کر دیا۔ یہ سب اس لیے ہے کہ حفاظت کے جو طریقے نبی کریم ﷺ نے بتلائے ہیں، ان کا ہم اہتمام نہیں کرتے۔ ہمارے اسلاف کے یہاں ان سب چیزوں کا بڑا اہتمام تھا، وہ یہ سب کرتے تھے اس لیے وہ محفوظ بھی رہتے تھے۔ آج کل تو ساری چیزیں چھوٹ ہی گئی ہیں، ان کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں ہے۔ اس لیے ان ساری چیزوں پر عمل کی عادت ڈالی جائے، اپنے بچوں کو بھی سکھلایا جائے، تاکہ بچپن سے ہی وہ اس کے عادی بن جائیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان شاء اللہ اس طرح کی مصیبتوں سے حفاظت فرمائیں گے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۂ ناس

(قسط-۲)

(مؤرخہ ۱۴/رجب المرجب ۱۴۳۹ھ مطابق ۳۱/مارچ ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ﴿۳﴾ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ ﴿۴﴾ الَّذِىۡ يُوَسۡوِسُ فِىۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿۶﴾

گزشتہ سے پیوستہ:

اگلی مجلس میں سورۂ ناس کا ترجمہ ہو چکا تھا، وضاحت بھی آئی تھی، آج پھر دوبارہ ترجمہ سن لیجیے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (کہیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی)
مَلِكِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے بادشاہ کی)
اِلٰهِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے معبود کی)
مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ اس وسوسہ ڈالنے کے والے کی برائی اور شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔
مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ چاہے وہ جنات میں سے ہو، چاہے انسانوں میں سے۔

دین دار طبقے کا سب سے بڑا پرابلم:

میں نے اگلی مجلس میں وعدہ کیا تھا کہ وساوس کے متعلق کچھ عرض کروں گا؛ کیوں کہ آج کل دین دار طبقہ کو سب سے بڑا پرابلم انھیں خیالات اور وساوس کا ہے۔ بہت سے لوگ ان کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں اور تکلیف کا شکار ہوتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں (بالخصوص حضرات صحابہؓ کے سوالات کے جواب میں) وہ آپ کے سامنے وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کی جائیں؛ تاکہ اس سلسلے میں آپ کو ایسی معلومات ہوں جو اطمینان کا ذریعہ بنیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حضرات صحابہؓ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انہوں نے بہت سی ہمیں پیش آنے والی باتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا جواب دے کر اس کا حل بتلایا۔

روایاتِ وساوس:

وساوس کے سلسلے میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سارے ارشادات ہیں۔

ہمارے مدارس میں عربی کے چھٹے سال میں مشکوۃ شریف پڑھائی جاتی ہے، اس میں صاحب مشکوٰۃ نے مستقل ایک باب قائم کیا ہے باب في الوسوسة اس باب کے تحت بہت سی روایات صاحب مشکوٰۃ نے پیش کی ہیں۔ ان سب کا پیش کرنا تو مشکل ہے، بقدر ضرورت کچھ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

(۱) حضور اکرم ﷺ کا ایک ارشاد بخاری شریف اور دوسری احادیث کی کتابوں میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: إن الله تجاوزلي عن أمتي ما وسوست به صدورها، ما لم تعمل أو تكلم. (اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری امت سے معاف کردیا ان چیزوں کو جن کے ان کے دلوں میں وسوسے آتے ہیں جب تک کہ وہ ان پر عمل نہ کریں یا ان کو اپنی زبان سے ادا نہ کریں)۔[۱]

(۲) دوسری روایت مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: إن ناسا من أصحاب رسول الله ﷺ سألوا النبی ﷺ إنا نجد فی أنفسنا ما یتعاظم أحدنا أن یتکلم به. (حضور ﷺ کے صحابہ میں سے بعض نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ ہم اپنے دلوں میں کچھ ایسی باتیں پاتے ہیں جن کا اپنی زبان سے بولنا اور ظاہر کرنا ہمیں بہت بھاری اور گراں معلوم ہوتا ہے)[۲] تو نبی کریم ﷺ نے ان کا یہ سوال سن کر ان سے پوچھا: أو قد وجدتموہ؟ کیا واقعۃً دل کی یہ کیفیت ہے؟ یعنی ان خیالات کی وجہ سے آپ کو ایسا ہوتا ہے اور ان کو ظاہر کرنا بہت گراں اور بھاری سمجھتے ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: نعم۔ جی ہاں! تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ذالک صریح الإیمان (یہ تو کھلم کھلا ایمان ہے)۔

---

(۱) أخرجه البخاری: ۲۵۲۸.

(۲) أخرجه مسلم: ۱۳۲.

(۳) تیسری روایت مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابن عباسؓ کی ہے: أن رجلاً سأل النبي ﷺ إني أحدث نفسي بالشيئ لأن أكون حممة أحب إلي من أن أتكلم به. (ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: میں دل ہی دل میں باتیں کرتا ہوں، میں جل کر کوئلہ ہو جاؤں یہ مجھے زیادہ پسند ہے بنسبت اس کے کہ میں ان باتوں کو اپنی زبان سے بولوں) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: الحمد لله الذی رد أمرہٗ إلی الوسوسة (تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے اس کا معاملہ وسوسہ تک محدود کردیا)۔[۱]

ان ہی تین روایات کو سامنے رکھ کر آج آپ کے سامنے اس موضوع پر کچھ بات کرتا ہوں؛ تاکہ آج کل لوگوں کو خاص کر نوجوانوں کو رہبری ملے۔

شیطان بے وقوف تھوڑا ہے:

یاد رکھنا! وساوس دین دار طبقے اور ایمان والوں کو ہی پیش آتے ہیں۔ کافروں کو تو کاہے کو آئیں گے؟ اس لیے کہ شیطان ان وساوس کے ذریعہ سے ہی سامنے والے کو اپنا شکار بناتا ہے۔ کافر تو پہلے سے کافر ہی ہے، شیطان کو اس کو وسوسہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ اپنی محنت کیوں بے کار اور برباد کرے گا؟

ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ جس زمانہ میں تدریس کی نسبت سے مظاہر علوم میں مقیم تھے۔ (یہ آزادی سے پہلے کی بات ہے) اس زمانے میں قادیانیت کا زور تھا، اور بہت سے لوگ قادیانی ہو رہے تھے، اس وقت ایک شیعہ آیا ہوا تھا اور وہ کئی روز مدرسہ کے مہمان خانہ میں ٹھہرا، اور مختلف مسائل پر مفتی صاحب سے اس نے باتیں کیں، سوالات و جوابات کیے۔ اس نے اپنے مذہب شیعیت کی حقانیت کو ظاہر کرنے

---

(۱) السنن لأبی داود: ۵۱۱۲ و مشکوٰۃ المصابیح: ۷۳.

کے لیے ایک بات یہ بھی کہی کہ جتنے بھی لوگ قادیانی بنتے ہیں، وہ سب سنی ہوتے ہیں۔ ایک بھی شیعہ آج تک قادیانی نہیں بنا۔ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ **شیطان بے وقوف تھوڑا ہے؟ جو اپنی محنت ضائع کرے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ شیعہ تو پہلے سے ہی کافر ہے، تو اس پر محنت کر کے کاہے کو وقت ضائع کروں جس کے پاس ایمان ہو اس کو محروم کروں۔** بہر حال! حقیقت یہ ہے کہ یہ وسوسے ایمان والوں کو آتے ہیں اور ان میں بھی دین دار طبقہ ہی کو زیادہ آتے ہیں۔

وسوسہ کی اقسام:

(۱) ایمانیات سے متعلق:

ان وسوسوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ ہر ایک کا حل میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ (ان شاء اللہ)

(۱) وسوسہ کی پہلی قسم ایمانیات سے متعلق ہے۔ ہمیں ایمان لانے کا حکم دیا گیا، آپ بچپن سے پڑھتے ہیں: اٰمنت باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاٰخر والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت. (ایمان لایا میں اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر، تقدیر پر بھلا ہو یا برا سب اللہ کی طرف سے ہے۔ اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر) یہ ایمان مفصل ہے، اس میں ان باتوں کو کوذکر کیا گیا ہے۔ یہ احکامات قرآن میں بھی ہیں۔

اٰمنت باللہ:

[۱] اللہ پر دو چیزوں کا ایمان لانا ہے، ایک تو اللہ کی ذات کو ماننا ہے۔ دنیا میں ایسے

بہت سے لوگ ہیں، جو اللہ کو مانتے ہی نہیں، اللہ ہے ہی نہیں-نعوذ باللہ- ایسی باتیں کرتے ہیں۔انکار کرنے والوں نے ہر ایک چیز کا انکار کیا، اللہ کے وجود کا بھی انکار کیا؛البتہ موت ایک ایسی حقیقت ہے،جس کا آج تک کوئی انکار نہیں کرسکا ہے۔ باقی سب چیزوں کا انکار کرنے والے دنیا میں ہیں۔ چناں چہ ایک تو اللہ کے وجود کو مانیں، اوراس کی صفات پر بھی ایمان لائیں، اللہ کے ننانوے (۹۹) ناموں میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جن صفات کو بیان کیا گیا ہے، ان پر ایمان لانا، اللہ تعالیٰ علیم ،علم والا ہے،قدرت والا ہے، سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔ الی آخرہ ...... اللہ اور اللہ کی تمام صفات کو مانو۔اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ جیسے: پیدا کرنا، پیدا اللہ ہی نے کیا، دنیا میں اللہ کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جو پیدا کرنا جانتا ہو، اسی طرح جو کچھ دینے والا ہے وہ بھی اللہ ہی دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایمان لانا ہوا۔

وملٰئکتہ:

[۲] فرشتوں پر ایمان لانا، وہ ایک مخلوق ہے جو اللہ تعالیٰ نے نور سے پیدا کی ہے، جو نہ تو کبھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی کرتی ہے، اور اللہ تعالیٰ جو حکم دیتے ہیں، وہ اس کو پورا کرتی ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہے:لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ. (التحریم :٦) (اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا اس کے ذرہ برابر بھی خلاف نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا اللہ نے ان کو حکم دیا ہے)اس کائنات کے نظام کو اللہ تعالیٰ چلاتے ہیں، اس نظام کے چلانے میں یہ سارے فرشتے استعمال ہوتے ہیں۔فرشتے اللہ تعالیٰ کا اسٹاف ہیں۔اور بھی بہت سارے کام اللہ تعالیٰ ان سے لیتے ہیں۔

وکتبہ:

[۳] اللہ تعالیٰ نے کتابیں بھیجیں۔ توریت حضرت موسیٰؑ پر، زبور حضرت داودؑ پر، انجیل حضرت عیسیٰؑ پر، اور قرآن پاک ہمارے پیغمبر حضور ﷺ پر نازل فرمایا۔

ورسلہ:

[۴] رسولوں پر ایمان لانا۔ حضرت آدمؑ کے زمانے سے لے کر حضور ﷺ تک مختلف ادوار میں موقع بموقع نبی آئے، جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے وحی لے کر آتے تھے، وہ اللہ کے بندوں تک اس وحی کو پہنچاتے تھے، اللہ کے بندوں کو وہ احکام سکھلاتے تھے۔ تو رسولوں کی رسالت اور نبیوں کی نبوت پر ایمان لانا۔ آخری نبی، نبی کریم ﷺ ہیں، آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ تو آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا۔

ان سب چیزوں پر ایمان لانا ہے، یہ ایمانیات کہلاتے ہیں۔ یہ ایمان کی جڑ ہیں، ان کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے، ان کے بغیر کوئی آدمی مؤمن نہیں بن سکتا ہے۔ اور خدانخواستہ اس میں ذرا بھی انیس بیس ہوگیا، تو آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے۔ شیطان ان ایمانیات کے متعلق وسوسے ڈالتا ہے۔

بعض نوجوان آتے ہیں کہ مولانا! ہم کو خیالات آتے ہیں۔ جب پوچھتے ہیں کہ بھائی! کیا خیالات آتے ہیں؟ نہیں مولانا! میں نہیں بول سکتا۔ ارے بھائی! بول تو سہی، تو بولے تو ہم اس کا کوئی علاج کریں۔ نہیں نہیں مولانا! میں بول ہی نہیں سکتا، میں انھیں زبان پر نہیں لاسکتا۔ اس کو کتنا ہی سمجھاؤ؛ لیکن وہ بولے گا ہی نہیں۔ وہی صحابہؓ والی بات کہ یتعاظم

أحدنا أن يتكلم به وہ خیال اتنا خطرناک ہے کہ ہم میں سے کوئی اس کو اپنی زبان پر لانا بہت گراں سمجھتا ہے۔

یہ کھلم کھلا ایمان ہے:

کبھی نعوذ باللہ! یہ خیال آتا ہے کہ اللہ میاں ہے بھی یا نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی آئے بھی کہ نہیں آئے؟ بعضوں کے دل میں نبیوں کے متعلق ایسا وسوسہ آتا ہے۔ یہ ایمانیات کے متعلق وسوسے ہیں۔ جب کسی دیندار آدمی کو ایسا وسوسہ آتا ہے، تو وہ گھبراتا ہے، روتا ہے۔ اور یوں سمجھتا ہے کہ میں تو ایمان سے نکل گیا۔ اور اس کو جب پوچھا جائے تو کہے گا کہ میری تکلیف ایسی ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ چناں چہ اس کے متعلق صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ لیا، دوسرے نمبر پر جو حدیث بیان کی تھی إن ناسا من أصحاب رسول الله ﷺ سألوا النبی ﷺ إنا نجد فی أنفسنا ما يتعاظم أحدنا أن يتكلم به. (ہم اپنے دلوں میں کچھ ایسی باتیں پاتے ہیں جن کو اپنی زبان سے بولنا اور ظاہر کرنا ہم کو بہت بھاری اور گراں معلوم ہوتا ہے)[۱] یا وہ روایت أحدث نفسي بالشيئ لأن أكون حممةً أحب إلي من أن أتكلم به[۲] (میں اپنے دل ہی دل میں کچھ باتیں کرتا ہوں، میں جل کر کوئلہ ہو جاؤں یہ مجھے زیادہ پسند ہے بنسبت اس کے کہ میں ان باتوں کو اپنی زبان سے بولوں) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیسا عجیب وغریب جواب دیا کہ ذاک صريح الإيمان. (یہ تو کھلم کھلا ایمان ہے) یعنی ایسا وسوسہ آنے پر تم کو جو تکلیف ہوئی اور تمہارا یہ احساس ہے کہ یہ زبان پر نہیں لاسکتے، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے دل میں ایمان موجود ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا

---

(۱) أخرجه مسلم: ۱۳۲.

(۲) السنن لأبي داود: ۵۱۱۲ ومشكوٰة المصابيح: ۷۳.

تو آپ اس کو زبان پر لانا بھاری نہ سمجھتے۔ اسی کو حضور ﷺ نے ایمان کی دلیل بتلایا۔

چور اُسی گھر میں جاتا ہے:

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے یہی شکایت کی۔ تو حضرت نے فرمایا کہ دیکھو بھائی! چور اسی گھر میں جاتا ہے، جہاں مال ہوتا ہے۔ مال نہیں ہوگا وہاں چور کیوں قدم رکھے گا؟ یہ شیطان تمہارے پاس وسوسہ ڈالنے کے لیے آیا، تو معلوم ہوا کہ تمہارے دل میں ایمان ہے، تبھی تو اس ایمان سے ہٹانے کی وہ کوشش کر رہا ہے۔ اسی کو گویا حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ دو باتیں ہیں: ایک تو شیطان کا اس طرح آ کر محنت کرنا اور دوسرا آپ لوگوں کا ان وسوسوں کو بھاری سمجھنا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے دل میں ایمان موجود ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو یہ خیال نہ آتا۔ جیسے کافروں کو ایسے خیالات نہیں آتے، خیالات تو کیا، بلکہ وہ تو زبان سے ایسی باتیں بولتے ہیں مگر ان کو کچھ بھاری معلوم نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ ایمان ہے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ ایمان نکل گیا، یہ درست نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو ایمان کی دلیل ہے۔ ہمارا عقیدہ اپنی جگہ پر ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صرف اس طرح کے خیالات سے ایمان نہیں جاتا۔

آ بیل مجھے مار:

البتہ ایک بات کہوں گا کہ ایمان ایک بہت قیمتی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی۔ اور کسی بھی آدمی کے پاس جب کوئی قیمتی چیز ہوتی ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو میں ہر طرح بچاؤں، اس کی حفاظت کروں۔ ہمیں اپنے ایمان کی حفاظت بہت محنت سے کرنی ہے، بہت دھیان سے (તકેદારી સે) ایمان کی حفاظت کے لیے بہت چوکنا رہنا

ہے۔ بہت سے لوگ غلط مضمون نگاروں (લેખક) کے مضامین پڑھتے ہیں۔ آج کل تو میڈیا پر مستقل ایسے پروگرام آتے ہیں اور لوگ ان پروگراموں کو دیکھتے ہیں سنتے ہیں، ارے بھائی! شیطان نے تو ہمارے ایمان پر حملہ کرنے کے لیے ہی یہ جاری کیا ہے اور ہم خود جا کر سنیں!!! گویا ہم اپنے ایمان کو خطرے کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ اس سے تو ہمیں اپنے ایمان کو بچانا ہے۔

ایمان سوز لٹریچر سے بچیے:

آج کل یہ ہو گیا ہے کہ جتنے بھی اخبارات ہیں، گجراتی اخبار: گجرات متر (ગુજરાત મિત્ર)، گجرات سماچار (ગુજરાત સમાચાર) سندیش (સંદેશ) ہیں۔ ان میں ایک دھارمک اضافیہ (ધાર્મિક પૂર્તિ) آتی ہے، تو اس کو A to Z پڑھ ڈالیں گے؛ لیکن ان کو کوئی دینی کتاب دیں گے، تو نہیں پڑھیں گے۔ إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ان کے پاس اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کو پڑھنے کی فرصت نہیں ہے، اور پیسے خرید کر ان اخبارات کو لے کر پڑھتے ہیں۔ اور یہ دین کی کتابیں اللہ کے بندے چھپواتے ہیں اور مفت تقسیم ہوتی ہیں، لوگ لے بھی لیتے ہیں؛ لیکن ان کو پڑھنے کی فرصت نہیں۔ آپ میں اکثر وہ ہوں گے جن کے پاس ایسی مفت کی کتابیں آئی ہوں گی، جن کو آج تک کبھی کھول کر بھی نہیں دیکھا۔ اور اخبار شوق سے دیکھیں گے۔ یہ سب کیا ہے؟ گویا ہم خود اپنے ایمان کو خطرے پر پیش کر رہے ہیں۔

امام محمد بن سیرینؒ کی احتیاط:

بڑے بڑے علما، بڑے بڑے تابعین اپنے ایمان کی کیسی حفاظت کرتے تھے؟

حیرت ہوتی ہے۔ امام محمد بن سیرینؒ جو خواب کی تعبیر کے امام ہیں، بہت بڑے تابعی تھے،ان کے پاس ایک مرتبہ گمراہ فرقہ سے تعلق رکھنے والے دو آدمی آئے۔-تابعین کے زمانہ میں ہی گمراہ فرقے پیدا ہو چکے تھے-انہوں نے آکر حضرت امام محمد بن سیرینؒ سے کہا کہ ہم آپ کو صرف ایک حدیث سنانا چاہتے ہیں،آپ نے انکار کیا، پھر انہوں نے کہا: ہمیں صرف قرآن کی ایک آیت سنانے دیجیے، بس! اس کے علاوہ ہم اپنی زبان سے کچھ نہیں بولیں گے۔ آیت سنا کر چلے جائیں گے۔توحضرت نے کہا: میں تمہاری زبان سے اس آیت کو سننا نہیں چاہتا،ان کے اصرار کرنے پر آپ نے فرمایا: یا تو تم یہاں سے چلے جاؤ یا پھر میں چلا جاتا ہوں۔ چناں چہ وہ دونوں چلے گئے۔ان کے جانے کے بعد کسی نے پوچھا کہ حضرت! وہ اگر چہ گمراہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے؛ لیکن انہوں نے تو ایک ہی بات کہی تھی کہ ہم آپ کو قرآن پاک کی صرف ایک ہی آیت سنانا چاہتے ہیں،تو قرآن کی آیت سننے میں کیا پرابلم تھا؟ تو اس پر حضرت نے کیا جواب دیا؟ ہم لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے۔ہم تو ان کے علم کے مقابلہ میں انگوٹھا چھاپ (ان پڑھ) ہیں،ان کا علم اتنا عظیم تھا کہ ان کے سامنے ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ **پھر بھی انہوں نے کیا جواب دیا؟ کہ ایک گمراہ عقیدے والے آدمی کی زبان سے قرآن پاک کی آیت سن کر ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت کے سلسلہ میں میرے دل میں کوئی اعتراض پیدا ہو جائے۔**[۱] اور ایسا اعتراض کہ بعد میں اس کا حل میری نگاہوں میں نہ ہو اور میں اس کی وجہ سے ایمان سے محروم ہو جاؤں۔اس لیے میں اس کی زبان سے یہ آیت بھی سننا گوارہ نہیں کرتا۔

---

(۱) نقله الدارمي عن سعيد بن عامر عن اسماء بن عبيد (سنن الدارمي: ۱/۱۲۱، ط: دار الكتاب العربي، بيروت).

ایسا نہیں کرنا چاہیے:

زبان- زبان کا بھی فرق ہوتا ہے۔ چیز ایک ہی ہے؛ لیکن ایک کی زبان سے اس کا اثر اور ہے، دوسرے کی زبان سے اس کا اثر اور ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ انہوں نے کتنی احتیاط برتی؟ اب ان کی اس احتیاط کے مقابلہ میں ہمارا کیا حال ہے؟ ہمارا حال تو یہ ہے کہ کھاتے ہیں اگڑم بگڑم، تو پڑھتے بھی ہیں اگڑم بگڑم! جو آیا پڑھ لیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے؛ بلکہ پڑھنے کے معاملے میں بھی پہلے تحقیق کرلو۔ ایسا نہیں کہ جو آیا پڑھ لیا، اخبار میں جو مضمون آیا پڑھ لیا۔ آج تو میڈیا نے یہ طے کرلیا ہے کہ مسلمانوں کو ان کے عقائد کے سلسلے میں ایسے شک وشبہ میں ڈالا جائے کہ دھیرے دھیرے وہ اپنے ایمان سے محروم ہوجائیں۔

ایمان سے محرومی کا سبب:

آج میڈیا کی جانب سے جو باتیں پھیلائی جارہی ہیں وہ سب گمراہ کن ہیں۔ جیسے طلاق کے سلسلے میں میڈیا جو باتیں چلاتا ہے، ان کو بہت سے لوگ سنتے ہیں، ان کے پاس اپنا تو کوئی علم ہے نہیں، اب سننے کے بعد ان میڈیا والوں نے اس پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ دل میں بیٹھ جاتے ہیں، پھر آ کر پوچھتا ہے کہ مولانا! ان سب سوالات کا کیا؟ ارے یہ سب اعتراضات تو، تو نے اپنے دل میں بٹھا لیے! یہ چیز تو ایمان سے محرومی کا سبب ہے۔ کیا ضرورت تھی اس کو سننے کی؟ کبھی کسی عالم دین کے پاس، کسی ماہر کے پاس جا کر کوئی اچھی بات سننے کی توفیق تو ہوئی نہیں، اور یہ سب سن رہے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ یہ سب چیزیں ایمان کو ختم کرنے والی ہیں۔ ہمارا ایمان معمولی نہیں ہے، بہت قیمتی چیز ہے، اس کی حفاظت کا تقاضا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا میں جو پروگرام

آتے ہیں، ان کو مت دیکھو، یا پرنٹ میڈیا میں جو مضامین آتے ہیں ان سے بچو، ان کو مت پڑھو۔ خبر پڑھ لی، ٹھیک ہے۔ مگر دین کی باتوں کو تو ہمیں اپنے معتبر علما سے سن کر اس کے مطابق یقین رکھنا ہے۔ آج تو کیا ہو گیا کہ ہر آدمی ہر آدمی کی بات سنتا ہے، پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتا ہے، اور پھر دھیرے دھیرے دین سے ہٹ جاتا ہے۔ اس لیے اپنی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ ان سب چیزوں سے بچو۔

حضور ﷺ کا غصہ:

مشکوٰۃ شریف میں ایک واقعہ ہے کہ حضور ﷺ کے پاس ایک مرتبہ حضرت عمرؓ توریت کا ایک نسخہ (copy) لے کر آئے۔ اب توریت تو آسمانی کتاب ہے؛ لیکن چوں کہ قرآن میں بھی آ گیا کہ ان لوگوں نے اس میں تحریف کر دی تھی، ادلا بدلی کر دی تھی (Perversions)۔ اس لیے اس کا بھروسہ نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو نسخہ حضرت عمرؓ لے کر آئے تھے وہ ایسا ہی تحریف والا تھا۔ حضرت عمرؓ نے لا کر کہا کہ اللہ کے رسول! یہ توریت کا نسخہ ہے۔ حضور ﷺ خاموش رہے، کچھ بولے نہیں اور حضرت عمرؓ نے اس کو پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ تو اندر دیکھ کر پڑھ رہے ہیں اور ادھر نبی کریم ﷺ کا چہرہ غصہ سے لال ہو رہا ہے۔ حضرت عمرؓ تو پڑھنے میں مشغول ہیں، ان کو پتہ نہیں ہے کہ حضور ﷺ غصہ میں ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ قریب ہی تھے، انہوں نے کہا: ثکلتک الثواکل یا ابن الخطاب! (اے ابن خطاب! رونے والی عورتیں تم کو روئیں) یعنی تم کو موت آوے۔ تم نہیں دیکھتے کہ حضور ﷺ کے چہرے کا کیا حال ہے؟ جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات کہی تو حضرت عمرؓ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو حضور ﷺ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ فوراً اس کو بند کیا اور کہا:

أعوذبالله من غضب الله ومن غضب رسوله رضينا بالله رباً و بالإسلام ديناً و بمحمد ﷺ نبياً. (میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کے غضب سے اور اس کے رسول کے غضب سے، میں اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور نبی کریم ﷺ کے اللہ کا نبی ہونے پر دل سے راضی ہوں) پھر حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر آج حضرت موسیٰؑ آ جائیں، اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرو تب بھی تم گمراہ سمجھے جاؤ گے، اور اگر میرے دورِ نبوت میں حضرت موسیٰ زندہ ہوتے، تو ان کو میری ہی پیروی کرنی پڑتی۔[1] آپ ﷺ نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ توریت تو آسمانی کتاب تھی؛ لیکن اس میں بھی تحریف ہوچکی تھی۔ اب آج کل کے رائٹر کی کتابوں کا کیا مطلب ہے؟

اس لیے دیکھو! جس کا علم گہرا ہو، جس نے دین کو سمجھ کر پڑھا ہو، دین کے سارے دلائل اس کے پاس موجود ہوں، وہ اگر ایسی کوئی چیز پڑھتا ہے تو پڑھے! پڑھ کر اس کی خرابیوں کا اس کو پتہ چلے گا تو وہ اس کا جواب تیار کرے گا، لوگوں کو بھی بتائے گا؛ لیکن جس کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے اس کی تو سلامتی اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو ان سے دور رکھے۔ الحاصل ایسے اسباب جن سے ایمان میں شک وشبہ پیدا ہوسکتا ہے، وسوسے آسکتے ہیں ان سے بھی اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

کھڑکی کھلی رہ گئی:

مچھر بہت ہوں تو لوگ کیا کرتے ہیں؟ عصر کے وقت سے کھڑکیاں بند کر دیتے ہیں، اور اگر ایک آدھ کھڑکی بھی کھلی رہ گئی تو کیا کہیں گے؟ یار! آج تو مچھروں نے سونے

---

(۱) أخرجه الدارمي: ۴۴۹ (ط: دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية).

نہیں دیا۔ کیوں بھائی ؟ تو کہیں گے : کھڑکی کھلی رہ گئی تھی ۔ تو آپ اس طرح کھڑکیاں کھلی رکھیں گے تو ایسا ہی ہوگا۔

یہ وسوسے کی پہلی قسم ہوئی کہ اگر وسوسے ویسے ہی آ گئے اور ہم ان کو برا سمجھ رہے ہیں تو ان کو برا سمجھنا یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے دل میں ایمان ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو برا نہیں سمجھے گا تو گیا ہاتھ سے۔ یہ وسوسے کی پہلی قسم کا حل ہے۔

(۲) گناہ اور فسق وفجور سے متعلق:

(۲) وسوسے کی دوسری قسم یہ ہے کہ گناہوں اور فسق وفجور کے وسوسے آئیں۔ یعنی آدمی کے دل میں خیال آئے کہ چوری کرلوں، شراب پی لوں، زنا کرلوں، قتل کرلوں۔ جو شخص اس لائن میں رہا ہو اور توبہ کر چکا ہو اس کو ایسے خیالات بہت آتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ ''چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے۔''

چناں چہ گناہوں اور فسق وفجور کے خیالات کے متعلق میں نے پہلی حدیث پڑھی تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں جارہی ہیں، آپ کے دل میں خیال آیا کہ میں دیکھوں، بدنگاہی کروں۔ دیکھنے کا خیال آیا، دیکھا نہیں؛ اپنے آپ پر کنٹرول کیا، اور نہیں دیکھا تو اس وسوسہ کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا: إن الله تجاوز لي عن أمتي ما وسوست به صدورها ما لم تعمل أو تكلم (اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری امت سے معاف کردیا ان چیزوں کو جن کے ان کے دلوں میں وسوسے آتے ہیں، جب کہ وہ ان پر عمل نہ کریں)[۱] جیسے کسی کو دیکھنے یا زنا کرنے کا خیال آیا کہ میں فلاں عورت سے زنا کروں؛ لیکن اپنے آپ کو اس سے روکا اور زنا نہیں کیا۔ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، دل نے چاہا کہ ذرا

---

(۱) أخرجه البخاري: ۲۵۲۸.

فلاں کی برائی کرلوں، لیکن اپنے آپ کو روک دیا، کنٹرول کرلیا، تو محض اس خیال سے گناہ نہیں ہوگا جب تک اس کو اپنی زبان سے ادا نہ کریں۔ **بولنے کی چیز ہے اور بولوگے تو گناہ ہوگا، کرنے کی چیز ہے کروگے تو گناہ ہوگا۔ کرنے کا گناہ تھا، نہیں کیا تو گناہ نہیں، بولنے کا گناہ تھا، نہیں بولے تو گناہ نہیں۔ چناں چہ یہ فسق وفجور کے خیالات کا حل ہے۔**

......تو کوئی گناہ نہیں:

کون ایسا ہے جس کو گناہ کا خیال نہ آتا ہو؟ کوئی بڑے سے بڑا بزرگ بھی ہوگا تو اس کے دل میں بھی خیالات اور وسوسے تو آئیں گے۔ دوسری حدیث حضرت ابن عباسؓ کی پیش کی: أن رجلاً سأل النبی ﷺ أحدث نفسي بالشيئ لأن أكون حممةً أحب إلي من أن أتكلم به. (ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: میں اپنے جی میں کچھ باتیں کرتا ہوں، میں جل کر کوئلہ ہوجاؤں یہ مجھے زیادہ پسند ہے بنسبت اس کے کہ میں ان باتوں کو اپنی زبان سے بولوں)[۱] جیسے بعضوں کے دل میں چکر چلتا ہے کہ فلاں عورت سے صحبت کا موقع مل جائے تو مزہ آجائے، یہ دل میں خیال آیا، غیر اختیاری خیال بھی آتا ہے۔ اسی طرح کسی کو چوری کی عادت رہی ہو اور توبہ کرچکا ہو تو اب خیالات آتے ہیں کہ فلاں جگہ بڑا اچھا مال ہے، فلاں مول (Mall)، شوروم میں ہاتھ مارنے کا بڑا اچھا موقع ہے، ذرا مار لینا چاہیے۔ یہ صرف دل میں خیال آیا اور اس سے اپنے آپ کو روکا، عمل نہیں کیا تو کوئی گناہ نہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ......:

جو شخص نیکی میں مشہور ہو جیسے میں کہوں کہ میرے دل میں خیال آیا کہ فلاں عورت

---

(۱) السنن لأبي داود: ۵۱۱۲ ومشكوٰة المصابيح: ۷۳.

کو دیکھوں، یا کوئی اور آدمی جو نیکی میں مشہور ہے، کیا کسی کے سامنے ایسے خیال کا اظہار کر سکتا ہے؟ اپنے پکے اور لنگوٹیے دوست کے سامنے بھی اظہار نہیں کرے گا۔ یہ تو وہ جانے اور اللہ جانے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ بولوں گا تو وہ کہے گا کہ ایسے ہی بزرگ بنا پھرتا ہے!!! حاصل یہ ہے کہ ایسے خیال پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الحمد لله الذی رد أمرہ إلی الوسوسة (اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس کا معاملہ وسوسے تک رکھا)[۱] یعنی شیطان تو آیا تھا؛ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

دیکھیے! شیطان صرف وسوسہ ڈالنے کے لیے نہیں آتا؛ بلکہ وہ تو اس لیے آتا ہے کہ میں اس کے پاس یہ کام کروا کر ہی جاؤں گا؛ لیکن اس نے شیطان کا اتنا تو مقابلہ کیا کہ وہ کام اس نے نہیں کیا۔ وسوسہ سے تو اپنے آپ کو بچا نہیں سکا؛ لیکن اس کام سے اس نے اپنے آپ کو بچالیا۔

اثر یکساں نہیں ہوتا:

دیکھیے! جیسی چیز ہوتی ہے اثر بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اثر کرنے والے کا اثر، اور جو چیز اس کا اثر قبول کرتی ہے دونوں سے بڑا فرق پڑتا ہے۔[۲] جیسے ایک بڑا پتھر لے کر آپ نے مارا، سامنے اگر شیشہ ہے تو چکنا چور ہو جائے گا۔ اور اگر شیشہ نہیں؛ بلکہ کوئی اور خوب صورت چیز ہے، تو وہاں نشان پڑ جائے گا؛ لیکن وہ ٹوٹے گا نہیں۔ یا جیسے دوپہر کی سخت گرمی ہے، جون کی گرمی ہے، اوپر سے سورج کی شعاعیں آتی ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ پتھر ہے تو گرم ہو جائے گا،

---

(۱) السنن لأبی داود: ۵۱۱۲ ومشکوۃ المصابیح: ۷۳.

(۲) حجة اللہ البالغة: ۱/ ۲۸۲ (ط: دار الجیل، بیروت، لبنان).

اور اگر پیتل ہے تو اور زیادہ گرم ہوگا۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ پیتل کا بھیجا ہے، بہت جلدی گرم ہوجاتا ہے۔ لکڑی ہے تو وہ بھی گرم ہوجائے گی، یہاں تک کہ یہ زمین، مٹی وہ بھی گرم ہوتی ہے؛ لیکن پتھر زیادہ گرم ہوگا، پیتل اس سے زیادہ گرم ہوگا، لکڑی ان سے کم گرم ہوگی۔ مٹی گرم ہوتی ہے تو اس پر ہم جیسے شہر میں رہنے والے جو کھلے پاؤں چلنے کے عادی نہیں ہوتے، نہیں چل پاتے۔ دیہات والے تو چل لیتے ہیں۔ جیسی جگہ اس کے مطابق اثر ہوتا ہے۔ اور پتھر کی ایک قسم وہ بھی ہے جو کسی قسم کا اثر قبول نہیں کرتی، آپ حج وعمرہ کرنے گئے ہوں گے، وہاں مطاف میں سفید پتھر لگے ہوئے ہیں، وہ مصنوعی (artificial) نہیں ہیں، قدرتی ہیں، ایسا پہاڑ اللہ نے پیدا کیا ہے جو سورج کی شعاؤں کو اپنے اندر جذب ہی نہیں ہونے دیتا، ٹھنڈا ہی رہتا ہے، ان شعاعوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے ہی شیطان آدمیوں پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اب آدمی آدمی میں فرق ہے، کوئی پیتل جیسا، کوئی لوہے جیسا، کوئی پتھر جیسا، کوئی لکڑی جیسا اور کوئی حرم میں لگے ہوئے مرمر کے پتھر کی طرح ہوتا ہے۔ ورنہ شیطان تو آتا ہے، اور پورے حوصلے کے ساتھ آتا ہے کہ اس سے تو میں یہ کام کروا کر ہی جاؤں گا۔ زنا کروا کر ہی جاؤں گا؛ لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ دل میں صرف وسوسہ آیا تو اس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الحمد لله الذي رد أمرهٗ إلى الوسوسة. (اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس معاملہ کو وسوسہ تک رکھا)۔

جان تو بچ گئی:

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھو کہ کسی کے گھر پر رات کو چوروں نے حملہ کیا، خوب پٹائی کی، ٹانگیں توڑ ڈالیں، ہاتھ توڑ ڈالے، وہ اسپتال میں داخل ہے، آپ اس کی عیادت

کے لیے گئے اور پوچھا کہ بھائی! کیا حال ہے؟ تو کہتا ہے کہ الحمدللہ! جان بچ گئی۔ یہ الحمدللہ کس چیز پر ہے؟ تیری ٹانگیں ٹوٹ گئیں، تیرا ہاتھ ٹوٹ گیا!! تو وہ کہتا ہے: ٹانگیں اور ہاتھ ٹوٹ گئے اس کا تو علاج ہو جائے گا، جان تو بچ گئی۔ چناں چہ صرف وسوسہ آیا؛ لیکن وہ کام نہیں کیا، تو بہت سی مرتبہ اللہ تعالیٰ خالی وسوسہ کے ذریعہ سے ہم کو بچا لیتے ہیں۔

بانیکاں بنشیں:

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ مولانا! دعا کیجیے نا! یہ برے برے خیالات آویں ہی نہیں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ارے اللہ نے انسان کو پیدا ہی ایسا کیا ہے، تبھی تو انسان کا کمال ہے کہ اس میں گناہ کی صلاحیت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس سے بچاتا ہے۔ یہ دوسری قسم جس میں گناہوں اور فسق وفجور کے خیالات آتے ہیں، ان میں اپنے آپ پر کنٹرول کیا تو ان خیالات کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ بہت سے لوگ ایسے خیالات کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں۔ البتہ یہ ضرورت ہے کہ ایسے خیالات بھی نہیں آنے چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں اپنا ماحول سدھارنے کی ضرورت ہے۔ بہت سے لوگ دین دار ہوتے ہیں؛ لیکن پھر بھی تھوڑی دیر چاشنی حاصل کرنے کے لیے دوسری پارٹی میں بیٹھ جاتے ہیں، اور وہاں باتیں ہونے کی وجہ سے اس کا دماغ بھی ٹک ٹک کرتا ہے کہ ان کی بات تو صحیح ہے، ذرا ایک مرتبہ ان کے ساتھ چوپاٹی پر ہو آویں۔ بھائی! آپ کو تو اس ماحول میں جانا ہی نہیں تھا۔ جیسے میں نے کہا کہ ہمیں اپنے ایمان اور اپنے نیک عمل کی حفاظت ہیرے جواہرت سے زیادہ کرنی ہے۔ نہ ایسے آدمیوں کی صحبت میں رہو، نہ ایسا ماحول اختیار کرو، ہر برائی سے اپنے آپ کو دور رکھو۔

بہر حال! یہ وسوسہ کی دوسری قسم ہے، اس کا حکم بھی یہی ہے کہ ہم اس کے تقاضہ پر عمل نہ کریں۔ لیکن یادرکھنا! آدمی اگر اپنا ماحول نہیں بدلے گا تو پھر دھیرے دھیرے وہ پھنس ہی جائے گا، اور اس کا نظریہ بدل جائے گا۔

(۳) بے موقع وسوسہ:

(۳) وسوسہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ وہ وسوسہ تو ہے؛ لیکن گناہ کا نہیں ہے۔ بلکہ بے موقع آیا۔ اللہ أکبر کہہ کر نماز کی نیت باندھی، اور پہنچ گئے دکان پر۔ تو دکان کا خیال کوئی گناہ کا خیال نہیں ہے۔ گھر میں پہنچ گئے، بیوی کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں، اور الحمد بھی پڑھی جارہی ہے، تو بیوی کے ساتھ باتیں کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں ہے؛ لیکن وہ نماز میں ہو رہا ہے، بے موقع ہو رہا ہے۔ یہ تیسری قسم ہے۔ اس سے بھی لوگ بہت پریشان ہیں۔ اور اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ہم نے اپنی نماز پر جو محنت کرنی چاہیے تھی وہ نہیں کی ہے۔ نماز میں ایسے خیالات نہ آویں، یہ مفت میں نہیں ہوگا۔ اس دھیان کے لیے محنت کرنی پڑے گی، نماز میں جو پڑھا جارہا ہے اس کی طرف توجہ کرنی پڑے گی۔

نماز؛ ایک شیڈیول:

نماز کا ایک شیڈیول ہے۔ آپ استنجا کرتے ہیں، اس کے بعد وضو کرتے ہیں، اس کے بعد فرض نماز سے پہلے سنت پڑھتے ہیں، پھر فرض پڑھنے تک کا پورا پروگرام ہے۔ آپ دعوت کھانے جاتے ہیں، تو شاندار قسم کی دعوتوں میں کیا ہوتا ہے؟ پہلے سوپ آیا، وہ ابھی تھوڑا سا چکھا کہ کچھ اور آیا۔ ایک ساتھ سب نہیں آتا، دھیرے دھیرے لایا جاتا ہے، وہ

آپ کی بھوک کو کھولنا چاہتے ہیں۔اسی طرح نماز کی بھی شریعت نے ایک ترتیب رکھی ہے۔
ہمارا حال کیا ہے؟ اذان تو کب سے سن لی ہے، اب اگر ہم اذان سنتے ہی تیاری کر لیتے ، یا اذان سے پہلے ہی تیاری کر لیتے تو آسان تھا؛ لیکن اذان سننے کے بعد بھی بیٹھے رہیں گے۔ پانچ دس منٹ باقی ہے اس وقت آئے، اب پیشاب کا تقاضہ ہے، تو سیدھے استنجا خانہ میں چلے گئے، یہاں نماز کھڑی ہوگئی، اور ابھی تو قطرے بند ہوئے بھی نہیں کہ پانی ڈال دیا۔

شیطان بڑا اچٹور یا ہے:

باقی رہنے والے قطروں کا مستقلاً مسئلہ ہے، اہل علم سے پوچھو، جب تک مکمل طور پر قطرہ نکلنا بند نہ ہو جائے تب تک پانی ڈالنا درست نہیں ہے۔ اس کو استبراء کہتے ہیں، یعنی پیشاب پوری پوری نکل جائے۔ آدھی نکلی اور آدھی باقی رہی اور پاجامہ پہن لیا تو پاجامہ بھی ناپاک ہوگا، جب پاجامہ ناپاک ہے تو نماز کہاں درست ہوئی ؟ یہ بھی ایک شیڈیول ہے، ہمیں اس کو اپنانا ہے۔تو شیطان کے وسوسوں کی شروعات یہیں سے ہوتی ہے کہ شیطان خود ناپاک ہے، اور ہم نے ناپاکی شروع سے ہی رکھی، تو شیطان کو وسوسے ڈالنے کا مزید موقع مل گیا۔شیطان بڑا اچٹور یا ہے، اس کو یہ گندگی بہت اچھی لگتی ہے۔ اس لیے ہمیں استنجاء کے معاملے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔وہ احتیاط بھی نہیں جو وہم والے کرتے ہیں کہ ایک ایک گھنٹہ تک ختم نہ ہو، لیکن شریعت کی حد میں رہ کر احتیاط رکھنا ہے۔

وضو میں اسراف؛ خشوع ختم:

ہمارے وضو کے طریقے، اللہ کی پناہ!!! باتیں ہو رہی ہیں، نل کھول دیا ہے، پانی

گرتا جارہا ہے۔ آپ کتابوں میں پڑھیے! **وضو میں ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنا جس کو پانی کی فضول خرچی کہتے ہیں، اگر یہ پانی اپنا ہو تو مکروہ تحریمی ہے اور مسجد کا ہو تو حرام ہے۔** مسجد کا پانی وقف ہے، ہمیں اتنا ہی پانی استعمال کرنے کی اجازت ہے، جس سے ہمارا وضو ہو جائے، اور ہم نل کھول کر بیٹھے ہیں، باتیں کر رہے ہیں۔ وضو شروع کرنے سے پہلے دس بالٹیاں پانی تو ویسے ہی ضائع ہو جاتا ہے۔

پانی کے ضیاع اور بربادی کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ آدمی کی نماز سے خشوع اور خضوع نکل جاتا ہے۔ **پانی کے بے جا استعمال کو خشوع کے نکالنے میں بڑا دخل ہے۔** جس نماز کی شروعات ہی حرام کام سے ہوئی وہ نماز کیسی ہوگی؟ اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ نماز میں پڑھنا شروع کریں تو ہمیں اپنا دھیان پڑھنے میں لگانا چاہیے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ اللہ اکبر کہا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹیپ ریکارڈ کی سوئچ آن کر دی، ادھر ہماری زبان چل رہی ہے سبحانک اللھم وبحمدک الخ۔۔۔اور دل کہاں گھوم پھر رہا ہے؟ کہاں باتیں ہو رہی ہیں؟ کہیں چائنا خریدی کرنے جانا تھا تو اسی نماز میں پورا سفر بھی ہو گیا۔ یہ کیا ہے؟ نماز میں دھیان لگانے کے لیے جو محنت کرنی تھی وہ آج تک کبھی ہم نے کی ہی نہیں۔

لگے رہو......:

ابھی میری تقریر سنی تو ہر ایک کو دل میں خیال آئے گا کہ یار! بات تو صحیح ہے، نماز میں دھیان لگانا چاہیے۔ تو اب کیا کریں گے؟ اب تو میں صبح کی نماز بہت دھیان لگا کر پڑھوں گا۔ اب نیت باندھی اور اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (الفاتحۃ:۱) پڑھا، بہت دھیان سے پڑھا۔ اور الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ. (الفاتحۃ:۲) پڑھے اتنی دیر میں تو گاڑی پٹری سے اتر گئی۔ کہاں دھیان چلا

گیا وہ بھی یاد نہیں رہا، ایسا دھیان گیا کہ ساری نماز پوری ہوگئی تو بھی یاد نہیں آیا، دو دن کے بعد یاد آیا کہ ارے! نماز تو دھیان سے پڑھنی تھی۔ آج سے دو دن پہلے خیال آیا تھا وہ اب آیا، کوئی بات نہیں! آپ لگے رہو۔ بھول ہوگئی، ٹھیک ہے۔ آج یہ ہوگا کہ الرحمٰن الرحیم تک گاڑی پٹری پر رہی۔ پھر مٰلك یوم الدین آیا اور اتر گئی؛ لیکن آپ لگے رہو۔۔۔۔۔ لگے رہو۔۔۔۔۔ ایک دن آئے گا کہ آپ کا دھیان نماز میں لگ جائے گا۔

من جدّ وجد:

ہر چیز کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ ایک آدمی بڑا تاجر ہے، اس کی بڑی دکان ہے تو کیا ایک دن میں وہ بڑا تاجر بن گیا؟ دکان بن گئی؟ نہیں۔ نوساری کے ہمارے ایک ملنے والے دوست تھے، ان کی کپڑے کی بڑی اچھی دکان تھی، وہ اپنا واقعہ بڑے شوق سے بیان کرتے تھے کہ مولانا! میں تو پہلے وہاں فٹ پاتھ کے اوپر پتھارا لگا کر ماچس بیچتا تھا۔ اس کے بعد یوں ہوا۔۔۔ اس کے بعد یوں ہوا۔۔۔۔

یہ امبانی پہلے دن میں بن گیا؟ نہیں، اس نے معلوم نہیں کتنی محنتیں کی ہوں گی۔

حاصل یہ ہے کہ دنیا ہو یا کوئی اور چیز ہو، آپ کو محنت کے بغیر ملتی نہیں ہے۔ تو نماز میں جی لگانے کے لیے محنت کرنی پڑے گی، جو آج تک ہم نے نہیں کی۔ ہم تو یوں چاہتے ہیں کہ بس ایک ہی دن میں ہمارا ایسا جی لگے کہ ہم ساتویں آسمان پر پہنچ جائیں۔ نہیں بھائی! ساتویں آسمان پر پہنچنا آسان نہیں ہے۔

آدمی کا ذہن کیسا بنا ہے؟ کوئی چیز آدمی کے شوق کی ہو، جیسے آپ کو کرکٹ کا شوق ہے اور اخبار میں کرکٹ کی تفصیل آئی ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ اس تفصیل کے پڑھنے کے

دوران کوئی دوسرا خیال بھولے سے بھی آپ کو نہیں آئے گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ کسی چیز کو پڑھنے کے لیے جتنا دھیان دینے کی ضرورت ہے، وہ ۱۰۰% دھیان آپ اس وقت لگا رہے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کے شوق کی چیز ہے، اس میں آپ کا دھیان لگتا ہے تو دوسرا خیال آئے گا ہی نہیں۔ اور جو چیز آپ کے دھیان کی نہیں ہے، جیسے قرآن لے کر بیٹھے، آپ کا جی نہیں لگتا تو ہماری توجہ کے سو (۱۰۰) حصے ہیں، ان میں سے ۱۰ حصے قرآن کی پڑھائی میں لگے ہیں تو باقی کے ۹۰ بے کار نہیں رہیں گے، وہ اپنی جگہ ڈھونڈیں گے، چناں چہ اس میں دوسرے خیالات آئیں گے۔ اس لیے ہمیں محنت کرنی ہے اور کرتے کرتے 100 فی صد ہمارا دھیان نماز میں آجائے تب تک ہم چین سے نہ بیٹھیں۔ پھر کوئی خیال نہیں آئے گا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست:

ایسے خیالات کی وجہ سے نماز ٹوٹتی تو نہیں ہے؛ لیکن ان سے غافل بھی نہیں ہونا چاہیے، اور پریشان بھی نہیں ہونا چاہیے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ میری نماز کیا ہے؟ خالی اٹھک بیٹھک ہے، خالی سر ٹکرانا ہے۔ ارے بھائی! سر ٹکرانا ہے تب بھی کیا ہوا؟ اللہ نے آپ کو اپنے دربار میں حاضری کی توفیق دی، تو اس کا شکر ادا کرو، بہت سارے وہ ہیں جن کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ نے ہم کو توفیق دی اس معنیٰ کر یہ بڑی سعادت کی چیز ہے۔ البتہ اس کے لیے جتنی محنت کرنی چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی، یہ ہماری کمزوری ہے، ہمارا فولٹ (fault) ہے اس کو ہمیں دور کرنا ہے۔

من آنم کہ من دانم:

بہر حال! ان خیالات کی وجہ سے اگر چہ نماز نہ ٹوٹے؛ لیکن ہمیں کوشش یہی کرنی

چاہیے کہ اس کی بھی نوبت نہ آنے پائے۔اور کوشش کے باوجود خدانہ کرے، خدانہ کرے خیالات آتے ہیں، تو اس کی وجہ سے-ان شاءاللہ- نماز فاسد نہ ہوگی، ہمارا فریضہ ادا ہو جائے گا۔ ہماری ایسی نماز جس میں دو منٹ بھی ہمارا دھیان نہیں ہوتا، اس کے باوجود ہم دوسروں کو کتنا حقیر سمجھتے ہیں!! اللہ نے دو رکعت پڑھنے کی توفیق دی؛ حالاں کہ وہ دو رکعت کیسی ہیں، وہ تو ہم ہی جانتے ہیں! اللہ جانتا ہے! لیکن دو رکعت پڑھ کر دوسروں کو ہم حقیر سمجھتے ہیں کہ میں کچھ ہوں، میں بڑا اچھا ہوں، مجھ جیسا کوئی نہیں۔اب جس نماز کو پڑھ کر دوسروں کی تحقیر آئے آپ بتائیے! پھر کیا ہوگا؟

بہر حال! نماز میں خیالات کی یہ تین چیزیں تھیں، اس میں اور بھی بہت کچھ تفصیل ہے، مختصر طور پر آپ کو بتادیا۔اس سلسلہ میں محنت کرو، نماز میں دھیان لگاؤ، اللہ سے دعائیں کرو، شیطان سے بچنے کے لیے بھی سورۂ ناس پڑھتے رہو، اس کے شر اور اثرات سے بچنے کے لیے بار بار اس کو پڑھو۔ایسا ماحول، ایسی چیزیں جن کی وجہ سے یہ برائیاں آسکتی ہیں ان سے اپنے آپ کو دور رکھو ان شاء اللہ ایمان کی بھی حفاظت ہوگی، اور اعمال کو بھی صحیح طریقہ سے انجام دینے کی توفیق ہوگی۔

اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۂ اخلاص

(مؤرخہ: ۱۷/شوال المکرم ۱۴۳۹ھ مطابق ۳۰/جون ۲۰۱۸ء شبِ یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم۝

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢ لَمۡ يَلِدۡ ۙ وَ لَمۡ يُوۡلَدۡ ۝٣ وَ لَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝٤

یہ سورۂ اخلاص ہے، اس میں چار آیتیں ہیں۔ اور راجح قول کے مطابق مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔ جس وقت اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا تو پورے عرب؛ بلکہ پوری دنیا میں لوگ بت پرستی میں مبتلا تھے، اپنے ہاتھوں سے بتوں کو بناتے تھے، پتھر کے بت، لکڑی کے بت اور دیگر اشیاء کے، اور پھر ان ہی کی عبادت کرتے تھے، انھی کو اپنا حاجت روا اور کارساز سمجھتے تھے۔ ایسے ماحول میں نبی کریم ﷺ نے آ کر لوگوں کو ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دی۔

عقیدۂ توحید:

توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو توحید کی طرف بلایا اور کہا: ایک اللہ کی عبادت کرو، اسی کی اطاعت وفرماں برداری کرو، اسی کے احکام کو اپناؤ۔ چناں چہ وہ لوگ جس ماحول میں تھے، اس اعتبار سے ان میں سے بعض کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اوران لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات عالی کے متعلق کچھ ناروا اور نامناسب سوالات کیے۔

شانِ نزول:

(۱) دو آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، اورانھوں نے سوال کیا کہ آپ جس خدا کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں -نعوذ باللہ- وہ کس سے بنا ہے؟ سونے سے؟ چاندی سے؟ لوہے سے؟ لکڑی سے؟ تو ان کے اسی سوال کے جواب میں یہ سورت اللہ تبارک وتعالیٰ نے نازل فرمائی۔[۱] اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اپنا تعارف کرایا ہے۔

(۲) بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے اللہ تبارک تعالیٰ کے حسب ونسب کے متعلق سوال کیا۔ دنیا میں ہم جب کسی آدمی کا تعارف اور پہچان کرنا چاہتے ہیں، تو پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو؟ تمہارا باپ کون ہے؟ تمہارا خاندان کیا ہے؟ چناں چہ بعض لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات عالی کے متعلق اسی

---

(۱) أخرجه أبو الشيخ في العظمة عن أنس رضی اللہ عنہ ۱/ ۳۷۰ [۸۲] (ط: دار العاصمة، الرياض).

طرح کے سوال کیے۔ اس کے جواب میں اللہ تبارک تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔[۱]

واحد اور احد میں فرق:

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔

اے نبی! آپ کہہ دیجیے! ان لوگوں کو بتلائیے! کہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے ایک ہے۔

یہاں اللہ احد کہا۔ حضرات مفسرین اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ لفظ واحد استعمال نہیں کیا، لفظ احد استعمال کیا، بظاہر لفظ واحد اور احد میں ہمیں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا؛ لیکن حضرات مفسرین لکھتے ہیں کہ لفظ "واحد" اثنین، ثلثة اور اربعة، دو، تین، چار کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ ایک سے مافوق تمام اعداد کے مقابلہ میں واحد یعنی ایک بولا جاتا ہے۔ اور احد اس ذات کے لیے بولا جاتا ہے، جس کا کوئی جز نہ ہو۔[۲] بعض مرتبہ کوئی چیز ایک تو ہوتی ہے؛ لیکن وہ مختلف اجزاء سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ جیسے کرسی ہے، اس کے پائے ہیں، دستہ ہے، بیٹھنے کی جگہ ہے، پیچھے ٹیک لگانے کی جگہ ہے، کئی چیزوں، اجزاء اور پارٹس (parts) کے مجموعہ سے تیار ہوئی ہے۔ تو یہ واحد تو ہے؛ لیکن اس کو احد نہیں کہیں گے۔ احد اسی کو کہیں گے جس کا کوئی جز نہ ہو، جو بسیط ہو۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے لفظ احد استعمال کیا، گویا اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے ایک ہے۔ وہ لوگ تو کئی معبودوں کے قائل تھے۔ وہ تو ہیں ہی نہیں؛ لیکن اللہ کی ذات کی وحدانیت ایسی ہے کہ اس کا کوئی جز بھی نہیں ہے، اجزاء سے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پاک اور منزّہ ہے۔

---

(۱) أخرجه الترمذي في سننه: ۳۳۶۴ (ط: مصطفیٰ البابي الحلبي، مصر) و البخاري فی التاريخ الكبير: ۱/ ۲۴۵ [۷۷۸] (ط: دائرة المعارف العثمانية، حيدر آباد، دكن).

(۲) النهاية فی غريب الحديث و الأثر لابن الأثير: ۱/ ۲۷ (ط: دار المكتبة العلمية، بيروت).

عربی زبان میں مترادف نہیں:

اَللّٰہُ الصَّمَدُ

عام طور پر الصمد کا ترجمہ بے نیاز کرتے ہیں، لیکن حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ بے نیاز والا ترجمہ صمد کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ عربی زبان ایسی عجیب وغریب زبان ہے کہ اس کے کلمات جس مفہوم کو ادا کرتے ہیں، اس مفہوم کو مکمل طور پر ادا کرنے کے لیے بسا اوقات ہماری اردو زبان میں کوئی ایک لفظ نہیں ہوتا۔ اسی لیے بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں کوئی مترادف (ہم معنیٰ لفظ synonym) نہیں ہے۔ دو لفظ ہیں، لوگ تو یوں سمجھتے ہیں کہ جو مطلب اس کا ہے وہی مطلب دوسرے کلمہ کا بھی ہے، دونوں کلمے بظاہر ایک مفہوم اور معنیٰ کو ادا کرتے ہیں؛ لیکن جب ان کے مفہوم میں غور کیا جاتا ہے، تو ہر ایک کے مفہوم میں کوئی ایک بات ایسی ہوتی ہے، جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔ کوئی بھی کلمہ دوسرے کلمہ کے ساتھ من کل الوجوہ مترادف نہیں ہوتا۔ مترادف ایسے کلمے کو کہتے ہیں کہ دوسرا کلمہ اسی مفہوم اور اسی مطلب کو ہو بہو ادا کرتا ہو، چناں چہ عربی کے ہر کلمہ میں کچھ ایسی بات ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں ہوتی۔ لیکن اس پہلو کو چھوڑ کر لوگ اکثری اعتبار سے مترادف کہتے ہیں؛ لیکن حقیقۃً وہ مترادف نہیں۔

صمد کا معنیٰ:

آگے لفظ صمد مذکور ہے، صمد عربی زبان میں ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ تمام مخلوقات اپنی ضرورتوں میں اس کی محتاج ہوں اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ دونوں باتیں ہیں: وہ کسی کا محتاج نہیں، اور سب اس کے محتاج ہیں۔ اب حضرت مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم

فرماتے ہیں کہ جب ہم ترجمہ کرتے ہیں بے نیاز، تو بے نیاز کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں؛ لیکن ''سب اس کے محتاج ہیں'' وہ معنیٰ اس ترجمہ میں نہیں آیا۔ گویا لفظ بے نیاز سے جب لفظ صمد کا ترجمہ کیا جائے گا، تو کلمۂ صمد کا جو مفہوم ہے وہ پورے طور پر ادا نہیں ہوتا؛ بلکہ اس میں کمی رہ جاتی ہے۔ اور یہاں وہی بتلانا مقصود ہے کہ تمام مخلوقات اپنی تمام ضرورتوں میں اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ چناں چہ حضرت مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم اس کا ترجمہ اسی طرح کرتے ہیں: اللہ ہی ایسا ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔[۱] یہاں الصمد کا ترجمہ انہوں نے بے نیاز نہیں کیا؛ بلکہ کلمۂ الصمد کا مقصود ادا کیا۔ تو اس میں ان لوگوں کا جواب آ گیا کہ اللہ تعالیٰ نہ تو سونے سے بنے ہیں، نہ تو چاندی سے بنے ہیں۔ اس لیے کہ اگر کوئی چیز سونے سے بنتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سونا پہلے وجود میں آیا، اور وہ چیز اپنے بننے میں سونے کی محتاج ہے۔ اگر چاندی سے بنی ہوئی ہے، تو گویا پہلے چاندی کا وجود ہوا، اور وہ چیز جو چاندی سے بنی ہے اپنے بننے میں، اپنے وجود میں چاندی کی محتاج ہے۔ تو احتیاج ثابت ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کی ذات تو بے نیاز ہے!!! گویا اللہ کسی کا محتاج نہیں، اور سب چیزیں اس کی محتاج ہیں یہ کہہ کر دونوں طرف سے ایسا مفہوم بتلایا گیا کہ اب اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو انہوں نے قائم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کس سے بنے ہیں؟ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

نہ جنا، نہ جنا گیا:

لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ.

---

(۱) توضیح القرآن آسان ترجمۂ قرآن از حضرت عثمانی دامت برکاتہم۔

نہ اللہ نے کسی کو جنا، یعنی نہ اللہ کی کوئی اولاد ہے **ولم یولد** نہ اللہ جنا گیا، یعنی اللہ کسی کی اولاد نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بھی اولاد نہیں۔ جو سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا حسب و نسب کیا ہے؟ اللہ کا نسب بتلاؤ۔ ان کے باپ کون ہیں؟ دادا کون ہیں؟ تو کہا: اللہ تعالیٰ کسی سے پیدا ہی نہیں ہوئے۔ اب عربوں میں یا بعض اور دینوں میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے، جیسے خود عرب کے لوگ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ تو **لم یلد** (اللہ نے کسی کو نہیں جنا) سے اس کی نفی ہوگئی۔ یا جیسے عیسائی ہیں، حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ و السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، **لم یلد** کہہ کر اس کی بھی نفی ہوگئی۔ اور اسی طریقے سے یہودی حضرت عزیر علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اس کی بھی نفی ہوگئی۔ اللہ نے کسی کو نہیں جنا۔

وَ لَمْ يُوْلَدْ (اور نہ وہ کسی سے جنا گیا) تو اس سے ان لوگوں کی الوہیت کی بھی نفی ہو گئی، جب یہ لوگ دوسروں سے پیدا ہوئے ہیں، تو وہ معبود اور خدا نہیں بن سکتے۔

اس کا ہمسر کوئی نہیں:

وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (اور کوئی بھی اس کے جوڑ کا اور ہم سر نہیں ہے)

کفو اس کو کہتے ہیں کہ دو شخصیتوں کا اپنے کمالات و اوصاف میں ایک دوسرے کے برابر ہونا۔ کوئی کسی چیز میں کسی سے کم نہ ہو۔ اس عالم میں اور کائنات میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی برابری کا دعویٰ کر سکے۔ گویا کوئی اللہ کے جوڑ اور برابری کا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان تنہا اور یکتا ہے۔ کسی صفت و خوبی اور کمال میں کوئی اللہ کے مشابہ نہیں ہوسکتا، اس کی نفی ہوگئی۔

دو چیزیں خاص طور پر ہیں: احدیت اور صمدیت۔ اللہ اکیلا ہے اور کوئی اس کے

مشابہ نہیں ہے، کوئی اس جیسا نہیں ہے، کسی میں وہ کمالات نہیں ہیں جو اللہ کے اندر ہیں، اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، اللہ ہی عبادت کے لائق ہیں۔ اور صمد کا مطلب یہ ہے کہ سب لوگ اس کے محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ اور اخیر میں کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے کہہ کر اس کفو کی بھی نفی کر دی ہے۔ **اس طرح اس سورت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے وہ صفات اور کمالات بیان کیے گئے ہیں کہ کوئی دوسرا اس میں اللہ تعالیٰ کا شریک اور ساجھے دار نہیں ہے، اسی معنیٰ کر کے اس کو سورۂ اخلاص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔**

فضائلِ سورۂ اخلاص:

اور اس سورت کے بڑے فضائل ہیں، اب سورۂ اخلاص کے فضائل کے سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں، ان کو میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

تہائی قرآن کے برابر:

(۱) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے سے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ سنی، پڑھنے والا اس کو بار بار پڑھ رہا تھا۔ جب صبح ہوئی تو یہ (سننے والا) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ فلاں شخص رات کو بار بار سورۂ قل هو الله احد پڑھ رہا تھا۔ اور پوچھنے والے کا بیان کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس کے اس بار بار پڑھنے والے عمل کو کم اور معمولی سمجھ رہا تھا، اس لیے اس نے ایسے انداز سے بیان کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **بے شک یہ سورت تہائی قرآن کے برابر ہے، یعنی اس کے پڑھنے پر تہائی قرآن پڑھنے کا ثواب ملے گا۔** گویا سائل کا مقصد تو کچھ اور تھا، وہ تو یوں سمجھتا تھا کہ یہ بار بار کیوں پڑھ رہا ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے اس کا یہ اجر وثواب بتلا کر کے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا۔[۱]

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت مسلم شریف میں ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمھیں تہائی قرآن پڑھ کر سناتا ہوں۔ صحابہؓ کو جمع کر کے آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی تھی، اور اس کے بعد آپ ﷺ نے سورۂ قل ھو اللہ احد پوری پڑھ کر سنائی۔[۲] گویا یہ تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اسی لیے ہمارے یہاں عام طور پر ایصالِ ثواب میں آسان تدبیر ہے کہ تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچایا جاتا ہے۔ تین مرتبہ پڑھنے سے حکماً، فضیلت کے اعتبار سے پورے قرآن کا ثواب مل جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرماتے ہیں:

(۳) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں- یہ بھی مسلم شریف کی روایت ہے- کہ نبی کریم ﷺ نے ایک فوجی دستہ بھیجا، اور ایک آدمی کو اس کا امیر بنایا۔ یہ آدمی جب بھی نماز پڑھاتا تھا، تو ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھنے کے بعد پھر قل ھو اللہ احد بھی پڑھتا تھا۔ گویا سورۂ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت ملانے کو کافی نہیں سمجھا، اور ہر رکعت میں قل ھو اللہ احد بھی ضرور ملاتا تھا۔ اب یہ لوگ جب واپس آئے تو نبی کریم ﷺ سے لوگوں نے اس کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے اس آدمی سے پوچھا: تم ایسا کیوں کرتے تھے؟ اس نے جواب میں کہا: **اس میں رحمٰن کی صفات بیان کی گئی ہیں، اس لیے میں اس سورت کو بہت محبوب جانتا ہوں کہ اس کو پڑھوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اسے بتادو کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرماتے ہیں۔**[۳]

---

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۵۰۱۳.

(۲) أخرجه مسلم برقم: ۸۱۲.

(۳) أخرجه مسلم: ۸۱۳.

(۴) ترمذی شریف کی روایت ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ روایت بیان کی اور یوں کہا کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں قل ھو اللہ احد سے محبت کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس سورت سے تیری جو محبت ہے اس نے تجھے جنت میں داخل کر دیا۔[۱]

(۵) حضرت کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ جن کے گھر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیام فرمایا تھا، ہجرت فرما کر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا قیام ۱۴/روز تک قبا میں رہا، تو قبا میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے گھر میں قیام فرمایا تھا۔ اور وہ قبا والوں کے امام تھے، جب نماز پڑھاتے تو سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھنے کے بعد پھر قل ھو اللہ احد پڑھتے۔ تو لوگوں نے کہا: تم یہ سورت (قل ھو اللہ احد) پڑھتے ہو تو اسی کو پڑھو، دوسری سورت نہ پڑھو۔ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ تم کو اگر میری امامت منظور ہے تو ٹھیک، میں تو اسی طرح پڑھوں گا، ورنہ میں الگ ہو جاتا ہوں۔ اور وہ ایسی شخصیت تھی کہ لوگ ان کی امامت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تو لوگوں نے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی کہ یہ ایسا کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا، تو انہوں نے وہی جواب دیا: مجھے اس سورت کے ساتھ محبت ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہاری اس محبت نے تم کو جنت میں داخل کر دیا۔[۲]

جنت میں دو محل:

(٦) حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دس مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھ لی، اس کے لیے جنت میں ایک محل بنا دیا جائے گا، اور

(۱) أخرجه البخاري تعليقاً في باب الجمع بين السورتين والترمذي: ۲۹۰۱.

(۲) أخرجه الدارمي: ۳۴۷۲، وهو حديث مرسل (ط: دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية).

جس نے بیس مرتبہ پڑھ لی اس کے لیے جنت میں دو محل بنا دیے جائیں گے۔ اور جس نے تیس مرتبہ پڑھی اس کے لیے جنت میں تین محل بنا دیے جائیں گے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ کی قسم! اس صورت میں تو ہم دس دس مرتبہ یہ سورت پڑھ کر اپنے لیے بہت زیادہ محل بنالیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بہت بڑا داتا ہے۔ جتنا عمل کرو گے اس کے پاس اس سے بہت زیادہ انعام ہے۔ یعنی اللہ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں، تم جتنے چاہو اپنے لیے محل بنوالو۔[۱]

جنت واجب ہوگئی:

(۷) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آدمی کو سورۂ قل ھو اللہ احد پڑھتے ہوئے سن لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کے لیے واجب ہوگئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: میں نے پوچھا: کیا واجب ہوا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنت واجب ہوگئی۔[۲]

بہر حال! اس سورت کے بڑے فضائل و مناقب ہیں۔ اس لیے اس کے پڑھنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ روزانہ کم سے کم ایک تسبیح اس کی اگر پڑھ لیں تو اس سے -ان شاء اللہ- بڑا اجر و ثواب ہمارے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔

اس مختصر سی سورت میں اللہ تعالیٰ کے لیے خالص توحید کو ثابت کیا گیا ہے، اس لیے اس کو سورۂ اخلاص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توحیدِ خالص کی نعمت سے مالا مال فرمائے۔

---

(۱) أخرجه الترمذي: ۲۹۰۱.

(۲) أخرجه الترمذي: ۲۸۹۷.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ لہب

(مؤرخہ ۱۷؍شوال المکرم ۱۴۳۹ھ مطابق ۳۰؍جون ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً .

أمابعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۝

تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴿۱﴾ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُ مَالُهٗ وَ مَا کَسَبَ ؕ﴿۲﴾ سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۚ﴿۳﴾ وَّ امۡرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ ۚ﴿۴﴾ فِیۡ جِیۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ٪﴿۵﴾

لہب کے معنیٰ:

یہ سورۂ لہب ہے، لہب عربی زبان میں بھڑکتے ہوئے شعلہ کو کہتے ہیں۔ لفظ لہب اس سورت میں دو جگہ آیا ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام سورۂ لہب رکھا گیا ہے۔

ترجمہ سورۂ لہب:

تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَهَبٍ وَّ تَبَّ (ابولہب کے دونوں ہاتھ برباد ہوں، اور وہ خود بھی ہلاک ہو چکا)۔

[تَبَّ-یَتِبُّ تَبّاً و تَبَاباً کے معنیٰ ہیں ہلاک ہونا، برباد ہونا]

مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُ مَالُهٗ وَ مَا کَسَبَ (اس کی دولت اور اس کی کمائی نے اس کو کچھ فائدہ نہیں پہنچایا، کچھ کام نہیں دیا)۔

سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (وہ بھڑکتے ہوئے شعلوں والی آگ میں داخل ہوگا)۔

وَّامۡرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ (اور اس کی بیوی بھی (اسی بھڑکتے ہوئے شعلوں والی آگ میں داخل ہوگی) ایسی حالت میں کہ وہ لکڑیاں اٹھائے ہوئے ہوگی)۔

فِیۡ جِیۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ (اس کی گردن میں کھجور کی چھال کی رسی یا مضبوط بٹی ہوئی رسی ہوگی)۔

شانِ نزول:

دراصل اس سورت کے شان نزول کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو اسلام، توحید و رسالت کی دعوت کا حکم ملا۔ قرآن پاک کی آیت کریمہ وانذر عشیرتک الاقربین و رھطک منھم المخلصین (آپ اپنے قریبی رشتہ داروں اور خاص طور پر اپنی جماعت، اپنے کنبہ کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے) نازل ہوئی۔ و رھطک منھم المخلصین پہلے تھی، بعد میں اس کی تلاوت منسوخ ہوئی؛ البتہ مفہوم اب بھی باقی ہے۔ چناں چہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہِ صفا پر تشریف

لے گئے (اُس وقت مستقل پہاڑی ہی کی طرح تھی، آج کل تو وہ دو دیواروں کے درمیان محصور ہے) اور وہاں جا کر آپ ﷺ نے آواز لگائی یا صباحاہ! عربوں میں آپس میں بڑی عداوتیں ہوا کرتی تھیں، اور ایک قبیلہ اچانک رات کے اندھیرے میں کسی پر حملہ کر کے اس کو نقصان پہنچاتا تھا، قتل و غارت گری ہوا کرتی تھی۔ کب کس پر چڑھ آئے؟ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی تھی۔ ایسے موقع پر جب کسی قبیلہ کے کسی فرد کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے قبیلے کے خلاف دشمن قبیلہ چڑھائی کر کے آرہا ہے تو -اس زمانے میں ٹیلیفون یا آج کل آگاہ کرنے کے لیے اور خبر دینے کے لیے جو آلات ہوتے ہیں وہ تو تھے نہیں- وہ آدمی اپنے قبیلہ کو خبر کرنے، آگاہ کرنے، اس کا مقابلہ کرنے اور اس کا جواب دینے کے واسطے بلند جگہ پر چڑھ جاتا تھا اور آواز لگاتا تھا یا صباحاہ! اس کی آواز کو سن کر لوگ جمع ہو جاتے تھے، اور پھر اس شخص کو جو خبر دینی ہوتی، وہ دیا کرتا تھا۔

یاصباحاہ:

نبی کریم ﷺ پر جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (اے نبی! آپ اپنے قریبی خاندان والوں، رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے) کہ اگر وہ ایمان نہیں لائے، اپنے کفر و شرک سے توبہ نہیں کی، اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا اقرار نہیں کیا، تو اللہ تعالیٰ کا سخت عذاب ان کو پہنچے گا۔ آپ ان کو بتلائیے۔ چناں چہ آیت کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنے خاندان والوں کو جمع کرنے کے لیے اسی طرح کوہ صفا پر چڑھ کر آواز لگائی یا صباحاہ! اور پھر عمومی اور خصوصی انداز میں سب کو پکارا۔ عمومی انداز میں، جیسے: یا بنی ھاشم! یا بنی عبد المطلب! یا بنی

فهر! یابنی لؤی! یابنی عبد مناف! اس طرح خاندانوں کا نام لے لے کر پکارا۔ اور اسی طرح قریش کے دیگر قبائل کو بھی نام لے کر پکارا۔ اور پھر افراد کے بھی نام لیے۔ یا عباس بن عبد المطلب! یا حمزة بن عبد المطلب! یا صفية بنت عبد المطلب! اپنی پھوپھی اور اپنی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ کا نام لیا۔ اور خصوصی، انفرادی، شخصی اعتبار سے بھی خطاب کیا۔ چناں چہ لوگ جمع ہو گئے۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق اگر کوئی شخص کسی وجہ سے خود حاضر نہ ہوسکتا، تو حالات معلوم کرنے کے لیے وہ اپنا نمائندہ بھیج دیتا تھا، چناں چہ سب لوگ جمع ہو گئے۔ جو لوگ آپ کے سامنے کھڑے تھے ان کو یہ نہیں معلوم کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس پہاڑی (صفا) پر کھڑے ہیں، اس کے پیچھے کیا ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے سوال کیا کہ بتلاؤ! اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑی کے دامن میں، پیچھے ایک لشکر ہے جو صبح یا شام تم پر حملہ کرنے والا ہے، تو کیا تم میری بات کو مانو گے؟ اس کو سچا سمجھو گے؟ تو لوگوں نے جواب میں کہا کہ ہاں! آج تک ہم نے کبھی آپ پر جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا، یا آپ کو کبھی جھوٹا نہیں پایا۔ لہٰذا اگر آپ ایسی بات کہیں گے، تو ہم مان لیں گے۔ ان سے یہ اقرار کرانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تم کو اللہ کے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں۔ آپ کا اللہ کے سخت عذاب سے ڈرانے کا مطلب یہ تھا کہ تم جس کفر و شرک میں مبتلا ہو، اپنے آپ کو اس سے نکالو، توبہ کرو اور توحید و رسالت کا اقرار کرو۔ اگر کفر اور شرک نہیں چھوڑو گے، تو اللہ کا سخت عذاب تم پر آئے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات فرمائی۔

ابولہب کون تھا......؟؟؟

اس مجمع میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چچا ابولہب بھی تھا۔ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے

گیارہ (۱۱) بیٹے تھے۔ان میں سے ایک حضرت عبداللہ تھے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد بزرگوار ہوتے ہیں۔ اور بقیہ دس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے۔ان میں سے ایک کا نام عبدالعزیٰ تھا۔عزیٰ یہ اس بت کا نام ہے جس کی وہ لوگ پوجا کیا کرتے تھے،اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کا نام عبدالعزیٰ رکھا گیا تھا۔جیسے اللہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے عبداللہ،عبدالرحمٰن نام رکھتے ہیں۔اور اس کی کنیت اور لقب ابولہب تھا) **لہب بھڑکتے ہوئے شعلہ کو کہتے ہیں۔وہ بڑا حسین وجمیل تھا،اس کا چہرہ ایک دم سرخ وسفید تھا،سفیدی میں ایسی سرخی تھی جیسا کہ شعلہ بھڑک رہا ہو۔اسی خوب صورتی کی وجہ سے اس کو ابولہب کا یہ لقب اور کنیت دی گئی تھی،اور اسی نام سے وہ مشہور تھا۔**وہ بڑا مالدار بھی تھا۔قریش اور مکہ مکرمہ کے بڑے مالداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔اس کی بیوی کا نام اَرویٰ تھا۔اس کی کنیت ام جمیل تھی،وہ ابوسفیان کی بہن ہوتی ہے۔

ہر مؤمن کی دلی خواہش:

بہر حال! جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات (توحید ورسالت) کی دعوت پیش فرمائی،تو اس مجمع میں ابولہب بھی موجود تھا۔یہ سن کر وہ بول پڑا: تباً لک سائر الیوم ألھذا جمعتنا؟ یا ألھذا دعوتنا؟ (تمہارے لیے ہمیشہ ہلاکت اور بربادی ہو، کیا اس کام کے لیے ہم کو یہاں بلایا تھا؟ اور جمع کیا تھا؟) اس نے تباً لک سے بددعائیہ جملہ کہا۔اتنا ہی نہیں اس نے پتھر لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مارا،اور اس کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایڑی مبارک زخمی ہوکر خون آلود ہوئی۔جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس نے یہ جملہ کہا،تو اس موقع پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے یہ سورت نازل ہوئی۔ظاہر ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی بددعا دے،تو ہر مؤمن کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کے جواب میں ہم اس کو بددعا دیں،گویا ہر مؤمن کی اسی دلی

خواہش کو پورا کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔[۱] جس کی ابتدا ہی بددعائیہ جملہ تبت یدا أبی لهب (ابولہب کے دونوں ہاتھ برباد ہوں) سے ہوتی ہے۔ اس نے نعوذ باللہ نبی کریم ﷺ کو بددعا دی تھی، گویا ہر مؤمن اس سورت کو پڑھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتا ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے موقع فراہم کیا گیا۔ اور آگے ہے وتبّ صرف بددعا کی حد تک نہیں؛ بلکہ بددعا وجود میں آگئی، اور وہ ہلاک ہوگیا۔ جس وقت یہ سورت نازل ہوئی اس وقت تو ہلاک نہیں ہوا تھا؛ لیکن آئندہ اس کی ہونے والی ہلاکت اتنی یقینی اور پکی تھی کہ اس کو لفظ تبّ کے ذریعہ ادا کیا گیا کہ ہلاک ہوگیا۔ چناں چہ اس کے مطابق وہ بعد میں ہلاک ہوا۔

ابولہب حضور ﷺ کے پیچھے پیچھے:

وہ نبی کریم ﷺ کو بہت تکلیفیں پہنچاتا تھا۔ روایات میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ لوگوں کو جب اسلام کی دعوت دینے کے لیے جاتے تھے تو یوں کہتے: یا أیها الناس! قولوا لا إله إلا الله تفلحوا حضرت طارق بن عبداللہ محاربی رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، فرماتے ہیں کہ میں نے ذوالمجاز کے بازار میں ایک شخص کو دیکھا اس حال میں کہ اس کے جسم پر سرخ جوڑا تھا -حرم کے علاقہ میں موسم حج میں مختلف مقامات پر، مختلف دنوں میں میلے لگتے تھے۔ ایک سوق عکاظ تھا، وہاں کچھ دن میلہ لگتا، پھر وہ میلہ اٹھ کر آگے ذوالمجاز میں آتا تھا، کچھ دن وہاں رہنے کے بعد وہ میلہ پھر ذوالمجنۃ میں آتا تھا، پھر وہاں سے آخر میں منیٰ میں آتا تھا، اور منیٰ میں وہ میلہ ختم ہوجاتا تھا۔ منیٰ بازار کی اصطلاح اسی سے قائم ہوئی ہے۔ حج کے موقع پر تمام

---

(۱) أخرجه البخاري: ٤٧٧٠ و٤٩٧١ و٤٩٧٢ و٤٩٧٣ و مسلم: ٢٠٨ والترمذي: ٣٣٦٣.

لوگ عرب کے قبائل سے آیا کرتے تھے، اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آنے والوں کو دعوتِ اسلام پیش کرنے کے لیے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس میلے میں تشریف لے جاتے تھے۔ میلے میں خرید وفروخت ہوتی تھی، آنے والے لوگ مال لے کر آتے تھے، فروخت کرتے تھے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے تھے، کچھ شعر وشاعری بھی ہوتی تھی۔ وقت گزاری کے لیے شعر وشاعری کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان آنے والوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کرتے تھے-تو حضرت طارق فرماتے ہیں: میں نے ذوالمجاز کے بازار میں ایک شخص کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو کہہ رہا ہے: قولوا لا إلٰه إلا الله تفلحوا (اے لوگو! لا إله إلا الله کہو، کامیاب ہو جاؤ گے) تو ان کے پیچھے پیچھے ایک آدمی چلتا تھا اور کہتا تھا کہ-نعوذ باللہ- یہ جھوٹا ہے، پاگل ہے، اس کی بات کی طرف دھیان مت دو، اور وہ پتھر بھی مارتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اس دعوت دینے والے کے ٹخنوں اور ایڑی کے اوپر کے پٹھوں کو لہولہان کر دیا تھا۔ انہوں نے معلوم کیا، تو پتہ چلا کہ یہ دعوت دینے والے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور پتھر مارنے والا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چچا ابولہب ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اس طرح گستاخی کر رہا ہے۔ اس کی عادت تھی کہ جہاں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے مجمعوں میں جاتے تھے، تو یہ پیچھے پیچھے جا کر اس طرح کہتا تھا کہ اس کی بات کو مت سنو-نعوذ باللہ- یہ جھوٹے ہیں، پاگل ہیں، اور پھر پتھر بھی مارتا تھا۔ یہ اس کی حرکت تھی۔[1]

---

(۱) صحيح ابن خزيمة ۱/۸۲ [۱۵۹] (ط: دار المكتب الإسلامي، بيروت).

ابولہب کی بیوی کا مشغلہ:

اس کی بیوی ام جمیل بھی اس برائی میں اس کا ساتھ دیا کرتی تھی۔اس کی عادت یہ تھی کی وہ ببول کی لکڑیاں کاٹ کر لاتی تھی، جس میں کانٹے ہوا کرتے تھے۔اور رات کو جہاں نبی کریم ﷺ کا گزرنے کا راستہ ہوتا تھا، وہاں بچھا دیا کرتی تھی، تا کہ صبح آپ ﷺ کو وہ کانٹے چبھیں۔اسی پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ سورت سنا دی گئی۔[1]

مال، دولت اور اولاد:

اس سے بعض لوگوں نے کہا کہ محمد ﷺ جو کہہ رہے ہیں، اس کے مطابق اگر سچ میں عذاب آیا تو تجھے کون بچا پائے گا؟ چوں کہ وہ بڑا مالدار تھا تو کہا کرتا تھا کہ میں اپنے مال کے ذریعہ سے اپنے آپ کو اس عذاب سے چھڑا لوں گا۔اسی پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا: مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ (کچھ کام نہیں آیا اس کا مال و دولت اور جو اس نے کمائی کی تھی)[2] یہاں کمائی اور دولت کو الگ الگ ذکر کیا، حالاں کہ دولت خود کی کمائی ہی سے ہوتی ہے۔تو اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ مال تو آدمی کو کبھی بغیر کمائے ہوئے وراثت میں بھی ملتا ہے، لوگ ہدیہ میں بھی دیتے ہیں؛ جب کہ کمائی وہ ہے جو آدمی نے اپنے زورِ بازو سے حاصل کی۔اسی مال کو جب کاروبار میں لگائے گا اور اس سے جو نفع کمائے گا اس کو کمائی سے تعبیر کریں گے۔اور بعض نے کمائی کا مصداق اس کی اولاد کو بھی بتلایا ہے۔[3] جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تمہاری اولاد تمہاری کمائی میں سے

---

(۱) تفسير الطبري وبحر العلوم للسمرقندي ۱/۶۳۲.

(۲) تفسير البغوي ۵/۳۲۷ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت).

(۳) تفسير عبدالرزاق الصنعاني وتفسير الطبري سورة اللهب.

ہے۔[۱] تو اس سے بعض نے اولاد مراد لی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی دولت، اس کی اولاد اس کے کسی کام نہیں آئی، اللہ کے عذاب سے اس کو بچا نہیں سکی۔

حمالة الحطب سے کیا مراد ہے......؟؟؟

حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ (اس کی بیوی لکڑیاں اٹھانے والی ہے) لکڑیاں کون سی؟

(۱) ایک مطلب تو وہی ہے جو ابھی گزرا کہ وہ ببول کی کانٹے دار لکڑیاں لاتی تھی اور رات کو نبی کریم ﷺ کے راستے میں بچھایا کرتی تھی۔ اس لیے اس کو حمالة الحطب سے تعبیر کیا ہے۔[۲]

(۲) بعض نے لکڑیوں سے جلانے کی لکڑیاں، سوختہ۔ جس کو گجراتی میں બળતણ کہتے ہیں۔ مراد لی ہیں۔ اس کا گھرانہ مالدار ہونے کے باوجود؛ یہاں اس کے غایت بخل کو بتلانا مقصود ہے کہ مالدار گھرانہ ہونے کی وجہ سے یہ جلانے کی لکڑیاں تو وہ آسانی سے خرید سکتے تھے؛ لیکن وہ اتنی بخیل اور خسیس طبیعت کی تھی کہ جلانے کی لکڑیاں خریدنے کے بجائے خود لینے جاتی تھی۔[۳]

(۳) بعض حضرات حمالة الحطب کا فارسی میں ”ہیزم کش“ ترجمہ کرتے ہیں، اور ”ہیزم کش“ فارسی میں چغلی کرنے والے کو کہتے ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: تیل ڈالتا ہے، پیٹرول ڈالنے کا کام کرتا ہے، یعنی آپس میں لڑانے کا کام کرنا۔ چناں چہ لکڑیاں بول کر چغلی مراد لی گئی ہے۔ چوں کہ وہ حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی چغلیاں تکلیف پہنچانے والے دشمنوں

---

(۱) أخرجه الترمذي: ۱۳۵۸.

(۲) تفسير الطبري وبحر العلوم للسمرقندي: سورة اللهب.

(۳) تفسير عبدالرزاق الصنعاني وتفسير الطبري. سورة اللهب.

کے سامنے کرتی تھی، اور آپس میں لڑاتی بھڑاتی تھی۔[۱]

(۴) چوتھا مطلب یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ جب یہ جہنم میں داخل ہوگی، تو وہاں بھی جس آگ میں اس کا شوہر جل رہا ہے، اس میں لکڑیاں ڈالے گی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سے بطورِ عذاب یہی کام کروایا جائے گا۔[۲]

ام جمیل کی موت:

فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (اس کی گردن میں کھجور کی چھال کی مضبوط بٹی ہوئی رسی ہے) **مسد** بٹ کر مضبوطی کے ساتھ بنائی جانے والی کھجور کی رسی کو کہا جاتا ہے۔ جب وہ لکڑیاں لے کر آتی تھی، تو اسی رسی سے لکڑیوں کو باندھتی تھی، اور لکڑیاں باندھ کر اپنی پیشانی پر جیسے بوجھ اٹھانے والے مزدور بوجھ کی رسی کا آگے والا حصہ پیشانی پر لپیٹتے ہیں اس طرح اٹھا کر آتی تھی۔ اور یہی اس کا طریقہ تھا۔ **ایک مرتبہ تھک گئی اور ایک پتھر پر بیٹھی تو اس کی وہ رسی پیشانی سے نیچے آگئی اور اسی میں اس کی گردن الجھ گئی اور اس کو پھندا لگ گیا اور اسی میں اس کی موت واقع ہوگئی۔**[۳]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹیوں کو طلاق:

ابولہب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چچا ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد حضرت عبداللہ کا علاتی بھائی ہے، یعنی ماں دونوں کی الگ الگ تھیں، باپ ایک تھے۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار صاحب زادیاں تھیں: (۱) حضرت زینب رضی اللہ عنہا (بڑی صاحب زادی)

---

(۱) تفسير الطبري: سورة اللهب.

(۲) تفسير البغوي: ۳۲۷/۵ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت) وتفسير ابن كثير: سورة اللهب.

(۳) تفسير الطبري: سورة اللهب.

ان کا نکاح نبیٔ کریم ﷺ نے نبوت سے سرفراز ہونے سے قبل ابو العاص بن ربیع، جو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی بہن کے بیٹے یعنی بھانجے کے ساتھ کروایا تھا۔ دوسری دو صاحب زادیوں (۲) رقیہ رضی اللہ عنہا (۳) ام کلثوم رضی اللہ عنہا، کا نکاح بھی نبوت ملنے سے پہلے ابولہب کے دو بیٹوں (۱) عتبہ اور (۲) عتیبہ سے کرایا تھا۔ ابھی رخصتی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اور آپ ﷺ پر وحی نازل ہونے کا سلسلہ شروع ہوا، اور آپ ﷺ نے دعوت اسلام دینا شروع کیا، تو ابولہب نے مخالفت کی اور اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ چناں چہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو ابولہب نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم ان کی بیٹیوں کو طلاق دے دو، ورنہ میرے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ چناں چہ ان دونوں لڑکوں نے نبی کریم ﷺ کی صاحب زادیوں کو طلاق دی۔[۱] بڑے لڑکے نے صرف طلاق دینے پر ہی اکتفا کیا، اور کوئی گستاخی والا معاملہ نہیں کیا۔ چھوٹے نے تو برا بھلا بھی کہا، حضور ﷺ کے چہرۂ انور پر تھوکا اور آپ ﷺ کی صاحب زادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو طلاق دی۔ جب اس نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ گستاخانہ سلوک کیا، تو حضور ﷺ نے اس موقع پر بددعائیہ جملہ ارشاد فرمایا تھا: اللھم سلط علیه کلباً من کلابک (اے اللہ! تیرے درندوں میں ایک درندے کو تو اس پر مسلط کر دے) ابوطالب بھی موجود تھے، جب انہوں نے یہ بددعا سنی، تو ابوطالب نے اس سے کہا کہ اب تم ان کی بددعا سے نجات نہیں پا سکتے ہو۔ خود ابولہب بھی جانتا تھا کہ اب ان کی بددعا تو اپنا رنگ اور اثر دکھائے گی۔ چناں چہ یہ باپ بیٹے ڈرے سہمے رہتے تھے کہ پتا نہیں کب اس بددعا کا اثر ظاہر ہو؟

---

(۱) تاريخ الطبري: ۲/ ۴۶۷-۴۶۸ (ط: دارالتراث ، بيروت) والسيرة النبوية و أخبار الخلفاء لابن حبان: ۱ /۷۱ (ط: دارالكتب الثقافية، بيروت) والاستيعاب في معرفة الأصحاب لابن عبدالبر: ۴/ ۱۸۳۹-۱۸۴۱ و ۴/ ۱۹۵۲-۱۹۵۳ (ط: دارالجيل، بيروت).

ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں:

ایک مرتبہ شام کے علاقہ میں ایک سفر میں ابولہب اپنے اسی بیٹے کو قافلہ میں لے کر جا رہا تھا، ایک جگہ پر قیام ہوا تو ابولہب نے کہا: ان کی بددعا کی وجہ سے ہم کو ڈر ہے، کہیں کوئی آ کر میرے بیٹے کو پھاڑ نہ کھائے، اس لیے تم ہمارا لحاظ کرتے ہوئے اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست کرو۔ چناں چہ قافلہ والوں نے سب کے سامان کا ڈھیر لگایا اور اس کے اوپر ابولہب کے بیٹے کو لٹایا، اور سامان کے ڈھیر کے چاروں طرف قافلہ والے لیٹ گئے۔ رات کو شیر آیا اور اس نے سب کو سونگھا، اس کے بعد چھلانگ لگا کر اوپر گیا اور اس کا سر بدن سے الگ کر دیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ رات کو ابھی سونے کی نوبت نہیں آئی تھی، اسی وقت شیر نے باہر سے آواز لگائی، دہاڑا، تو اس کے گرجنے کی آواز سن کر یہ کانپنے لگا، لوگوں نے کہا: ہم نے بھی آواز سنی جیسے تو نے سنی۔ تجھ پر اتنا زیادہ اثر کیوں ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھ کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بددعا کے جملے یاد آ رہے ہیں، اس روئے زمین پر، آسمان کے نیچے ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں ہے۔ کھانے کا وقت آیا تو ڈر اور خوف کی وجہ سے اس کا ہاتھ آگے نہیں جا رہا تھا۔ اور رات کو یہی واقعہ پیش آیا کہ شیر نے آ کر اس کو ختم کر دیا۔ حالاں کہ ان دونوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا یقین تھا اس کے باوجود ایمان نہیں لائے۔[۱]

تین ہجرتیں:

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا اور وہ ان

---

(۱) دلائل النبوة لأبي نعيم الأصبهاني: ۱/ ۴۵۴-۴۵۸ (ط: دار النفائس، بيروت) ودلائل النبوة لقوام السنة الأصبهاني: ۱/ ۷۰-۷۱ (ط: دار طيبة، الرياض).

کے نکاح میں تھیں، اسی زمانے میں ان دونوں میاں بیوی حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہؓ نے حبشہ کی جانب ہجرت کی ۔ ایک مرتبہ گئے، پھر وہاں افواہ پھیلی کہ مکہ والے سب مسلمان ہوگئے اور اب وہ مسلمانوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاتے ہیں اس لیے اس افواہ کو سن کر بہت سے لوگ مکہ واپس آگئے، یہاں آئے تو معلوم ہوا کہ سلسلہ جوں کا توں باقی ہے۔ پھر دوبارہ مکہ ہی سے حبشہ کی ہجرت کی، اور پھر حبشہ سے مدینہ کی بھی ہجرت کی۔ گویا تین ہجرتیں کیں، حبشہ کی دو، اور مدینہ کی ایک۔

ذوالنورین:

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ بدر کے لیے نکلے، اس وقت حضرت رقیہؓ بیمار تھیں، حضرت عثمانؓ بھی نکلنا چاہتے تھے؛ لیکن حضرت رقیہؓ کی تیمارداری کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو روک دیا کہ آپ مت آیئے، ان کی تیمارداری میں رہو۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی، اور جب حضرت زید بن حارثہؓ بشارت دینے کے لیے مدینہ پہنچے، توانھوں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحب زادی حضرت رقیہؓ کو دفن کیا جا رہا ہے۔[۱] حضرت رقیہؓ کے انتقال کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دوسری صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ کو بھی حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دیا۔ اور فرمایا کہ پہلی بیٹی کو بھی اللہ کے حکم سے ہی ان کے نکاح میں دیا تھا اور دوسری بیٹی کو بھی اللہ ہی کے حکم سے دیا ہے۔ پھر ۸/۹ھ میں حضرت ام کلثومؓ کا انتقال ہوا، اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر میری تیسری بیٹی بغیر نکاح کے ہوتی تو اس کو بھی ان کے نکاح میں دیتا۔[۲] **حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو بیٹیاں حضرت عثمانؓ کے**

---

(۱) الاستيعاب في معرفة الأصحاب: ۱۸۴۱/۴ (ط: دار الجيل، بيروت).

(۲) المعجم الكبير للطبراني: ۱۸۴/۱۷ (ط: مكتبة ابن تيمية، القاهرة) وتاريخ دمشق لابن عساكر: ۴۴/۳۹-۴۷ (ط: دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع)

نکاح میں تھیں، اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ذوالنورین کہتے ہیں۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہر صاحب زادی ایک نور ہے، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دو نور والے ہوئے۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے۔ آخری صاحب زادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دیا تھا۔ اس طرح ابولہب کے کہنے سے بیٹوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صاحب زادیوں کو طلاق دی۔

ابولہب کا عبرت ناک انجام:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مسلمان ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے، ۲ھ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔ ابولہب کو بھی اس میں شریک ہونا تھا؛ مگر مارے ڈر کے شریک نہیں ہوا، اور اپنی جگہ ابوجہل کے بھائی کو رقم دے کر بھیجا۔ ادھر غزوۂ بدر ختم ہوا، اس کے بعد چند ہی دنوں میں اس کو چیچک کی بیماری لگ گئی۔ عربوں میں وہم پرستی تھی، جس کی وجہ سے وہ یوں سمجھتے تھے کہ چیچک کی بیماری والے شخص کے پاس جو کوئی جاتا ہے اس کو بھی چیچک کی بیماری لگ جاتی ہے۔ اس لیے اس کو بھی جب یہ بیماری لگی تو گھر والوں نے اپنے رہائشی گھر سے اس کو دوسرے گھر میں ڈال دیا۔ اور وہاں کوئی نہیں جاتا تھا، چند دنوں میں پورے جسم پر وہ بیماری پھیل گئی، اسی میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ مرنے کے بعد اس کی لاش اسی مکان میں ویسی ہی پڑی رہی، بدبو آنے لگی تو لوگوں نے اس کے بیٹوں کو عار دلائی کہ تمہارا باپ مر گیا تو بھی خبر نہیں لیتے؟ انہوں نے ایک حبشی غلام کو پیسے دے کر تیار کیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ اس نے ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کی لاش کو بٹھا دیا، پھر سب نے دور ہی سے اس کو پتھر مارے، اتنے پتھر مارے کہ وہ اسی میں دفن ہو گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک

گڑھا کھودا گیا اور لکڑی کے ذریعہ سے اس کی لاش کو اندر ڈالا گیا اور اوپر پتھر ڈال کر اس کو اسی طرح دفن کیا گیا۔اس طرح ذلت اور رسوائی کے ساتھ اس کی موت آئی۔[۱]

وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی:

حضورﷺ مکہ میں تھے اور یہ سورت نازل ہوئی تھی، جب یہ سورت نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی ام جمیل کو پتہ چلا کہ ایسی سورت نازل ہوئی ہے،تو وہ حضورﷺ کو بہت برا بھلا کہتی تھی، گالیاں دیتی تھی۔اس کو جب معلوم ہوا کہ ایسی سورت نازل ہوئی تو وہ آپﷺ کے پاس گالیاں دیتی ہوئی پتھر لے کر آئی، آپﷺ حرم میں بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابو بکرؓ بھی پاس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضورﷺ سے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! وہ گالیاں دیتے ہوئے اور پتھر لیے ہوئے آرہی ہے۔آپ کو مارے گی۔حضورﷺ نے فرمایا: گھبراؤ مت! وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی ۔ چناں چہ جب وہ قریب آئی تو حضرت ابو بکرؓ سے پوچھتی ہے: تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟ حالاں کہ حضورﷺ وہیں موجود تھے۔ انہوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں!!! اور کہا اگر میں ان کو پالوں گی، تو یہ پتھر ان کے منہ پر ماروں گی، اور کہا: سن لو! میں شاعرہ ہوں۔[۲]

میں مذمم نہیں، محمد ہوں:

اور اس نے یہ اشعار کہے۔۔۔۔۔۔

مُذَمَّمًا عَصَيْنَا وَأمره أَبَيْنَا وَدينه قلينا

---

(۱) المعجم الكبير للطبراني: ۱/۳۰۸[۹۱۲].

(۲) سيرة ابن هشام: ۱/۳۵۶(ط: مطبعة مصطفىٰ البابي الحلبي، مصر).

ترجمہ: ہم نے مذمم کی نافرمانی کی، اور ہم نے ان کے حکم کو قبول کرنے سے انکار کیا، اور ہم نے ان کے دین سے دشمنی کی۔ وہ یہ شعر پڑھتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

قلیٰ - یقلی اس کے معنیٰ دشمنی کرنا ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے: مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰی.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ والے بجائے محمد کے -نعوذ باللہ- مُذَمّم کہتے تھے۔ تو وہ بھی یہ بولتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ محمد کا ترجمہ ہوتا ہے قابلِ تعریف، اور مذمم کا ترجمہ ہوتا ہے قابلِ مذمت، برائی کیا جانے والا۔ دیکھیے! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے مذمم بولنے پر ناراض نہیں ہوتے تھے؛ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا اکرم ہے کہ ان کی گالیوں کو اللہ تعالیٰ نے یوں ہی میرے اوپر سے ہٹا دیا۔ اس لیے کہ وہ لوگ جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برا بھلا کہتے تھے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام میں محمد نہیں بولتے تھے؛ بلکہ مذمم بولتے تھے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے کہ وہ تو مذمم کو برا بھلا کہتے ہیں، اور میں تو مذمم ہوں نہیں!!! میرا نام تو محمد ہے!!! کتنی آسانی اور سادگی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو حل کر دیا!!! ذرا بھی برا نہ لگا، اور معاملہ ختم ہو گیا۔[۱]

میں نے اللہ سے ان دونوں کو مانگ لیا ہے:

فتح مکہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا: تم اپنے بھتیجوں کو میرے پاس نہیں لاتے؟ - ابولہب کا ایک بیٹا عتیبہ تو مارا گیا تھا، دوسرا عتبہ تھا، اور تیسرا معتّب تھا- آپ نے فرمایا: ان کو لے آؤ! حضرت عباس رضی اللہ عنہ ان کو تلاش کرنے کے لیے نکلے، وہ بھاگ کر عرفات چلے گئے تھے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ ان کو لائے، وہ آئے، اور ایمان قبول کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

(۱) سیرۃ ابن ھشام: ۱/۳۵۶ (ط: مطبعۃ مصطفیٰ البابي الحلبي، مصر)

نے فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کو مانگ لیا ہے۔[۱] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفقت دیکھو! جس آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایسا معاملہ کیا تھا ان کی اولاد کے ساتھ یہ سلوک! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر لوگوں کو بلا بلا کر ایمان کی دعوت دی۔ حضرت ابوبکرؓ کے والد جن کا نام عثمان تھا، ابوقحافہ کنیت تھی۔ ان کو دعوت دی، تو وہ بھی مسلمان ہوگئے۔ اسی طرح اور بہت سارے وہ لوگ جو تکلیفیں پہنچاتے تھے، ان کو بلا کر اپنے سامنے بٹھاتے تھے اور دعوتِ اسلام پیش کرتے تھے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت اور شفقت کا معاملہ ہے۔[۲]

ابولہب کی کنیت کیوں......؟؟؟

ایک سوال یہ ہے کہ ابولہب کی کنیت کیوں لی گئی؟ اس کا نام کیوں نہیں لیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا نام عبد العزیٰ تھا۔ چوں کہ اس میں بت کی طرف نسبت ہوتی تھی، اس لیے اس نام کو قرآن میں ذکر کرنا مناسب نہیں تھا، اس لیے ابولہب کنیت بولا گیا۔ پھر ابولہب میں اس بات کی طرف اشارہ بھی تھا کہ وہ بھڑکنے والی آگ میں داخل ہوگا۔

درسِ عبرت:

اس سورت میں بڑی عبرت بھی ہے۔ ایک مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ بھی ہے۔ بہت سے لوگ اپنے مال کے غرور اور گھمنڈ میں حق کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، اور اللہ کے مقبول بندوں کو ستاتے ہیں۔ جیسا کہ ابولہب نے انکار کیا تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ حق

---

(۱) الطبقات الکبری لابن سعد: ۴/ ۴۴-۴۵ [۳۵۵و۳۵٦] (ط: دار الکتب العلمیة، بیروت).

(۲) أخرجه ابن حبان فی الموارد: ۱۷۰۰ (ط: دار الکتب العلمیة، بیروت) و ابن هشام في سیرته: ۲/ ۴۰۵-۴۰٦ (ط: مطبعة مصطفیٰ البابي الحلبي) والحاکم في المستدرک: ۳/ ۴۸ (ط: دار الکتب العلمیة، بیروت) وغیرهم.

ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو اللہ کے مقرب تھے ان کو ستایا۔ تو اس میں یہ عبرت ہے کہ مال کی وجہ سے ایسے کام نہیں کرنے چاہیے، مال کسی کام آنے والا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عطا فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ نصر

(قسط-۱)

(مؤرخہ ۱؍ذی قعدۃ ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۵؍جولائی ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ﴿۱﴾ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ﴿۲﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ اسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

ترجمۂ سورت:

یہ سورۂ نصر ہے، تین آیتیں ہیں:

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ (جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے)

وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ فوج در فوج، گروہ در گروہ اللہ کے دین میں داخل ہورہے ہیں)

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کیجیے اور اللہ سے مغفرت چاہیے)

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (بے شک وہ بہت معاف کرنے والا ہے)

اس سورت کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ قرآن پاک میں سب سے آخر میں مکمل طور پر نازل ہونے والی یہی سورۂ نصر ہے۔[۱] اس کے بعد کچھ آیتیں اور کچھ سورتوں کے حصے تو نازل ہوئے؛ لیکن مکمل سورت نازل نہیں ہوئی۔

فتح مکہ سے قبل یا اس کے بعد؟

البتہ اس سلسلے میں حضرات مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ سورت مکہ مکرمہ فتح ہونے سے پہلے نازل ہوئی یا فتحِ مکہ کے بعد نازل ہوئی؟

(۱) صاحب روح المعانی نے البحر المحیط سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں بتلایا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب فتح خیبر کے بعد مدینہ منورہ لوٹ رہے تھے، تو راستہ میں یہ نازل ہوئی۔ فتح خیبر ماہ محرم ۷ھ میں ہوئی، اس کے بعد دو سال نبی کریم ﷺ دنیا میں قیام پذیر رہے؛ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی دوسری سورت مکمل نازل نہیں ہوئی۔[۲]

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت یہ ہے کہ یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے دوران منیٰ میں نبی کریم ﷺ کے قیام کے وقت نازل ہوئی۔[۳]

اور اس کے بعد سورۂ بقرہ کی آیت: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ

---

(۱) صحيح مسلم: ۳۰۲۴ و السنن الكبرىٰ للنسائي: ۱۰/ ۳۴۹ (ط: مؤسسة الرسالة، لبنان).

(۲) البحر المحيط لأبي حيان الأندلسي وروح المعاني للآلوسي، سورۂ نصر.

(۳) البحر المحيط، سورۂ نصر.

وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا.(المائدة:۳) نازل ہوئی۔ اور ان دونوں یعنی سورۂ نصر اور اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۸۰/دن دنیا میں رہے۔

اس کے بعد آیت کلالہ نازل ہوئی، اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کے ۳۵/دن باقی رہ گئے تھے، اور سب سے اخیر میں سورۂ بقرہ کی آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ.(البقرۃ:۲۸۱) نازل ہوئی۔[۱] اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کے ۲۱/دن اور مقاتل کی روایت کے مطابق صرف ۷/دن باقی رہ گئے تھے۔ بہر حال! فتح مکہ سے پہلے اور فتح مکہ کے بعد، دونوں طرح نازل ہونے کی باتیں ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمول میں تبدیلی:

یہاں لفظ فتح سے مکہ مکرمہ کی فتح مراد ہے۔ اس پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔

(۱) بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ جب بھی کوئی نماز پڑھتے، تو آپ یہ دعا کرتے: سبحانك ربنا وبحمدك اللّٰهم اغفرلي.[۲]

(۲) حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھتے بیٹھتے، جاتے آتے سبحان الله وبحمده أستغفر الله وأتوب إليه. پڑھتے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے، اور دلیل کے طور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ نصر کی تلاوت فرماتے تھے۔[۳]

---

(۱) أخرجه البخاري: ۴۵۴۴.

(۲) أخرجه البخاري: ۴۹۶۷.

(۳) أخرجه مسلم: ۴۸۴.

(۳) تفسیر قرطبی میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ عبادات میں بہت زیادہ مجاہدہ فرمانے لگے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پاؤں پر ورم آ گیا۔[1]

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ (جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح آ جائے)

دعوت پر مخالفت واذیت:

یہاں فتح سے فتح مکہ مراد ہے۔ نبی کریم ﷺ کی ولادت شریفہ مکہ مکرمہ میں ہوئی، اور جب آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے ۴۰/سال پورے کیے، اس وقت نبی کریم ﷺ پر وحی نازل ہوئی، اور اس کے بعد ایک وقت آیا جب یہ آیت نازل ہوئی: و انذر عشيرتك الاقربين.(الشعراء:۲۱۴) ورهطك منهم المخلصين اس وقت نبی کریم ﷺ نے قبیلۂ قریش کی شاخوں اور اپنے خاندان کے بعض افراد کو نام لے لے کر کوہِ صفا کے پاس جمع کیا، اور اللہ کے حکم کے مطابق اس کے عذاب سے ڈرایا۔ جیسا کہ سورۂ لہب کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔[2] اس طرح آپ ﷺ لوگوں کو ایمان و اسلام کی دعوت دیتے رہے؛ لیکن مکہ والوں نے اس دعوت پر ایمان لانے کے بجائے آپ ﷺ کی مخالفت کی، اور صرف مخالفت ہی نہیں؛ بلکہ آپ ﷺ کو اور آپ پر ایمان لانے والے لوگوں کو بہت تکلیفیں پہنچائیں، اور ظلم و ستم کی کوئی شکل ایسی نہیں تھی، جو انھوں نے حضور ﷺ اور ایمان والوں کے ساتھ اختیار نہ کی ہو۔ سخت گرمی کے زمانے میں، تپتی ہوئی ریت پر ان کو لٹا دیا جاتا تھا، اور اوپر پتھر کی سِل رکھ دی جاتی تھی، اسی طرح انگاروں پر لٹایا جاتا تھا۔ حضرت خبابؓ کا واقعہ آپ نے

---

(۱) الجامع لأحكام القرآن للقرطبي، سورۂ نصر.

(۲) أخرجه البخاري: ۴۷۷۰ و ۴۹۷۱ و ۴۹۷۲ و ۴۹۷۳ و مسلم: ۲۰۸ و الترمذي: ۳۳۶۳.

حکایات صحابہ میں سنا ہوگا کہ ان کی چربی کے پگھلنے سے انگارے بجھتے تھے۔ایسی ایسی تکلیفیں پہنچائی گئی تھیں۔کوئی تکلیف ایسی نہیں تھی جو نہ پہنچائی ہو۔

میری مدد کرو......:

وحی کے نزول کے بعد ۱۳؍سال نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں گزارے؛لیکن مکہ والوں کی بڑی تعداد وہ تھی جو ایمان نہیں لائی تھی۔اور حضور ﷺ کو جب ان کی طرف سے مایوسی ہوئی،تو آپ ﷺ حج کے موقع پر آنے والے عرب کے دیگر قبائل کے پاس جا کر ان کو ایمان واسلام کی دعوت دیتے تھے،اور آپ ﷺ ان سے یہ درخواست بھی کرتے تھے کہ آپ مجھے اپنے علاقہ میں لے جاؤ،اور مجھے اللہ کے حکم کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا موقع دو،میری مدد کرو؛لیکن قریش ایک ایسا قبیلہ تھا کہ عرب کے تمام قبائل پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔کوئی بھی قبیلہ قریش کو اپنا دشمن بنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔وہ جانتے تھے کہ اگر ان کو اپنے وہاں لے جائیں گے،تو اس کا مطلب قریش کو اپنا دشمن بنانا ہے،اور ان کی دشمنی مول لینا وہ اپنی طاقت سے باہر سمجھتے تھے۔

......تب ہم تم پر غالب آئیں گے:

لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ وہ یہ خدمت مدینہ منورہ کے دو قبیلوں اوس وخزرج -جن کو بعد میں انصار کا لقب ملا- سے لے۔چناں چہ نبوت کے گیارہویں سال قبیلۂ خزرج کے ۶؍آدمی آئے،اور حج کے موقع پر منیٰ میں جمرۂ عقبہ کے پاس حضور ﷺ سے ان کی ملاقات ہوئی،آپ ﷺ نے دعوت اسلام پیش کی،انہوں نے قبول کر لی۔[۱] مدینہ منورہ میں

---

(۱)سیرۃ ابن ھشام:۱/۴۲۸-۴۳۰۔

یہودیوں کے دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر آباد تھے، وہ اہل کتاب تھے اور اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کی آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیٔ آخر الزمان کی آمد اور ان کی جو علامات بتلائی گئی تھیں وہ سب انہیں معلوم تھیں، اور اوس وخزرج کا رہنا سہنا بھی چوں کہ یہودیوں میں تھا اور ان کی یہودیوں کے ساتھ آپس میں چپقلش اور کشاکشی بھی چلتی رہتی تھی، مقابلے بھی ہوتے رہتے تھے، تو یہودی ان سے کہا کرتے تھے کہ **دیکھو! نبیٔ آخر الزمان آنے والے ہیں جب وہ آئیں گے، تو ہم ان پر ایمان لائیں گے۔ اور ان کے ساتھ مل کر ہم تم کو اس طرح قتل کریں گے جیسے قومِ عاد اور قوم ارم کو قتل کیا گیا۔ اور ان پر ایمان لانے سے اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا، اور اس وقت ہم تم پر غالب آئیں گے۔**

بیعت عقبۂ اولیٰ:

البتہ یہودی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ نبیٔ آخر الزمان ہمارے اندر یعنی بنی اسرائیل میں آئیں گے۔ بہرحال! اوس وخزرج یہودیوں سے یہ باتیں سنتے رہتے تھے۔ وہ تو اصل میں بت پرست تھے، ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی، ان کو اس سلسلہ میں کوئی معلومات نہیں تھی۔ تو یہ ۶/آدمی جب حج کے لیے آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات ہوئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے کہا کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور میں تم کو ایمان کی دعوت دیتا ہوں، تو انہیں یہودیوں کی باتیں یاد آ گئیں۔ اور انہوں نے آپس میں کہا کہ یہودی ہم سے کہا کرتے ہیں کہ نبیٔ آخر الزمان جب آئیں گے، تو ہم ان پر ایمان لائیں گے اور ان پر ایمان لانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہماری مدد کریں گے اور اس کے نتیجہ میں ہم تم پر غالب آئیں گے۔ تو وہ ایمان لائیں اس سے پہلے ہم کو موقع ملا ہے، ہم کیوں نہ ایمان لے آئیں؟!!! چناں چہ یہ چھ

آدمی ایمان لے آئے۔اس وقت اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہوئی؛ البتہ انہوں نے کہا کہ آئندہ سال ہم دوبارہ آپ سے ملاقات کریں گے۔ چناں چہ دوسرے سال حج کے موقع پر ۶ کے بجائے ۱۲/آدمی آئے۔ان ۱۲/میں ۵/تو وہی تھے، جو اگلے سال آئے تھے، باقی ۷/نئے تھے۔وہ ایمان لاکر حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔اس کو بیعت عقبۂ اولیٰ کہا جاتا ہے۔[۱]

بیعت عقبۂ ثانیہ:

پھر انہوں نے یہ درخواست کی کہ آپ اپنے تربیت کردہ بعض صحابہؓ کو ہمارے پاس بھیجیے، تاکہ ہم کو وہاں اسلام کے احکام اور قرآن کی تعلیم سے واقف کریں۔ چناں چہ حضور ﷺ نے پہلے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اور پھر حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کو بھیجا۔ یہ دونوں حضرت اسعد بن زرارہؓ کے گھر پر ٹھہرے، اور وہاں رہ کر انہوں نے ایمان واسلام کی دعوت دینا شروع کیا۔اور پھر تو مدینہ کے عرب قبائل میں گھر گھر میں نبی کریم ﷺ کا چرچا تھا۔حتیٰ کہ اس کے بعد والے (یعنی نبوت کے ۱۳/ویں) سال ۷۵/افراد-جن میں ۷۳/مرد اور ۲/عورتیں تھیں-حج کے موقع پر پہنچے۔ نبی کریم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت ہوئی۔ یہ بیعت عقبۂ ثانیہ کہلاتی ہے۔[۲]

ہجرت:

اسی موقع پر انہوں نے نبیٔ کریم ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لے آیئے، ہم جس طرح اپنی جان کی، اپنے اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہیں،

---

(۱) سیرۃ ابن ھشام: ۱/ ۴۳۱-۴۳۳.

(۲) سیرۃ ابن ھشام: ۱/ ۴۳۸-۴۴۱.

آپ کی بھی حفاظت کریں گے، اور اس دعوتِ ایمان میں ہم آپ کا پورا پورا ساتھ دیں گے، اور تعاون کریں گے۔ چناں چہ ۱۳ سنہ نبوی مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کو مدینہ منورہ ہجرت کی اجازت دی۔ پہلے کچھ صحابہ وہاں پہنچے، جیسے حضرت عمرؓ وغیرہ۔ یہاں تک کہ ماہ ربیع الاول میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اجازت دی، اور آپ بھی ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔[۱]

آپسی لڑائی کی ہوگئی صفائی:

مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد مکہ والوں کو اور زیادہ غصہ آیا کہ یہ لوگ تو وہاں چلے گئے!!! وہ تو دین کے دشمن تھے، انہوں نے ان کو مدینہ منورہ میں بھی چین سے رہنے نہیں دیا۔ چناں چہ یہاں رہ کر بھی مدینہ منورہ والوں کو کہلواتے تھے، دھمکیاں دیتے تھے کہ تم نے ان کو پناہ دی ہے، ہم تم پر حملہ کریں گے اور تم سے مقابلہ کریں گے، تم ان کو مدینہ سے نکالو۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے ان کو آپس میں اندرونی طور پر بھی ابھارنے کی کوشش کی۔ ایمان نہ لانے والوں اور عبداللہ بن ابی - جو ظاہری ایمان بھی نہیں لایا تھا- کو لڑائی کے لیے آمادہ کیا، یہاں تک کہ ایک موقع پر آپس میں باقاعدہ ٹکراؤ کی صورت بھی پیدا ہوگئی؛ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عین وقت پر پہنچ گئے، اور لوگوں کو سمجھایا کہ یہ تو تم کو آپس میں لڑا کر نقصان کرنا چاہتے ہیں۔ اور معاملہ صاف کر دیا۔ جب ان کی طرف سے مایوس ہو گئے، تو انہوں نے (مکہ والوں نے) یہودیوں کو خط لکھا کہ تم قلعوں والے اور ہتھیار والے ہو، ان لوگوں کو تم اپنے وہاں سے نکالو۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کے ساتھ پہلے ہی امن کا معاہدہ کر لیا تھا۔

---

(۱) سیرۃ ابن ھشام: ۱/۴۶۸-۴۹۲.

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خواب:

بہر حال ! مکہ والوں کو چین نہیں پڑا، تو لشکر لے کر بار بار مدینہ پر حملے کیے۔ جنگ بدر ہوئی، جنگ احد ہوئی، جنگ خندق ہوئی، مختلف جنگیں ہوئیں، اور جنگ خندق کے بعد والے سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کے سامنے اپنے اس خواب کا تذکرہ کیا۔[۱] تو جو صحابہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے تھے، ان کو مدینہ میں چھٹا سال چل رہا تھا، ظاہر ہے کہ وہ مکہ میں پیدا ہوئے، زندگی کا بڑا حصہ وہاں گزارا تھا، مکہ کی یاد تو ان کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی، جب یہ خواب سنا تو بے چین ہو گئے۔ اور نبی کا خواب وحی کے حکم میں ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے کہا کہ ہم چلیں گے، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تیار ہو گئے۔

صلح حدیبیہ:

بہر حال ! تقریباً ڈیڑھ ہزار کا قافلہ عمرہ کے لیے چلا۔[۲] اور مکہ والوں کو پتہ چلا، تو انہوں نے پہلے ہی سے تیاریاں کر لیں، قریش کے علاوہ مکہ کے آس پاس رہنے والے دوسرے قبائل کو بھی مقابلہ کے لیے اپنا ہم خیال بنا لیا، اور طے کر لیا کہ کسی بھی حال میں ان کو مسجد حرام میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اگر یہ داخل ہو گئے تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب ان حالات کا علم ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدھے جانے کے بجائے

---

(۱) تفسير الطبري (سورة الفتح) ونقله الحافظ في الفتح في التعبير عن الفريابي و عبد بن حميد و الطبري عن طريق ابن أبي نجيح عن مجاهد.

(۲) قال ابن اسحاق: وكان جابر بن عبد الله فيما بلغني يقول: كنا أصحاب الحديبية أربع عشرة مائة، السيرة النبوية لابن اسحاق ص: ۴۵۴ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت) وصحيح البخاري: ۴۸۴.

راستہ بدل کر آگے بڑھے۔ چناں چہ مقام حدیبیہ میں آپ ﷺ کی اونٹنی اللہ کے حکم سے بیٹھ گئی، اٹھانا چاہا تو اٹھی، دوبارہ بیٹھ گئی اور پھر نہ اٹھی۔[۱] حضور ﷺ کو وحی کے ذریعہ مکمل بات بتلا دی گئی کہ اس وقت آپ کو مکہ جانے کا موقع نہیں ملے گا، اور اس بات سے بھی آگاہ کیا گیا کہ اگر آپسی صلح کی کوئی صورت نکل آئے، تو آپ اس کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ چناں چہ آخر میں دس سال کے لیے صلح ہوئی، اور آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے بغیر عمرہ کیے لوٹے۔ اس صلح کی شرائط میں پہلی شرط یہ تھی کہ اس سال تو یہ لوگ بغیر عمرہ کے واپس جائیں گے؛ البتہ آئندہ سال ان ہی دنوں میں دوبارہ آئیں گے اور عمرہ کریں گے۔ دیگر شرائط بھی تھیں، جیسے: دس سال تک ہم باہم جنگ نہیں کریں گے، اور ہماری صلح میں جو دوسرے قبائل شریک ہونا چاہیں، تو وہ شریک ہو سکتے ہیں۔[۲]

خدا کی قسم! یہ فتح ہے:

چناں چہ جب صلح مکمل ہو گئی، تو صلح کے مطابق نبی کریم ﷺ عمرہ کیے بغیر حدیبیہ سے واپس لوٹے۔ جب واپس لوٹ رہے تھے، تو سورۂ فتح کی شروع کی آیتیں: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۔ (سورۃ الفتح: ۱-۲) نازل ہوئیں۔ جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو حضور اکرم ﷺ نے حضرات صحابہ سے فرمایا کہ آج ایسی عجیب وغریب سورت نازل ہوئی جو میرے نزدیک دونوں جہاں سے زیادہ قیمتی اور محبوب ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیتیں

---

(۱) السيرة النبوية لابن إسحاق ص: ۴۵۵ وصحيح البخاري: ۲۷۳۱ و ۲۷۳۲.

(۲) السيرة النبوية لابن إسحاق ص: ۴۶۱- ۴۶۲.

پڑھ کر سنائیں۔[۱] اس سورت میں صلح کا جو واقعہ پیش آیا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے فتح سے تعبیر کیا ہے، تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ فتح ہے؟ یہ تو ہم نے بہت دب کر صلح کی ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! یہ فتح ہے۔[۲] چناں چہ بعد کے حالات نے بتلایا کہ واقعۃً یہ فتح مبین ہے۔ خیر! صلح کے بعد امن وسکون ہو گیا، ان کے حملے نہیں ہوئے۔ اس کے بعد دوسرے سال شرط کے مطابق ۷ھ میں حضور ﷺ صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کے لیے تشریف لے گئے، اور عمرہ سے فارغ ہوئے۔

عہد شکنی:

مکہ والوں کا تو شرائط پر باقی رہنا مشکل تھا۔ مکہ مکرمہ کے قرب وجوار میں دو قبیلے رہتے تھے: بنوخزاعہ اور بنوبکر۔ ان دونوں میں آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں، تو بنوبکر مکہ والوں کا حلیف (ally) تھا، اور بنوخزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے۔ اب جب مسلمان اور قریش کی صلح ہوئی، اور لڑائیاں ختم ہوئیں، تو ان کو اپنی پرانی لڑائیاں یاد آئیں، اور پھر لڑائی شروع ہوئی۔ اس موقع پر قریش نے ان کا ساتھ دیا، یہ شرط کے خلاف تھا۔ یہ مکہ والے یوں سمجھتے تھے کہ ہماری اس حرکت کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا؛ لیکن جب قریش نے بنوبکر کا ساتھ دیا اور جس قبیلہ کے خلاف یہ حرکت کی تھی یعنی بنوخزاعہ، اس کا ایک پورا وفد مدینہ منورہ پہنچا، اور سارے حالات نبی کریم ﷺ سے بیان کیے۔ **اسی کی بنیاد پر حضور ﷺ نے مکہ والوں کو اطلاع دی کہ تمہارے جس قبیلہ نے یہ حرکت کی ہے تم ان کے ساتھ اپنا معاملہ ختم کر دو، یا**

---

(۱) صحیح مسلم: ۱۷۸۶ و تفسیر الطبری و أسباب النزول للواحدي (سورۃ الفتح).

(۲) صحیح البخاری: ۴۸۳۳ و ۴۸۴۴ و صحیح مسلم: ۱۷۸۵.

جتنے آدمی مارے گئے ہیں ان کی دیت ادا کردو۔ یا ہماری صلح ختم کردو۔ تو انہوں نے اس سے انکار کردیا اور کہلوا دیا کہ ہاں! صلح ختم کردو۔ ان لوگوں نے کہلوا تو دیا؛ لیکن بعد میں افسوس ہوا کہ صلح ختم ہوگئی، یہ تو بڑی خطرناک بات ہوگئی۔ چناں چہ انہوں نے دوبارہ ابوسفیان کو مدینہ منورہ صلح کی تجدید (Renew) کرنے کے لیے بھیجا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح کی تجدید نہیں فرمائی۔ یہ ۸ سنہ ھ کا واقعہ ہے۔[۱]

فتح مکہ کے لیے روانگی:

ابوسفیان کے لوٹنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو تیاری کا حکم دیا۔ چناں چہ ۱۰۰۰۰ (دس ہزار) کا ایک بڑا لشکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرکردگی میں مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوا۔[۲] چوں کہ مکہ مکرمہ حرم ہے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلی خواہش یہ تھی کہ ہم لشکر لے کر مکہ مکرمہ پر چڑھائی کے لیے تو جارہے ہیں؛ لیکن ایسی صورت پیدا کی جائے کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے، اور خون بہے بغیر اللہ تعالیٰ ہمیں فتح عطا فرمادے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احتیاط برتی کہ دوسال پہلے تو عمرہ کے لیے گئے تھے، تو ان کو پتہ چل گیا تھا، اور انہوں نے مقابلہ کی تیاریاں کرلی تھیں، اور اس مرتبہ ایسی رازداری سے کام لیا کہ اتنا بڑا لشکر گیا تب بھی ان کو پتہ تک نہ ہوا۔ بلکہ جتنے ناکے تھے، ان سب کو بند کردیا تھا تاکہ اطلاع پہنچنے ہی نہ پائے۔ مکہ مکرمہ والوں کو ڈر تو تھا ہی، کہ ہم نے صلح توڑی ہے اب کہیں حملہ نہ ہو۔ تو ان کے سردار ابوسفیان اسی فکر میں چکر لگایا کرتے تھے۔

---

(۱) سیرۃ ابن هشام ۲/ ۳۹۶-۳۹۷.

(۲) السیرۃ النبویۃ لابن إسحاق ص: ۵۳۷ وسیرۃ ابن هشام: ۲/ ۳۲۲.

ابوسفیان کی گرفتاری اور قبول اسلام:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنا بڑا لشکر لے کر روانہ ہوئے اور لشکر مکہ مکرمہ کے بالکل قریب مقام مر الظہر ان پہنچ گیا۔ایک مرتبہ ان کے سردار ابوسفیان رات کو نکلے ہوئے تھے،انہوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا لشکر ہے، چولہے جل رہے ہیں اور بہت بڑا مجمع ہے۔پھر معلوم ہوا کہ یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لشکر ہے!!! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لشکر کے جو چوکیدار گشت کر رہے تھے-جن کو گشتی دستہ (patrolling army) کہا جاتا ہے-انہوں نے ابوسفیان کو گرفتار کر لیا۔ اسی رات ابوسفیان حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سمجھانے سے ایمان لے آئے۔[۱] بہر حال! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو خواہش تھی کہ مکہ مکرمہ والوں کو آخر تک پتہ نہ چلے؛ وہ پوری ہوئی، اور ان کو بالکل پتہ ہی نہ چلا۔ابوسفیان باہر آئے تھے ان کو پتہ بھی تھا؛لیکن وہ تو پکڑ لیے گئے، لہٰذا ان کو واپس جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔

الیوم یوم المرحمة:

دوسرے دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے لیے روانہ ہوئے، اور جب پورا لشکر مکہ کی جانب آگے بڑھا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو ایسی جگہ لے کر کھڑے رہو، جہاں سے وہ پورے لشکر کا نظارہ کریں۔ چناں چہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ ان کو ایک تنگ جگہ پر لے کر کھڑے ہوئے۔لشکر کے دستے گزرتے تھے، ابوسفیان پوچھتے تھے: یہ کون؟ یہ کون؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ انہیں بتلاتے تھے۔[۲] یہاں تک کہ

---

(۱) السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ۲/ ۴۰۲-۴۰۴.

(۲) السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: ۲/ ۴۰۳-۴۰۴.

ایک بہت بڑا دستہ-جس میں حضورﷺ کے خاص صحابہؓ تھے،ان کا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہؓ کے ہاتھ میں تھا-گزرا،انہوں نے جب حضرت ابوسفیان کو دیکھا تو ان کو جوش آیا اور بولے کہ:

اليوم يوم الملحمة اليوم تستحل الكعبة (أو الحرمة)

ترجمہ: آج تو جنگ کا دن ہے،آج تو کعبہ کو اللہ کی طرف سے خون خرابہ کے لیے حلال کیا جائے گا۔

ابوسفیان نے جب یہ بات سنی تو ڈر گئے،ان کے بعد پھر مخصوص صحابہ کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی آئی،اس میں حضورﷺ بھی تھے۔جب حضورﷺ سامنے سے گزرے تو ابوسفیان نے حضورﷺ سے کہا کہ سعد بن عبادہؓ نے کیا کہا آپ نے سنا؟ حضورﷺ نے فرمایا: کیا کہا؟ تو انہوں نے ان کی وہ بات نقل کی۔حضورﷺ نے فرمایا: نہیں! آج رحمت کا دن ہے آج تو کعبہ کی عظمت دوبالا ہو جائے گی،اور کعبہ کو غلاف پہنایا جائے گا۔[۱] پھر حضورﷺ نے اولاً حضرت علی کو اور پھر حضرت سعد بن عبادہ کے بیٹے قیس بن سعد کو جھنڈا دینے کا حکم دیا۔

تواضع وانکساری کی لاجواب مثال:

اس طرح یہ قافلہ آگے بڑھا۔نبی کریمﷺ اپنی اونٹنی پر سوار تھے،آپﷺ نے اپنے پیچھے اپنے لاڈلے اسامہ بن زید کو بٹھا رکھا تھا،اور ایسی حالت میں آپﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے کہ تواضع اور انکساری سے آپﷺ کا چہرۂ انور اتنا جھکا ہوا تھا کہ آپ کی داڑھی مبارک اونٹ کے کجاوے کی لکڑی سے لگ رہی تھی۔[۲] اور حضورﷺ سورۂ فتح کی

---

(۱) صحيح البخاري: ۴۲۸۰ وقال الحافظ ضمن هذا الحديث: ذكره الأموي في المغازي اه، قلت: هو سعيد بن يحيى الأموي.

(۲) السيرة النبوية لابن هشام: ۴/۴۰۵ ودلائل النبوة للبيهقي: ۵/۶۹ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

شروع کی آیتیں: اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا تلاوت کررہے تھے۔ **بخاری شریف کی روایت میں حضرت عبداللہ بن مغفل** رضی اللہ عنہ **سے یہ کیفیت منقول ہے۔**[۱] **حالاں کہ یہاں سے تو آپ** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **نکالے گئے تھے، ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے، اور اتنے زمانے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی تو ذرہ برابر بھی اکڑ اور اتراہٹ نہیں ہے؛ بلکہ پوری تواضع اور انکساری کے ساتھ داخل ہورہے ہیں۔**

دنیا کے بادشاہ ہوتے تو نہ جانے کتنا خون بہاتے اور کیسی اکڑ کا مظاہرہ کرتے، قرآن کریم میں ایک جگہ دنیا کے بادشاہوں کا طریقہ نقل کیا گیا ہے کہ اِنَّ الۡمُلُوۡكَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡيَةً اَفۡسَدُوۡهَا وَ جَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً۔(النمل:۳۴) (جب وہ کسی آبادی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب و برباد کرکے رکھ دیتے ہیں اور اس کے عزت والے لوگوں کو ذلیل بنادیتے ہیں) **لیکن نبی کریم** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **فتح مکہ کے موقع پر جب مکہ میں داخل ہورہے ہیں، تو اس طرح تواضع اور انکساری کے ساتھ، روتے ہوئے، سورۂ فتح کی آیتیں پڑھتے ہوئے داخل ہورہے ہیں۔ ذرہ برابر بھی کوئی غرور وتکبر کا اظہار نہیں ہے۔**

منہ کے بل گرکے......:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح داخل ہوئے کہ اپنی چچازاد بہن، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر پر تشریف لے گئے، غسل فرمایا، آٹھ رکعتیں ادا فرمائیں، اس کے بعد حرم میں تشریف لائے۔[۲] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اونٹنی پر تھے، مکہ والوں نے کعبہ کی چاروں طرف ۳۶۰/بت سیسے کے ذریعہ دیوار کے ساتھ چپکائے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اونٹنی

---

(۱) صحيح البخاري: ۴۲۸۱.

(۲) صحيح البخاري: ۱۱۰۳.

پر طواف کررہے ہیں اور جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا. (الاسراء:۸۱) پڑھتے ہوئے اپنی لکڑی سے اشارہ کررہے ہیں، اور بت گرتے جارہے ہیں۔ اسی طرح سارے بت سرنگوں ہوگئے۔[۱] پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عثمان بن طلحہ کے پاس سے کعبۃ اللہ کی چابی منگوائی دروازہ کھولا اندر بھی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ وغیرہ کی تصاویر تھیں، پہلے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ تصاویر مٹوائیں، پھر اندر داخل ہوئے۔ حضرت عثمان بن طلحہ، حضرت بلالؓ، حضرت اسامہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔ اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ ہر کونہ پر اللہ تعالیٰ کی تسبیح، تحمید، تکبیر کی۔ کافی دیر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دروازہ کھولا۔[۲] اور کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا۔ اس خطبے میں بنیادی بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کو خطاب کرکے یہ فرمائی تھی: اے قریش! زمانۂ جاہلیت کا جو غرور ہے اور تم اپنے آباء واجداد پر جو اتراتے ہو اللہ تعالیٰ نے وہ سب ختم کردیا ہے۔ الناس من اٰدم و اٰدم من تراب. (سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا ہے) اور پھر آیت کریمہ: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ. (الحجرات:۱۳) تلاوت فرمائی۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اعلان کردیا کہ فخر وغرور اور قریش اپنے آپ کو سب سے اونچا سمجھتے ہیں وہ کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اگر کسی کی عزت ہے، تو وہ تقویٰ اور نیک عمل کی وجہ سے ہے۔[۳]

---

(۱) صحيح البخاري: ۴۲۸۷ و صحيح مسلم: ۱۷۸۱ و دلائل النبوة للبيهقي ۵/ ۷۱-۷۳ وسبل الهدىٰ والرشاد للصالحي الشامي: ۵/ ۲۳۴ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

(۲) السيرة النبوية لابن هشام: ۲/ ۴۱۱ وصحيح البخاري: ۴۲۸۸ و دلائل النبوة للبيهقي: ۵/ ۷۴.

(۳) سيرة ابن إسحاق ص: ۵۳۴.

لاتثریب علیکم الیوم:

جب آپ ﷺ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے، تو اتنی دیر میں پورے مکہ والے جمع ہو گئے، آپ ﷺ نے پہلے سے اعلان کر دیا تھا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو اس کو امن ہے، جو مسجد حرام میں آ جائے اس کو امن ہے، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اس کو امن ہے، جو اپنے ہتھیار پھینک دے، اس کو امن ہے۔[۱] چناں چہ مکہ کے تمام کافر و غیر مسلم مسجد حرام میں موجود تھے، مسجد حرام کھچا کھچ بھری ہوئی ہے اور آپ ﷺ نے خطبہ دیا۔ خطبے کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا: اے قریش! تمہارا کیا خیال ہے؟ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ اس کے جواب میں قریش کی طرف سے ان کے سرداروں میں سے ایک سہیل بن عمرو نے کہا: أخ کریم و ابن أخ کریم (آپ تو شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں) ہم آپ سے بھلائی ہی کی امید رکھتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تم کو آج وہی بات کہتا ہوں، جو حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: لاتثریب علیکم الیوم (آج تم کو کوئی طعن و تشنیع بھی نہیں کی جائے گی) اذھبوا أنتم الطلقاء (جاؤ! تم سب آزاد ہو)[۲] دنیا میں تو دستور یہ ہے کہ کوئی معاف بھی کر دے، تو ٹونٹنگ تو کرتا ہی ہے کہ جا! تیرے جیسے نالائق کو کیا کرنا، یوں کر کے ایک دو بات سنا دیتے ہیں۔ مگر حضور ﷺ نے ایک جملہ بھی نہیں کہا۔ یہ آپ ﷺ کے اخلاق تھے۔ جنھوں نے ۱۳ رسال تک ایسا ستایا کہ ظلم و ستم کی کوئی شکل نہیں چھوڑی تھی؛ لیکن آج جب اللہ تعالیٰ نے قابو دیا تو آپ ﷺ نے اس طرح اپنے اخلاق کریمانہ کا مظاہرہ فرمایا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ

---

(۱) صحیح مسلم: ۱۷۸۰ وسنن أبی داود: ۳۰۲۱ و ۳۰۲۲.

(۲) سیرۃ ابن إسحاق ص: ۵۳۱ و دلائل النبوۃ للبیهقي: ۵/۵۷-۵۸.

سب کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دی، اور سب ایمان لائے۔ یہ آپ ﷺ کے اخلاق ہی کے نتیجہ میں ہوا۔ اس طرح مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ اسی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت میں بتلایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد آجائے، اور مکہ فتح ہو جائے، تو اس کے بعد آپ ﷺ دیکھیں گے کہ لوگ گروہ در گروہ، جماعت در جماعت ایمان میں داخل ہوں گے۔

وفود کی آمد:

دیکھیے! قریش کے علاوہ عرب کے بعض قبائل کے سامنے نبی کریم ﷺ کی حقانیت اور آپ ﷺ کا اللہ کا سچا رسول ہونا واضح ہو چکا تھا؛ لیکن قریش کے ڈر کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لاتے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ اگر آپ ﷺ کو اپنی قوم پر غلبہ حاصل ہو جائے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ چناں چہ جب مکہ فتح ہوا اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو قریش پر غلبہ دیا، تو حال یہ ہوا کہ جب آپ ﷺ مدینہ واپس لوٹے تو ۸ سنہ ھ ختم ہو رہی تھی اور ۹ سنہ ھ کا پورا سال ایسی حالت میں گزرا کہ عرب کے تمام علاقوں سے ہر قبیلہ سے وفود آتے تھے اور وہ اپنے قبیلہ کے اسلام لانے کی خبر دیتے تھے۔

بشارت یا خبر:

اگر یہ مانا جائے کہ یہ سورت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی تو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت دی گئی ہے۔ اور اگر بعد میں مانا جائے تو خبر دی جا رہی ہے۔ لیکن جب فتح ونصرت ہو جائے، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ. تو آپ اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کیجیے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیے۔

آپ نے سورت پڑھ کر سنائی تو کیا ہوا......؟؟؟

جب یہ سورت نازل ہوئی اور آپ ﷺ نے پڑھ کر سنائی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ حضور ﷺ نے پوچھا: آپ کیوں روتے ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے رخصت ہونے کی خبر دی ہے۔[۱] اللہ نے آپ کو دنیا میں بھیجا تھا؛ تاکہ ایمان دنیا میں پھیلے۔ پورے جزیرۃ العرب میں جب سب لوگ ایمان لے آئیں گے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب واپسی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو دنیا میں رہنے نہیں دیں گے، اور اپنے پاس واپس بلا لیں گے۔ حضور ﷺ نے جب سنا تو فرمایا: تم ٹھیک کہتے ہو۔

میں بھی یہی سمجھتا ہوں......:

چناں چہ بخاری شریف میں بھی موجود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر اپنے قریب رکھتے تھے، بڑے بڑے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جو بدریین میں سے تھے ان کی حاضری کے موقع پر بھی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلانے کا اہتمام کرتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک مرتبہ پوچھا: ہماری اولاد، ہمارے لڑکے ان کی عمر کے ہیں، ہماری حاضری کے موقع پر آپ ان کو اپنے پاس بلاتے ہیں؟ تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ ان کا تعلق کس گھرانے سے ہے تم جانتے ہو؟ یعنی نبوت کے گھرانے سے ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ کو بلایا، یہ حضرات بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

---

(۱) أنوار التنزيل وأسرار التأويل للبيضاوي: ۵/ ۳۴۴ (ط: دار إحياء التراث العربي بيروت).

ان لوگوں سے پوچھا: بتاؤ! اس سورت (سورۂ نصر) کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ پھر انہوں نے سورۂ نصر پڑھی۔ انہوں نے کہا: اس میں یہ ہے کہ جب ملک فتح ہوں گے، اس وقت تم اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ بعض تو خاموش رہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ انہوں کہا: میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے قریب ہونے کی خبر دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں! جو تم سمجھتے ہو میں بھی وہی سمجھتا ہوں۔[۱]

بہر حال! اس میں ایک طرف جہاں خوش خبری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمایا، وہیں یہ بھی ہے کہ جس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دنیا میں بھیجا تھا وہ کام ہو گیا۔ تو جب مقصد پورا ہو جاتا ہے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو واپس بلا لیا جائے گا، گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی موت کی خبر دی گئی ہے۔

اس سورت کے متعلق مزید باتیں آئندہ مجلس میں بیان کریں گے۔ (ان شاء اللہ)

---

(۱) صحيح البخاري: ۴۹۶۹ و ۴۹۷۰.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ نصر

(قسط-۲)

(مؤرخہ ۸/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۲/جولائی ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ ﴿۱﴾ وَ رَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِيۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ﴿۲﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ اسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

گذشتہ مجلس میں:

گذشتہ مجلس میں بتلادیا گیا تھا کہ سورۂ نصر قرآن پاک میں سب سے آخر میں مکمل نازل ہونے والی سورت ہے۔ اس میں باری تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ (جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے)

وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا (اور جب آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں)

فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ اسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔

(تو آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیجیے اور اس سے مغفرت طلب کیجیے۔ بے شک وہ بہت زیادہ معاف کرنے والا ہے)

اس سورت سے متعلقہ بنیادی باتیں گذشتہ مجلس میں آپ کو بتلادی گئیں۔ البتہ اس سورت میں ہمارے لیے کچھ سبق بھی ہیں، ان کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

دیکھیے! اس سورت کو اللہ تعالیٰ نے اذا جاء نصر اللہ و الفتح. سے شروع فرمایا ہے۔ یعنی اللہ کی مدد آئے اور مکہ فتح ہو جائے، بتلایا گیا تھا کہ یہاں فتح سے فتح مکہ مراد ہے۔

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو لفظ استعمال فرمائے: (۱) نصر اللہ (۲) والفتح۔ جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح۔ اگر مختصر طریقہ سے پیش کرنا ہو تو اذا جاء الفتح، جب مکہ فتح ہو جائے، تو آپ یہ کام کرو۔ یہ کہا جاتا؛ لیکن پہلے لفظ نصر اللہ لایا گیا۔ دو الگ الگ لفظ استعمال کرنے میں بڑی حکمت ہے۔

(۱) پہلی حکمت اور سبق یہ ہے کہ مکہ کی فتح اللہ کی مدد سے حاصل ہو گی۔ گویا لفظ **نصر اللہ کو پہلے لاکر ایک سبق دیا کہ آدمی کو جب بھی کسی چیز میں کامیابی حاصل ہو گی تو اس کامیابی کا سبب اور ذریعہ اللہ کی مدد ہو گی۔** یہ بنیادی چیز ہے۔ ہم اپنی زندگی کے تمام شعبوں

میں مختلف مقاصد حاصل کرنے کے لیے محنت کرتے اور مختلف اسباب اختیار کرتے ہیں، نتیجۃً جو کامیابی حاصل ہوتی ہے، وہ اسباب کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ اللہ کی مدد سے حاصل ہوتی ہے۔

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

سب کچھ اللہ ہی کی مدد سے ہوا کرتا ہے، کوئی اور مؤثر نہیں ہے۔ اگر دشمن کے مقابلہ میں جنگ ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی (جیسا کہ یہاں فتح کا تذکرہ ہے) تو وہ فتح اسباب کی وجہ سے، زورِ بازو کی وجہ سے، ساز وسامان کی وجہ سے یا تدابیر کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی؛ بلکہ اللہ ہی کی مدد سے حاصل ہوئی۔

ہم روزگار کے لیے محنت وکوشش کرتے ہیں، اور کامیابی حاصل ہوتی ہے، تو ہمیں اس موقع پر یہ چیز مستحضر رکھنی چاہیے اور اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ جو کچھ حاصل ہوا وہ اللہ کی مدد اور اس کے کرم سے حاصل ہوا۔ ہمارے زورِ بازو اور ہماری محنت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اصل مؤثر اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔

آپ قرض کی ادائیگی کے لیے محنت کر رہے ہیں اور قرض ادا ہوگیا تو یہ نہ سمجھیں کہ میں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ نہیں! بلکہ اللہ کی مدد اور اس کے کرم سے قرض ادا ہوا۔

آپ اولاد کے حصول کے لیے محنت کر رہے ہیں اور اولاد حاصل ہو جائے، تو اس میں آپ کے زورِ بازو کا اور آپ کی کسی تدبیر کا دخل نہیں؛ بلکہ اللہ کے فضل وکرم اور اس کی مدد سے یہ کام ہوا۔

ایک طالب علم نے محنت کی، اور امتحان میں اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوا، تو اس کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ میں اپنی محنت کی وجہ سے کامیاب ہوا ہوں؛ بلکہ اللہ کے فضل و کرم اور اس کی مدد سے یہ کامیابی حاصل ہوئی۔

انسان کے بس کی بات نہیں:

الغرض! ہر جگہ اصل اللہ کی مدد ہے، اور اس کا فضل و کرم ہے۔ جب بھی آپ کو کسی شعبہ میں، کسی میدان میں، کسی بھی موقع پر کامیابی ملے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرو اپنی طرف نہیں۔ ایک مؤمن کے دل و دماغ میں ہمیشہ یہ چیز مستحضر رہنی چاہیے۔ اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا کو دارالاسباب بنایا ہے، اور انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اسباب جمع کر لے، اور انہیں اختیار کر لے؛ لیکن ان اسباب میں اثر ڈالنا، اور اس کے بدلہ میں مطلوبہ نتیجہ حاصل ہونا، یہ انسان کے بس کی چیز نہیں ہے، جب تک اللہ کی مدد شامل حال نہ ہو۔

یہ نہ کہیے:

آپ بیمار ہوئے، ڈاکٹر کے پاس گئے، علاج کیا، پیسے خرچ کر کے دوائی لی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے صحت عطا فرمائی، تو یہ نہ کہیے کہ دوائی سے تندرستی حاصل ہوئی، فلاں ڈاکٹر کے علاج سے صحت حاصل ہوئی۔ نہیں! بلکہ اللہ کے حکم سے حاصل ہوئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی بیماری ہے، ایک ہی ڈاکٹر ہے، ایک ہی دوا ہے؛ لیکن ایک آدمی کو فائدہ حاصل ہوتا ہے، شفا اور صحت حاصل ہوتی ہے، اور دوسرے کو حاصل نہیں ہوتی۔ اگر کسی دوا ہی کا اثر ہوتا یا ڈاکٹر کی تدبیر ہی کی کرشمہ سازی ہوتی یا اس کی کسی کوشش کا دخل ہوتا، تو اس صورت میں ہر ایک کو شفا ملنی چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اسباب کسی کے حق میں کارگر ہوتے ہیں اور کسی کے حق میں نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتے ہیں فیصلہ کرتے ہیں، اللہ کی مدد ہی سے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

گاہک کون بھیجتا ہے؟

تجارت کرتے ہیں، کماتے ہیں، بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ میں نے کمایا، میرے زورِ بازو سے یہ چیز حاصل کی ہے۔ **بھائی! آپ نے کیا کیا؟ صرف ایک دکان کھولی، ذاتی یا کرایے کی، اس میں کمپنی سے یا کسی اور بڑی دکان سے سامان لاکر رکھ دیا، گویا تجارت کے لیے جو اسباب ہونے چاہیے وہ آپ نے اختیار کر لیے۔ لیکن گاہک کون بھیجتا ہے؟ خریدنے والوں کے دل میں کون ڈالتا ہے کہ وہ آپ کی دکان پر آ کر خریداری کریں؟ بیشک وہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔** اس میں آپ کے اِن اسباب ووسائل کو کوئی دخل نہیں ہے۔

کرشمہ قدرت کا:

ہم نے ایسے منظر بہت دیکھے اور آپ بھی دیکھتے ہوں گے کہ دو دکانیں ہیں، جیسے فرسان والوں کی دکانیں، نوساری میں کسی زمانہ میں ایک دکان کا فرسان (ફરસાણ) مشہور تھا، اس کے پڑوس میں دوسری دکان بھی فرسان (ફરસાણ) کی تھی، اس کے پاس بھی ہو بہو اسی طرح کا مال ہوتا تھا؛ لیکن پہلی دکان پر بھیڑ لگی ہوتی تھی، اس کو فرصت نہیں ہے۔ اور دوسری دکان پر ایک بھی گاہک نہیں ہے۔ گاہک کے دل میں ڈالنا کہ اسی کی دکان سے خریدے، یہ کس کا کام ہے؟ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے!!! کوئی یوں نہ سمجھے کہ یہ میرا کمال ہے۔

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ:

کوئی طالب علم یوں نہ سمجھے کہ میری محنت سے ہوا۔ کیوں کہ جس طرح وہ رات بھر جاگا ہے، اسی طرح دوسرے بھی رات بھر جاگے ہیں، انہوں نے بھی کتاب کا مطالعہ کیا ہے،

انہوں نے بھی امتحان کے لیے ویسی ہی تیاری کی ہے، جیسی اس نے کی؛ بلکہ وہ اس سے زیادہ بیدار رہے ہیں، اور زیادہ محنت کی ہے؛ لیکن ان کو اتنے مارکس اور اتنے نمبر نہیں ملے جتنے اس کو ملے ہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہوا، وہ اللہ کی مدد سے، اللہ کے کرم اور فضل سے ہوا۔

پھر کبر پیدا نہ ہوگا:

گویا اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ نصر اللہ بڑھایا، تو اصل تو فتح آئی ہے؛ لیکن فتح کیسے آئی؟ اللہ کی مدد سے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ کا اضافہ کر کے ہم لوگوں کو یہ سبق دیا ہے کہ کسی بھی میدان میں آپ کو جب بھی کامیابی حاصل ہوگی، تو اس کامیابی میں اصل چیز اللہ کی مدد اور اس کا فضل و کرم ہے۔ جب بھی کوئی کامیابی حاصل ہوگی آپ کے کسی زورِ بازو کو، آپ کی کسی تدبیر کو، آپ کی کسی محنت کو اور آپ کے کسی کمال کو اس میں دخل نہیں ہے۔ یہ بات آپ ہمیشہ اپنے ذہن میں بٹھائے رکھیے۔ جب آدمی یہ بات اپنے دل و دماغ میں بٹھائے رکھے گا، تو اس کی نظر اللہ پر ہوگی کہ میرے کام بنانے والا تو اللہ ہے۔ اور پھر اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کبر پیدا نہیں ہوگا۔ پھر وہ اللہ کا شکر ادا کرے گا کہ اللہ تیرا شکر ہے تو نے مجھے اس چیز میں کامیابی عطا فرمائی۔ بہر حال! ہمیں پہلا سبق یہ دیا گیا کہ ہر کامیابی کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔ اس لیے یہاں لفظ نصر اللہ کو پہلے لایا گیا۔

کامیابی کے بعد دو کام کرے:

(۲) دوسرا سبق اور حکمت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آدمی کو کامیابی عطا فرمائے، تو کامیابی کے بعد اس کو کیا کرنا چاہیے؟ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیجیے۔ اور اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی

مانگیے) کامیابی کے بعد یہ دو کام کرنے ہیں: (۱) اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرنی ہے۔ گویا اس نعمت کے ملنے پر اللہ کی تعریف کی جائے گی، اللہ کا شکر ادا کرو کہ اللہ تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے اس میں کامیابی عطا فرمائی۔ اگر تیری طرف سے اس میں کامیابی نہ ڈالی جاتی، تو میری تدبیر کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا شکر ادا کرو۔

شیطان کبر کی راہ سے برباد کرتا ہے:

شکر کی طرف کیوں متوجہ کیا گیا؟ اس لیے کہ آدمی جب شکر ادا کرے گا تو تکبر سے بچے گا، کیوں کہ انسان کو جب کسی میدان یا شعبہ میں کامیابی حاصل ہوتی ہے، تو پہلے اس میں اکڑ اور غرور پیدا ہوتا ہے کہ میری محنت و کوشش سے، میرے زورِ بازو سے میں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ سے نظر ہٹ جائے گی اور آدمی کبر میں مبتلا ہوگا، اور شیطان اسی کبر کی راہ سے اس کو برباد کر دے گا۔ اس کے بجائے اگر شکر ادا کرے گا کہ اللہ تیرا شکر اور احسان ہے کہ تو نے مجھے محض اپنے فضل سے یہ چیز عطا فرمائی، اس میں میری کسی سعی کو دخل نہیں ہے، تو اس صورت میں کبر پیدا نہیں ہوگا۔

دیکھیے! فتح مکہ کے موقع پر کیا ہوا؟ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوتے وقت اپنی اونٹنی پر سوار تھے، پیچھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لاڈلے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ فتح کی ابتدائی آیتیں: اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَيَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا (الفتح:۱-۲) بڑے ترنم کے ساتھ پڑھ رہے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گردن جھکی ہوئی تھی، اتنی جھکی ہوئی کہ آپ کی داڑھی

مبارک کجاوے کی لکڑی کے ساتھ لگ رہی تھی۔[۱]

جس نے زخم کھا کر پھول برسائے:

حالاں کہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ جب کوئی بادشاہ کوئی ملک فتح کرتا ہے تو بڑی اکڑ کے ساتھ سینہ تان کر اس آبادی میں داخل ہوتا ہے۔ اور اس آبادی میں رہنے والوں کے ساتھ بھی ظلم وزیادتی کا معاملہ کرتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بادشاہوں کا یہ وطیرہ اور طریقہ بتلایا ہے: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً. (النمل: ۳۴) (دنیا کے بادشاہوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ کسی آبادی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں، تو اس آبادی کو برباد کر ڈالتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر کسی تکبر کے، بغیر کسی اکڑ کے، بغیر سینہ تانے؛ بلکہ اپنے سر کو جھکائے ہوئے پوری تواضع، عجز وانکساری کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں اور یہ آبادی بھی کون سی؟ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ۱۳ر سال تک خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ کو ظلم وستم کی چکی میں پیسا تھا۔ ظلم وزیادتی کی کوئی شکل ایسی نہیں تھی جو انھوں نے چھوڑی ہو، ہر طرح سے ستایا تھا۔ اور پھر مکہ سے جانے کے بعد بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو پتا نہیں کتنی خون کی ندیاں بہا دیتا؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کچھ نہیں کیا حالاں کہ حرم تو امن کی جگہ ہے، وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا. (آل عمران: ۹۷) جو اس میں داخل ہو گیا مامون ہو گیا، اس کو کوئی چھیڑ نہیں سکتا؛ لیکن اس روز اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خون بہانے کی اجازت دی تھی۔

---

(۱) السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: ۴/۴۰۵ ودلائل النبوۃ للبیھقي: ۵/۶۹ (ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت)۔

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز:

چناں چہ فتح مکہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے جو خطبہ دیا تھا، اس میں یہ بات فرمائی تھی کہ جس دن سے اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے اس دن سے مکہ کو حرمت والا بنایا ہے، اس میں کسی کا خون بہانا کسی کے لیے جائز نہیں؛ البتہ میرے لیے اللہ تعالیٰ نے دن کے ایک حصہ (یعنی جس دن مکہ فتح ہوا، اس دن صبح سے لے کر شام تک) میں اس کو حلال کیا تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملی تھی۔[۱] پھر بھی آپ ﷺ نے ایسی تدبیر کی تھی کہ مقابلہ اور خون بہانے کی نوبت نہ آئے، اور مکہ والوں کو پتا چلے بغیر آپ ﷺ وہاں پہنچ جائیں، تا کہ اچانک پہنچے ہوئے اس لشکر کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے مکہ والے اپنے آپ کو سپرد کر دیں اور قتل وقتال کی نوبت نہ آنے پائے۔ چناں چہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ نیز ان سے کوئی بدلہ بھی نہیں لیا؛ آپ ﷺ کعبہ میں تشریف لے گئے، باہر نکل کر کعبۃ اللہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا، اور اس کے بعد آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ آپ مجھ سے کیا امید رکھتے ہو؟ میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ تو اس کے جواب میں ان لوگوں نے کہا: أخ کریم وابن أخ کریم (شریف بھائی ہیں، اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں) ہم آپ سے اچھی ہی امید رکھتے ہیں۔ چناں چہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم سے وہی کہوں گا جو حضرت یوسفؑ نے کہا تھا: قَالَ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ، اذھبوا انتم الطلقاء (یوسف:۹۲) (آج تم پر کوئی سرزنش نہیں)[۲] جب کہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ کوئی کسی کو معاف بھی کر دے، تو

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۱۰۴.

(۲) قدمر تخريجه: ۱۳۶.

اس کا دماغ ٹھیک کرنے کے لیے دو چار سخت جملے تو سنا ہی دیتا ہے۔اور حضور ﷺ کوئی سرزنش نہیں کررہے ہیں،کوئی ٹونٹنگ نہیں،اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام مکہ والے اسی وقت ایمان لے آئے۔ ۱۳ر سال کی محنت میں اتنی بڑی تعداد میں ایمان نہیں لائے تھے؛لیکن آپ ﷺ کے ان اخلاق کو دیکھ کر ان سب نے ایمان قبول کرلیا تھا۔

ترا امال ونعمت فزاید زشکر:

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ کہہ کر یہ سبق دیا گیا کہ جب اللہ کی کوئی نعمت حاصل ہو تو اس پر اللہ کی حمد وثنا اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اللهم لك الحمد كله و لك الشكر كله،تیری ہی تعریف ہے،تیرا ہی شکر ہے۔

اور شکر کی وجہ سے فائدہ ہی فائدہ ہے،دنیا کا بھی فائدہ ہے اور آخرت کا بھی فائدہ ہے۔دنیا کا فائدہ یہ ہے کہ شکر کی وجہ سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے،قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۔(ابراھیم:۷) (اگر تم میری نعمتوں کا شکر ادا کروگے،تو میں اس میں زیادتی کروں گا،اور اگر ناشکری کی تو میرا عذاب بہت سخت ہے) آپ کو اللہ تعالیٰ نے تندرستی دی،جب یہ تصور کرو تو فوراً اللہ کا شکر ادا کرو کہ اللہ تیرا شکر و احسان ہے،تو نے ہمیں تندرستی عطا فرمائی۔تیرا شکر و احسان ہے کہ تو نے اہل وعیال عطا فرمائے۔تیرا شکر و احسان ہے تو نے ہمیں گھر عطا فرمایا۔تیرا شکر و احسان ہے کہ تو نے عافیت والی روزی عطا فرمائی۔جس موقع پر جو بھی نعمت یاد آوے اللہ کی تعریف بیان کریں۔صبح میں گھر سے نکلے،باہر جانا ہے،سواری مل گئی تو الحمد لله، اللهم لك الحمد كله ولك الشكر كله منزل پر بروقت پہنچ گئے،تو الحمد لله، اللهم لك الحمد كله ولك

الشكر كله ھر واپس آئے، گھر میں داخل ہوتے ہی گھر والوں کو امن وامان میں دیکھا، کسی کو کوئی پرابلم (Problem) نہیں ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے، سب صحت مند ہیں، تو الحمد للہ، اللهم لك الحمد كله ولك الشكر كله اس سے بڑی نعمت اور کیا ہے؟ ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ آئے تو دیکھا کہ بچہ بیمار ہے، بیوی بیمار ہے، اور یہ دیکھ کر آپ کو اچانک جھٹکا لگتا۔ لہٰذا ہر موقع پر اللہ کا شکر ادا کیجیے۔ اس شکر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نعمت میں اضافہ فرماتے ہیں، یہ تو دنیا کا فائدہ ہے۔

بدست آوری دولت جاوداں:

آخرت کا فائدہ یہ ہے کہ شکر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آدمی کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔ شکر کی وجہ سے آدمی شیطان کے حملہ سے محفوظ رہتا ہے۔ جیسا کہ گذر چکا نعمت کے ملنے پر شیطان تو انسان کا ذہن یہ بناتا ہے کہ یہ نعمت تیرے زورِ بازو سے، تیری محنت سے، تیری تدبیر اور کوششوں سے تجھے حاصل ہوئی؛ لیکن جب شکر ادا کرے گا تو شیطان کبر میں مبتلا کرنے کے لیے جو ذہن بنا سکتا تھا وہ نہیں بنے گا۔ شیطان کے حملہ سے بچ جائے گا۔

نفَس جُز بہ شکرِ خدا برمیار:

دیکھیے! شیطان کا بڑا حملہ اسی پر ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ نہ کرنے کی بنا پر جب اپنی بارگاہ سے مردود کیا، تو اس نے اللہ کے سامنے قسم کھا کر کہا تھا: لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ.(الاعراف: ۱۷) (میں آدم کی اولاد کو گمراہ کرنے کے لیے ان کے سامنے سے، ان کے پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے آؤں گا)

اور میرے اس حملہ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ. (الاعراف: ۱۷) (ان میں سے اکثر کو تو شکر گزار نہیں پائے گا) شیطان کا سب سے پہلا حملہ یہی ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو شکر سے دور رکھتا ہے۔

ہماری حالت:

ہماری حالت بھی عجیب ہے، جب پریشانی ہوتی ہے، تو دعائیں کرتے ہیں کہ اللہ! یوں ہو جائے، یوں ہو جائے۔ کہیں سفر میں جا رہے ہیں، تو دعائیں کرتے ہیں: اے اللہ! ٹرین مل جائے، ٹرین میں اچھی جگہ مل جائے۔ اب ٹرین بھی مل گئی، جگہ بھی مل گئی؛ لیکن زبان پر شکر کا لفظ نہیں آتا۔ پھر آگے کا سوچتے ہیں، ٹرین وقت پر پہنچ جائے، میں وہاں اتر جاؤں، میرا کام ہو جائے۔ اپنی سب حاجتیں تو مانگتے رہتے ہیں؛ لیکن جوں جوں حاجتیں پوری ہوتی جاتی ہیں، اس پر جو شکر ہونا چاہیے وہ ہم نہیں کر رہے ہیں۔ حالاں کہ جس طرح حاجتیں مانگیں، ہر حاجت کے پورا ہونے پر اللہ کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے؛ لیکن شیطان شکر ادا کرنے نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داوٗد علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو حکم دیا تھا: اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ. (سبا: ۱۳) (اے داوٗد کے گھرانے والو! (یا خود حضرت داوٗدؑ کو حکم دیا جا رہا ہے) کہ آپ شکر کرو، اور میرے بندوں میں شکر کرنے والے بہت کم ہیں)۔

شکر بہت کم ادا کیا جاتا ہے۔ انسان کا مزاج ہی یہ ہے کہ اس کو سو (۱۰۰) نعمتیں ملی ہوں، اور ایک نہ ملی ہو، تو جو نہیں ملی ہے اسی کو پکڑے رکھے گا۔ اور کسی کے سامنے بھی اسی کا تذکرہ کرے گا۔

ذراسا بخار آ گیا ہے......!!!

حضرت مولانا سید میاں اصغر حسینؒ ہمارے اکابر میں سے ہیں، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے گھر گیا تو حضرت کو بخار تھا۔ میں نے کہا: حضرت کیا حال ہے؟ فرمانے لگے: الحمد للہ! میری آنکھیں سلامت ہیں، دیکھنے کا کام کر رہی ہیں۔ کان سلامت ہیں، سننے کا کام کر رہے ہیں۔ میری زبان سلامت ہے، بولنے کا کام کر رہی ہے۔ میرے ہاتھ ٹھیک ہیں۔ میرے پاؤں ٹھیک ہیں۔ دیر تک گنواتے رہے۔ پھر فرمایا: بس! ذرا سا بخار آ گیا ہے۔ ہم نعمتوں کو نہیں دیکھتے۔ جو چیز نہیں ملی ہے اسی کو پکڑ کر بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ ہمارا ناشکری والا مزاج ہے۔

ایک آدمی کو آپ نے گلاس میں پانی دیا، وہ پورا بھرا ہوا نہیں ہے، آدھا ہے۔ تو جو شکر والے مزاج کا ہوگا وہ کہے گا: الحمد للہ! آدھا گلاس پانی مل گیا۔ اور جو ناشکری والا ہوگا وہ کہے گا: یہ آدھا تو خالی ہے!!! اس کی نظر خالی پر جائے گی۔ اور جو شکر والے مزاج والا ہوگا اس کی نظر بھرے ہوئے حصہ پر جائے گی۔

بخار بھی نعمت ہے......کیسے؟

یہ بخار بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اس بخار کی وجہ سے تمھارے سب بچے ارد گرد آ کر بیٹھ گئے، دوستوں کے فون آ رہے ہیں کہ بھائی! کیا ہوا؟ سنا ہے کہ آپ کو بخار ہو گیا ہے ہم آپ کے لیے دعا کرتے ہیں۔ لوگ خیریت پوچھتے ہیں۔ اس بخار سے تو آپ کو پتا چل گیا کہ کون کون آپ سے محبت کرتا ہے؟ دنیا میں کتنے لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں، اب تک آپ کو اس کا اندازہ نہیں تھا، لیکن اس بخار نے آپ کو یہ سب بتلا دیا!!! تو یہ کوئی

مصیبت نہیں؛ بلکہ ایک نعمت ہے۔

تو چاہتا تو......:

حضرت نوح علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تعریف فرمائی ہے:

اِنَّهٗ كَانَ عَبۡدًا شَكُوۡرًا. (الاسراء:۳) (وہ شکر گزار بندے تھے) حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ جب آپ کھانا کھاتے تھے، تو یوں کہتے تھے: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے کھانا دیا، تو چاہتا تو بھوکا بھی مار سکتا تھا۔ جب پانی پیتے تو یوں کہتے تھے: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے سیراب کیا، تو چاہتا تو پیاسا بھی رکھ سکتا تھا۔ جب لباس پہنتے تو کہتے تھے کہ: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے لباس عطا فرمایا، تو چاہتا تو ننگا بھی رکھ سکتا تھا۔ اور جوتے پہنتے تو کہتے: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے جوتے عطا فرمائے، تو چاہتا تو ننگے پیر بھی رکھ سکتا تھا۔ گویا ہر چیز پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ اس شکر کا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ شکر کی وجہ سے میں نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔ تو آدمی کو چاہیے کہ ہر وقت شکر ادا کرنے کا اہتمام کرے۔

پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا:

فتح آنے پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی کہا جا رہا ہے کہ شکر ادا کرو، اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو، استغفار کرو۔ اب دیکھیے! شکر ادا کرنا اور معافی مانگنا دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت ہوئی تو جزیرۃ العرب کا کیا حال تھا؟ جہالت میں پڑے ہوئے تھے، گناہوں کے عادی تھے، قتل و غارت گری کے عادی تھے، شراب اور زنا کے عادی تھے۔ کون سی برائی تھی جو اُن میں نہ تھی۔ اسی لیے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر پہلی وحی آئی اور اس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جو ذمہ داری آئی تو آپ اس ذمہ داری سے ڈر رہے

تھے۔حضور ﷺ نے آکر حضرت خدیجہؓ سے کہا: إني أخاف علىٰ نفسي مجھے اندیشہ معلوم ہوتا ہے۔حضرت گنگوہیؒ اس جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اندیشہ یہ تھا کہ جس قوم کو سدھارنے کی اتنی بڑی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر ڈالی گئی ہے اور اس قوم کا تو یہ حال ہے!!! میں کیسے اس ذمہ داری کو پورا کرسکوں گا؟ آپ ﷺ ڈر رہے تھے۔[۱] لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کروایا۔ ۲۳ر سال کے بعد نبی کریم ﷺ دنیا سے جارہے ہیں تو پورے جزیرۃ العرب کی کایا پلٹ گئی تھی۔جو بری بری عادتیں ان میں تھیں وہ ساری چھوٹ چکی تھیں۔شراب کے بڑے عادی تھے، حالاں کہ شراب کی لت ایسی لت ہے جیسے کسی کو تمباکو کھانے کی یا گٹکھا کھانے کی لت پڑ جائے تو آسانی سے چھوٹتی نہیں ہے، شراب کا حال بھی ایسا ہی ہے، جلدی سے چھوٹتی نہیں ہے؛ لیکن نبی کریم ﷺ کی تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو -سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بتلا چکا ہوں کہ- اس وقت لوگ ایک مکان میں بیٹھ کر شراب پی رہے تھے، مجلس لگی ہوئی تھی، ہاتھ میں جام ہے، اور باہر اعلان ہوا کہ شراب حرام کردی گئی ہے، حضرت انسؓ جو وہاں موجود تھے، خدمت کررہے تھے، ان سے لوگوں نے کہا کہ دیکھو باہر کیا اعلان ہورہا ہے؟ انہوں نے آکر کہا کہ حضور ﷺ کا اعلان کرنے والا اعلان کررہا ہے کہ شراب حرام کردی گئی ہے، تو جس کے ہاتھ میں جام تھا وہ ہاتھ میں ہی رہ گیا، ہونٹ کے قریب تھا اس کو بھی ہٹا لیا، اور جو شراب کے مٹکے بھرے ہوئے تھے اسی وقت توڑ دیے گئے، اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں شراب بہنے لگی۔[۲] یہ نبیٔ کریم ﷺ کا کوئی معمولی کارنامہ تھا؟ نہیں۔اس کے باوجود اللہ

---

(۱) لامع الدراري ۱/۵-۶ (ط: المكتبة الرشيدية، سهارنپور، يوپي).

(۲) أخرجه البخاري: ۲۳۳۲ ومسلم: ۱۹۸۰.

تعالیٰ آپ ﷺ کو حکم فرمارہے ہیں: فسبح بحمد ربک گویا آپ ﷺ کو یہ نہیں سوچنا ہے کہ میں نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے، آپ اللہ کی تسبیح اس کی حمد کے ساتھ بیان کیجیے۔

استغفار کیوں......؟؟؟

وَاسْتَغْفِرْهُ: استغفار کیجیے۔ آدمی کوئی گناہ کرے تو اس پر استغفار ہوتا ہے، حضور ﷺ سے-نعوذ باللہ-کیا غلطی ہوئی تھی؟ پھر بھی آپ ﷺ کو استغفار کرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے: فرماتے ہیں کہ جب نماز ختم ہوتی تو نبی کریم ﷺ سلام پھیرتے اور زور سے اللہ أکبر کہتے تو مجھے پتا چل جاتا کہ نماز مکمل ہوچکی۔[۱] اور حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نماز کے بعد تین مرتبہ استغفر اللہ! استغفر اللہ! استغفر اللہ! پڑھتے تھے۔[۲] نماز پڑھنے کے بعد استغفر اللہ! کہا جارہا ہے! قرآن کریم میں ہے:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ. (الذٰریٰت: ۱۷، ۱۸)

رات میں بہت کم سوتے ہیں، اور جب رات کا آخری حصہ آتا ہے تو اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں۔ رات بھر تو نماز پڑھتے رہے، کوئی گناہ کا کام تھوڑا کیا تھا؟ پھر بھی وہ استغفار کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ کی توفیق سے نماز پڑھی ہے؛ لیکن آدمی کو یوں سمجھنا چاہیے کہ نماز کا جو حق ہمیں ادا کرنا چاہیے تھا وہ ہم سے ادا نہیں ہوا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز ملائکہ کہیں گے: ما عبدناك حق عبادتك (ہم نے تیری عبادت جیسی کرنی چاہیے ویسی نہیں کی)[۳] اسی لیے عبادات کے آخر میں استغفار ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري: ۸۴۱و۸۴۲.

(۲) صحيح مسلم: ۵۹۱.

(۳) أخرجه الحاكم في المستدرك: ۴/۶۲۹ [۸۷۳۹] (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

حضرت عبداللہ بن عمرؓ افطار کے وقت پڑھتے تھے: يا واسع المغفرة اغفر لي (اے معاف کرنے والے! میرے گناہوں کو معاف کردے)[۱] عام طور پر عبادات کے آخر میں استغفار رکھا گیا ہے، وہ اسی لیے کہ جو ذمہ داری ہم پر ڈالی گئی تھی ہوسکتا ہے کہ اس کی ادائیگی میں ہم سے کوتاہی ہوئی ہو۔

بہرحال! اللہ تعالیٰ جب کسی نعمت سے نوازے تو آدمی کو دو کام کرنے چاہیے:

(۱) اللہ کی حمد وثنا بیان کرتے ہوئے اس کا شکر ادا کرنا ہے۔

(۲) استغفار کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

(۱) شعب الإيمان للبيهقي: ۵/۴۰۷ [۳۶۲۰] (ط: مكتبة الرشد، ممباي، الهند).

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ کافرون

(قسط-۱)

(مؤرخہ ۱۵/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۳/جولائی ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾ لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ٪﴿۶﴾.

شانِ نزول:

یہ سورۂ کافرون ہے۔

(۱) اس کے شان نزول کے بارے میں بتلایا گیا ہے کہ جب پورا عرب بت پرستی میں مشغول تھا، اور وہی ان کا دین اور مذہب تھا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے توحید کی دعوت دی

کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اپنی تمام صفات میں وہ یکتا ہے، اسی کی عبادت کرو، کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سعادت مند بندوں کو توفیق عطا فرمائی، اور انھوں نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے ایمان قبول کیا، اور توحید پر عمل کرنے لگے۔ اچھی خاصی تعداد مکہ مکرمہ میں بھی اہل ایمان کی ہوگئی۔ لیکن بڑی تعداد وہ تھی جو آپ ﷺ پر ایمان نہیں لائی تھی، بالخصوص سرکردہ لوگ، ان کی اکثریت نے دعوت ایمان کو قبول نہیں کیا تھا۔ اور وہ لوگ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے والے اہل ایمان پر ظلم کے پہاڑ توڑتے تھے۔ اب اس موقع پر چوں کہ ایمان والوں اور کافروں کے درمیان ایک کشمکش رہتی تھی، تو بعض سرداران قریش نے نبی کریم ﷺ کے سامنے صلح کی پیشکش کی۔ چناں چہ سردارانِ قریش، حارث بن قیس سہمی، عاص بن وائل، ولید بن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث، اسود بن مطلب، امیہ بن خلف، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں صلح کی یہ صورت لے کر آئے کہ آپ ایسا کریں کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں۔ گویا اس طرح ہمارے درمیان جو کشمکش اور جھگڑا ہے وہ ختم ہو اور صلح کی کوئی صورت پیدا ہو۔ اس کے جواب میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔[1]

(۲) بعض روایات میں یہ بھی وارد ہے کہ ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کی برائی بیان کرتے ہیں، یہ سلسلہ ختم کریں۔ آپ جتنا مال چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔ یا آپ عرب کی کسی حسین ترین عورت کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں تو ہم اس کا بھی انتظام کیے دیتے ہیں۔ یا آپ اگر سرداری کے خواہش مند ہیں تو ہم آپ کو اپنا

---

(۱) تفسیر عبدالرزاق الصنعاني وتفسير الطبري وتفسير ابن أبي حاتم وتفسير البغوي وتفسير ابن عطية [سورة الكفرون].

سردار تسلیم کیے دیتے ہیں۔ لیکن آپ ہمارے معبودوں کی برائی کا سلسلہ ختم کردیجیے۔[۱]

(۳) بعض روایات میں وارد ہے کہ پیشکش میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ اللہ کی عبادت کرتے رہیں؛ لیکن ہمارے معبودوں کو بھی کم از کم ہاتھ لگا دیا کریں، بوسہ دے دیا کریں۔[۲] انہوں نے یہی مختصر مطالبہ کیا، بہت لمبا چوڑا مطالبہ نہیں کیا۔

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے ان مطالبوں اور صلح کی جو صورتیں پیش کی گئی تھیں، ان کے جواب میں سورۂ کافرون نازل فرمائی، جس میں ان کو صاف الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ تم شرک میں مبتلا ہو، اور حضور ﷺ توحید کے علم بردار ہیں۔ ایک موحد توحید پر قائم رہتے ہوئے کفر وشرک کی کوئی شکل اختیار نہیں کرسکتا، جیسے تم مشرک رہتے ہوئے توحید اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تم اپنے دین پر مصر ہو، اڑے ہوئے ہو، اور میں اپنے دین پر مضبوطی سے جما ہوا ہوں۔ ہر ایک کے اپنے اپنے دین پر رہتے ہوئے، تم صلح کی جو شکل پیش کررہے ہو وہ ناممکن ہے۔

سورت کا ترجمہ:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! اے حق کا انکار کرنے والو!)

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (میں نہیں عبادت کرتا اس چیز کی جس کی تم عبادت کرتے ہو)

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں) [تم بتوں کی عبادت کرتے ہو، جن کی میں عبادت نہیں کرتا۔ اور میں اللہ کی

---

(۱) تفسير الطبري وتفسير ابن عطية [سورة الكافرون].

(۲) تفسير عبدالرزاق الصنعاني وبحر العلوم للسمرقندي وتفسير القرآن العزيز لابن أبي زَمَنين، سورة الكفرون.

عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے]

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ . (اور آئندہ بھی میں اس چیز کی عبادت کرنے والا نہیں ہوں، جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی میں عبادت کرتا ہوں)

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین)

دونوں جملوں کا مطلب مختلف ہے:

وَلَآ اَنْتُمْ...: یہاں ایک ہی طرح کے جملے دو مرتبہ آئے ہیں۔ یہ دو مرتبہ ایک ہی طرح کے جملے آئے تو دونوں کا الگ الگ مطلب ہے یا ایک ہی مطلب ہے؟

(۱) امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں اس سورت کی تفسیر میں دونوں کا مفہوم الگ الگ نقل کیا ہے۔[۱] پہلے جملے کا مطلب تو یہ ہے کہ اِس وقت (زمانۂ حال) میں ان چیزوں (تمہارے بتوں) کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور تم بھی اس ذات کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ **پہلے دو جملوں کا تعلق زمانۂ حال سے ہے۔ اور بعد میں آنے والے ان ہی دو جملوں کا تعلق زمانۂ استقبال سے ہے۔ یعنی نہ آئندہ میں ان چیزوں کی عبادت کروں گا، جن کی تم عبادت کرتے ہو، اور نہ تم اس کی عبادت کروگے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔**

(۲) ان دو جملوں کا مطلب حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں یہ بیان کیا ہے:

پہلے دو جملوں (لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ) میں لفظ "ما" آیا

[۱] صحيح البخاري، كتاب التفسير [باب سورة قل يآيها الكفرون] و بحر العلوم للسمر قندي و تفسير البغوي [سورة الكفرون].

ہے۔اسی طرح دوسرے دو جملوں (وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ) میں بھی "ما" ہے، اس مجلس میں اہل علم موجود ہیں، وہ جانتے ہیں کہ لفظ "ما" عربی زبان میں اسم موصول بمعنیٰ الذي (relative pronoun) کے آتا ہے۔اور لفظ "ما" مصدری (masculine noun) معنی کے لیے بھی آتا ہے۔اگر پہلی دو آیتوں میں لفظ "ما" سے اسم موصول بمعنیٰ الذي مراد لیں، تو عبارت یوں ہوگی: لا اعبد الذي تعبدون (جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا) ولا انتم عٰبدون الذي اعبد (جس ذات کی میں عبادت کرتا ہوں، اس کی تم عبادت نہیں کرتے)

اور دوسرے دو جملوں میں لفظ "ما" مصدریہ ہے۔ "ما" مصدریہ جب کسی فعل (verb) پر داخل ہوتا ہے، تو اس فعل کو مصدر کے معنی میں کر دیتا ہے۔تو اب عبارت یوں ہوگی: ولا أنا عابد عبادتَکم (یعنی تمہارے جیسی عبادت میں نہیں کرتا اور میرے جیسی عبادت تم نہیں کرتے)[۱] یعنی ہمارا معبود بھی الگ ہے اور عبادت کا طریقہ بھی الگ ہے۔اور تمہارا معبود بھی الگ ہے اور عبادت کا طریقہ بھی الگ ہے۔دونوں میں فرق ہے، جب دونوں میں فرق ہے تو بھلا جو صلح تم پیش کررہے ہو وہ کیسے ہوسکتی ہے؟

قندِ مکرر:

(۳) بعض حضرات نے تیسرا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ دونوں جگہ دونوں آیتیں ایک ہی معنی میں ہیں۔اس صورت میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ تکرار ہوگئی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ تکرار ہر جگہ ناپسندیدہ نہیں ہے، کہیں پسندیدہ بھی ہوتی ہے۔جیسے: فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ

---

(۱) تفسیر ابن کثیر [سورة الكفرون].

يُسۡرًا ۙ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ يُسۡرًا. (الشرح:۵-۶) میں تکرار ہے، اور تکرار ہی کے معنی مراد ہیں۔اسی طرح یہاں (سورۂ کافرون میں) بھی تکرار ہے۔ چوں کہ ایسی باتیں ان کی طرف سے بار بار پیش آتی تھیں، اس لیے اس کا جواب دینے اور اس کی نفی کرنے کے لیے ایک جملہ کو مکرر کہا گیا کہ ایسی کوئی صلح ہمارے درمیان نہیں ہوسکتی اور اس کی توقع بھی مت رکھو۔ اس صورت میں دونوں جملے ایک ہی معنی میں ہوں گے اور دوسرا جملہ پہلے جملے کی تاکید کے لیے ہے۔[۱] یہ تین مطلب بیان کیے گئے ہیں۔

دین سے کیا مراد ہے......؟؟

لکم دینکم ولی دین (تمہارے لیے تمہارا دین، اور میرے لیے میرا دین)

دین کا کیا مطلب ہے؟

(۱) حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہٗ نے دین کا ترجمہ بدلہ سے کیا ہے۔[۲]

جیسے آپ سورۂ فاتحہ میں سن چکے ہیں: مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ (روز جزا کا مالک، بدلہ کے دن کا مالک) یعنی تم جو اعمال کرتے ہو، تمہیں اس کا بدلہ بھگتنا ہے۔ اور میں جو اعمال کرتا ہوں مجھے اس کا بدلہ ملنے والا ہے۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کا بدلہ ملے گا۔

(۲) بعض حضرات نے دین کا ترجمہ دین ہی سے کیا ہے۔[۳] لیکن مراد دین کے

---

(۱) جامع البيان للطبري و معالم التنزيل للبغوي و المحرر الوجيز لابن عطية [سورة الكفرون].

(۲) بیان القرآن سورۃ الفاتحۃ ۱/ ۲۰ (مکتبہ رحمانیہ، لاہور) (نوٹ: الدین بمعنی بدلہ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ، عبداللہ بن مسعود، مجاہد، مقاتل، سدی اور ابن جریج وغیرہ سے منقول ہے۔ امام طبری اور امام بغوی وغیرہ نے اسے ذکر کیا ہے۔

(۳) امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں کتاب التفسیر، باب سورة قل یایھا الکفرون کے تحت لکم دینکم میں دین سے کفر اور ولي دين میں دین سے اسلام مراد لیا ہے۔

اعمال ہیں۔ یعنی تمہارے ساتھ تمہارے اعمال، تمھیں ان اعمال کا بدلہ بھگتنا ہے۔ اور میرے ساتھ میرے اعمال، مجھے اپنے اعمال کا بدلہ ملنے والا ہے۔

مجھ سے یہ امید نہ رکھنا:

یہاں یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ ان کو اپنے کفر والے دین پر باقی رہنے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ نہیں! **بلکہ ان کو بتلایا جا رہا ہے کہ میں موحد رہتے ہوئے تمھاری شرک والی باتوں کو قبول نہیں کر سکتا، اور تم اپنے شرک پر قائم رہتے ہوئے توحید کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو، تو اب ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال کا بدلہ آخرت میں دیا جائے گا۔**

بہرحال! اس سورت نے نازل ہو کر ان کی پیشکش کو ختم کر دیا اور ٹھکرا دیا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان صلح نہیں ہو سکتی ہے۔ ایک مؤمن ایمان اور توحید پر قائم رہتے ہوئے کبھی کفر و شرک کو اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے تم مجھ سے ایسی امید مت رکھو۔

فضائلِ سورۂ کافرون:

اس سورت کی فضیلت کے سلسلہ میں بھی چند روایات ہیں:

فجر کی سنت میں:

(۱) حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فجر کی سنتوں میں پڑھنے کے لیے دو سورتیں بہتر ہیں۔ سورۂ اخلاص اور سورۂ کافرون۔[۱]

---

(۱) أخرجه ابن خزيمة فی صحيحه (۲/ ۱٦۳) [۱۱۱۴] (ط: المكتب الإسلامی، بيروت) وابن حبان فی صحيحه (۵/ ۲۱۴) [۲۴٦۱] (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت).

تحیۃ الطواف میں:

(۲) صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے طواف کے بعد کی دو رکعتوں میں سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص کی تلاوت فرمائی۔[۱]

مغرب کی سنت میں:

(۳) تفسیر ابن کثیر میں بہت سارے صحابہؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فجر اور مغرب کی سنتوں میں بہ کثرت یہ دونوں سورتیں پڑھتے ہوئے سنا۔[۲] [اس لیے فجر اور مغرب کی سنتوں میں ان سورتوں کے پڑھنے کا اہتمام ہونا چاہیے]

(۴) ترمذی شریف کی روایت ہے کہ حضرت فروہ بن نوفلؓ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی دعا بتا دیجیے جو میں سوتے وقت پڑھا کروں۔ تو نبی کریم ﷺ نے سورۂ کافرون پڑھنے کی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ یہ شرک سے براءت ہے۔[۳]

خستہ حالی سے خوش حالی تک:

(۵) تفسیر مظہری میں مسند ابو یعلیٰ کے حوالہ سے ایک رویت ہے کہ حضرت جبیر بن مطعمؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جب تم سفر میں جاؤ تو تمہارے دوسرے ساتھیوں سے زیادہ خوش حال اور بامراد رہو؟ یعنی تمہاری مرادیں پوری ہوں اور تمہارا مال زیادہ ہو، اور تمہاری تجارت میں نفع زیادہ سے زیادہ ہو؟

---

(۱) أخرجه مسلم: ۱۲۱۸.

(۲) أخرجه الترمذي عن ابن مسعود: ۴۳۱.

(۳) أخرجه الترمذي: ۳۴۰۳ و أبو داود: ۵۰۵۵.

انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بے شک میں ایسا چاہتا ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب سفر شروع کرو، تو آخر قرآن کی یہ پانچ سورتیں: سورۂ کافرون، سورۂ نصر، سورۂ اخلاص، سورۂ فلق اور سورۂ ناس پڑھا کرو۔ اور ہر سورت کو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے شروع کرو، اور اسی پر ختم کرو، تو حضرت جبیرؓ فرماتے ہیں کہ پہلے میرا حال یہ تھا کہ سفر میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں بہت کم توشہ والا اور خستہ حال رہتا تھا۔ جب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تعلیم پر عمل کیا میں سب سے بہتر حال میں رہنے لگا۔[1] [چناں چہ بہت سے لوگوں نے اس کا تجربہ کیا تو واقعۃً بڑا فائدہ دیکھا۔ جو تجارت پیشہ ہیں ان کے لیے بھی اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی ایک اچھا وظیفہ ہے]

چوتھائی قرآن:

(٦) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سورۂ کافرون چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔
[جیسے قُلۡ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ کو تہائی قرآن بتایا، اس کو چوتھائی قرآن بتایا][2]

بچھو کے زہر کا تریاق:

(٧) حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حالت نماز میں بچھو نے کاٹ لیا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے، تو آپ نے فرمایا: "لعن اللہ العقرب لا تدع مصلیا و لا غیرہ۔" (بچھو پر اللہ کی لعنت ہو، کہ وہ نمازی اور غیر نمازی کسی کو نہیں چھوڑتا) پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی اور نمک منگوایا۔ اور نمک و پانی کو، کاٹنے کی جگہ لگاتے جاتے تھے اور

---

(١) مسند أبی یعلیٰ الموصلی: ۱۳/ ۴۱۴ [۷۴۱۹] (ط: دار المأمون للتراث، دمشق) و تفسیر مظهري (اردو) سورۂ کافرون.

(٢) أخرجه الترمذي: ۲۸۹۳.

قل یٰایھا الکٰفرون، قل اعوذ برب الفلق **اور** قل اعوذ برب الناس **پڑھتے جاتے تھے۔**[۱]

یہ اس سورت کے اہم فضائل ہیں، جو آپ کے سامنے پیش کیے گئے۔

ایسی صلح ناممکن:

اب نبی کریم ﷺ کے سامنے ان لوگوں کی طرف سے صلح کی جو شکل پیش کی گئی تھی اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ سورت نازل فرما کر رجیکٹ (Reject) کر دیا۔ چناں چہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ باقاعدہ حرم میں تشریف لائے، کعبہ کے پاس قریش کے سردار موجود تھے، کعبہ کے پاس کھڑے رہ کر آپ ﷺ نے ان کے سامنے زور سے یہ سورت تلاوت فرمائی۔[۲] گویا ان کی طرف سے صلح کی جو پیشکش کی گئی تھی، اس کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ جواب دیا گیا۔ آئندہ بھی قیامت تک ایسی کوئی صلح ممکن نہیں ہے۔

ایک اصول:

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سورت میں کفار کے ساتھ صلح نہ ہو سکنے کا بیان ہے، حالاں کہ قرآن میں دوسری جگہ ایک آیت: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا. (الانفال:۶۱) (یہ لوگ اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی مائل ہو جائیے) بھی ہے گویا اس میں تو صلح کی اجازت دی گئی ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ دونوں آیتوں کا تعلق الگ الگ چیزوں سے ہے۔ ان لوگوں نے اُس موقع پر جس صلح کا مطالبہ کیا تھا اس میں ایک موحد کو اپنے توحید کے عقیدہ سے ہٹنا پڑتا ہے۔ اور شریعت نے جس چیز کی اجازت نہ دی ہو اور حرام قرار دیا ہو،

(۱) رواه الطبراني في المعجم الصغير [۸۳۰] (ط: المكتب الاسلامي، بيروت).

(۲) تفسير البغوي، سورة الكفرون.

ایسی چیز کو آپسی صلح میں تجویز کرنا درست نہیں ہے۔ یہ ایک اصول ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے ارشاد سے اس کو واضح فرمایا ہے: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحاً حرم حلالاً أو أحل حراماً. (مسلمانوں کے درمیان ہر صلح جائز ہے، مگر وہ صلح جو شریعت کی حلال کردہ کسی چیز کو حرام قرار دیتی ہو، یا شریعت کی حرام کردہ کسی چیز کو حلال قرار دیتی ہو؛ وہ جائز نہیں ہے)[۱] **جیسے: غیر لوگ صلح کریں کہ گنپتی کے جلوس کا تم استقبال کرو، اور ہم تمہارے محرم کے جلوس کا استقبال کریں گے، یا میلاد کے جلوس کا استقبال کریں گے، تو یہ درست نہیں ہے۔ ویسے میلاد اور محرم کا جلوس ہی ہمارے یہاں درست نہیں ہے۔ یہ تو ان کے معبودوں کی تعظیم کرنا ہوا، شریعت کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ صلح شریعت کے نزدیک معتبر نہیں ہے۔**

ہاں! اس کے علاوہ دیگر امور، جن کو شریعت نے مباح اور جائز رکھا ہے اگر ان کو آپس کی صلح سے ایک دوسرے منظور کریں، تو اس کی گنجائش ہے۔ جیسے نبی کریم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو آپ ﷺ نے وہاں موجود قبائلِ یہود سے آپس میں صلح کی تھی کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے اور اگر کوئی دشمن ہمارے خلاف چڑھ آئے گا، تو ہم مل کر اس کا مقابلہ کریں گے، تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

بہر حال! یہاں جس صلح کی اجازت نہیں دی گئی اور جس کو رجیکٹ کر دیا گیا وہ، وہ ہے جس کی وجہ سے شریعت کے کسی منع کیے ہوئے کام کا ارتکاب لازم آتا ہو، اس کو شریعت منظور نہیں رکھتی ہے۔

---

(۱) أخرجه أبو داود برقم: ۳۵۹۴ والترمذي: ۱۳۹۲ وابن ماجة: ۲۳۵۳.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ کافرون

(قسط-۲)

(مؤرخہ: ۲۲/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۳۹ھ-مطابق: ۴/اگست ۲۰۱۸ء،شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم○ بسم الله الرحمٰن الرحيم○

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الۡكٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾ لَكُمۡ دِیۡنُكُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ٪﴿۶﴾

گذشتہ سے پیوستہ:

یہ سورۂ کافرون ہے، گذشتہ مجلس میں بتلادیا گیا تھا کہ یہ کس پس منظر میں نازل ہوئی ہے؟ مکہ کے مشرکین کے کچھ سردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے، اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے صلح کا ایک فارمولہ پیش کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ آپ کو اور آپ کے ماننے

والے لوگوں کو جو تکالیف واذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور یہاں ہمارے اور آپ کے درمیان ایک کشمکش رہتی ہے، اگر آپ ہماری اس پیشکش کو قبول کرلیں تو یہ سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا، اور ہم مل جل کر رہیں گے۔ اور انہوں نے صلح کی پیشکش اس طرح کی کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی پوجا اور عبادت کریں، اور ایک سال آپ ہمارے معبود کی پوجا اور عبادت کریں۔ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔[۱] اور ان لوگوں کو بتلا دیا کہ بھائی! مؤمنین اور مشرکین کے درمیان صلح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ **ایک موحد اپنی توحید پر قائم رہتے ہوئے کسی بھی شرکیہ عمل کو انجام نہیں دے سکتا، اور ایک مشرک اپنے شرک پر باقی رہتے ہوئے توحید کو ماننے والا نہیں بن سکتا۔**

ترجمہ ومطلب:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! اے حق کا انکار کرنے والو)

لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (میں ان چیزوں کی عبادت نہیں کرتا، جن کی تم عبادت کرتے ہو)

وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ (اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں) یعنی تم بتوں کی عبادت کرتے ہو، میں ان کی عبادت نہیں کرتا۔ اور میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے۔

وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ (اور نہ (آئندہ) میں اس چیز کی

---

(۱) تفسير الطبري و تفسير ابن أبي حاتم، سورة الكٰفرون.

عبادت کرنے والا ہوں، جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم (آئندہ) اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی میں عبادت کرتا ہوں) چوں کہ یہ دو کلمے مکرر آئے ہیں، تو پہلی صورت میں اس سے زمانۂ حال مراد لیا گیا اور دوسرے دو کلموں میں زمانۂ مستقبل مراد لیا گیا ہے۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (تمہارے لیے تمہارا دین ہے، اور میرے لیے میرا دین ہے)

گزر چکا کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ سورت نازل فرمائی، تو نبی کریم ﷺ نے کعبہ کے پاس جا کر مشرکین کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز سے سنائی؛ تاکہ ان کو پتا چل جائے۔[۱]

پہلا سبق: یہ اللہ تعالیٰ کو ماننا نہیں ہے:

اس سورت سے ہمیں دو سبق معلوم ہوتے ہیں:

(۱) ایک سبق تو یہ ہے کہ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں، یعنی اللہ کی۔ اور آئندہ بھی نہیں کرو گے) مشرکین مکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کو تسلیم کرتے تھے، اور وہ یہ بھی مانتے تھے کہ ساری کائنات یعنی آسمانوں، زمین، سورج، چاند، اسی طرح انسان، جنات، جانور کو اللہ ہی نے پیدا کیا۔ قرآن پاک میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا تذکرہ کیا ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: ۶۱) (اے نبی! اگر آپ ان سے یہ سوال کریں کہ کون سی ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ اور سورج اور چاند کو گردش میں لگا دیا؟ تمہاری ڈیوٹی اور خدمت میں لگا دیا، تمہارے لیے مسخر کر دیا؟) تو باری تعالیٰ فرماتے

---

(۱) تفسیر البغوي، سورة الكفرون.

ہیں: لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (وہ لوگ ضرور بالضرور یہ جواب دیں گے: یہ سب کرنے والا اللہ ہے۔ وہ لوگ اللہ کو مانتے تھے، اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ بیت اللہ کا طواف بھی کرتے تھے، کوئی کام شروع کرنا ہوتا تو باسمك اللّٰهم سے شروع کرتے، کوئی تحریر لکھنی ہوتی، تو اس کے شروع میں باسمك اللّٰهم (اے اللہ! تیرے نام سے شروع کرتا ہوں) حج کرتے اور اس میں لبیک پڑھتے تھے، لبيك اللّٰهم لبيك، لبيك لا شريك لك پھر لا شريك لك کے بعد إلا شريكا هو لك.[۱] البتہ ایک شریک ہے، اتنا اضافہ کر دیا۔ عبادت بھی اسی طرح کرتے تھے۔

اس کے باوجود کہا جا رہا ہے کہ وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (میں جس ذات کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے) اور آئندہ بھی تم شرک پر باقی رہتے ہوئے اس کی عبادت نہیں کرو گے۔ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں اللہ کی عبادت کا انکار کیوں کیا گیا؟ حالاں کہ وہ اللہ کے وجود کو بھی مانتے تھے، اور مذکورہ بالا امور بھی انجام دیتے تھے، بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ساری کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بعض یا سارے اختیارات ان دیوی دیوتاؤں کو دے دیے ہیں۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، انسان اور جنات ان سب کو پیدا کرنے کے بعد اب اللہ تبارک وتعالیٰ ویسے ہی بیٹھ گئے ہیں۔ اب بقیہ تمام امور یعنی روزی دینا، کسی بیمار کو شفا دینا اور دیگر حاجات پوری کرنا یہ ان دیوی دیوتاؤں کا کام ہے، گویا ان کو وہ لوگ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے تھے اور حاجت روا اور مشکل کشا مانتے تھے۔ جیسے ہمارے ہاں غیر مسلم، ہنود سے پوچھا جائے کہ علم کون دیتا ہے؟ تو وہ جواب دیں گے: سرسوتی دیوی (સરસ્વતી દેવી) علمی اداروں میں اس کی تصویر یا مورتی مستقل

---

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۱۱۸۵.

ٹیبل پر رکھی جاتی ہے۔ان کے نزدیک اسی سے علم ملتا ہے۔اگر پوچھا جائے کہ دولت کون دیتا ہے؟ تو جواب دیں گے کہ لکشمی دیوی (લક્ષ્મી દેવી) مطلب یہ ہے کہ مختلف دیوی اور دیوتاؤں کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے۔اسی طرح مکہ کے مشرکین کا بھی یہی عقیدہ تھا۔گویا اللہ تعالیٰ کو پیدا کرنے والا ماننے کے بعد دیگر اختیارات ان شرکاء کے حوالے کر دیے ہیں۔چناں چہ وہ لوگ ان معبودانِ باطلہ کو شریک ٹھہرانے کے ساتھ اللہ کو مان رہے ہیں، اس سلسلہ میں قرآن کہتا ہے کہ یہ اللہ کو ماننا نہیں ہے۔سیدھی بات !!! وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ (میں جس کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے)

اللہ کو ماننا تو اُسی وقت کہا جائے گا جب اللہ کو اس کی تمام صفات کے ساتھ مانا جائے۔اللہ کی صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔زندگی دینے والا اس کے سوا کوئی نہیں۔موت دینے والا وہی ہے، اور کوئی نہیں۔روزی دینے والا وہی ہے، اور کوئی نہیں۔ بیماری اور تندرستی دینے والا وہی ہے، اور کوئی نہیں۔اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات میں یکتا ہیں، کوئی ان صفات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں ہے۔**اگر تم اللہ کی ان صفات میں کسی کو شریک مانتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اللہ کو نہیں مانتے ہو۔تمہارا اللہ کو ماننا معتبر نہیں** ہے۔معتبر نہ ہونے کی وجہ سے ہی یہ جملہ وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ. استعمال کیا گیا۔ میں جس کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے۔

توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ ہر چیز میں اللہ تنِ تنہا ہے۔کسی بھی چیز میں کوئی دیوی دیوتا اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔جیسے آسمانوں کا پیدا کرنے والا، زمین کا پیدا کرنے والا، سورج اور چاند کا پیدا کرنے والا، انسان اور جنات کو پیدا کرنے والا، جانوروں کو پیدا کرنے والا وہی اکیلا ہے۔اور سب کی حاجتوں کو پورا کرنے والا بھی وہی اکیلا ہے،

سب کو روزی دینے والا بھی وہی اکیلا ہے، سب کو تندرستی اور شفا دینے والا بھی وہی اکیلا ہے، سب کا مشکل کشا بھی وہی اکیلا ہے۔ **اگر آپ اللہ کے علاوہ کسی اور کو مشکل کشا یا حاجت روا، مختار کل سمجھتے ہیں تو اس کا مطلب ہوا کہ آپ نے اللہ کا انکار کیا۔ یہ ایک خاص نکتہ ہے، جو اس سورت میں بتلایا گیا ہے۔**

یہ بھی شرک ہے:

اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ ہمارے مسلمانوں میں بھی بعض لوگ اپنی جہالت اور نادانی اور اسلامی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے اللہ کے بعض نیک بندوں، اولیاء و انبیاء پیغمبروں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ہماری حاجات کو پورا کرنے والے ہیں۔ اور بہت سے لوگ اگر بچہ بیمار ہو، تو کسی بزرگ کے مزار پر جا کر ان سے سوال کرتے ہیں کہ ہمارا بیٹا بیمار ہے، آپ ان کو تندرست کر دیجیے۔ بہت سے بے اولاد، بزرگوں کے مزار پر جا کر سوال کرتے ہیں کہ داتا! ہمیں بیٹا دے دو، بیٹی دے دو۔ اس طرح اپنی حاجات ان سے مانگنا گویا اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنا ہے۔ یہ اللہ کا انکار ہے۔ جس طرح مشرکین مکہ شرک میں مبتلا تھے، اسی طرح یہ لوگ بھی شرک میں مبتلا ہیں۔ **کوئی بڑے سے بڑا رسول اور پیغمبر ہو، اس کا اپنا ایک مقام ہے، اس کا ادب واحترام سر آنکھوں پر!!! لیکن وہ صفات اور وہ کمالات جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں، ان کو اس کے لیے ثابت کرنا کفر وشرک ہے، اور توحید کے خلاف ہے۔**

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تنبیہ:

بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرض الوفات میں

چادر اوڑھے ہوئے تھے، گھٹن ہوتی تو سر سے چادر ہٹا دیتے تھے، اور آپ ﷺ کی زبان مبارک پر یہ کلمہ تھا: لعن الله اليهود و النصارىٰ اتخذوا قبور أنبيائهم مساجد؛ يحذِّر ماصنعوا. (**اللہ تعالیٰ یہود ونصاری پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنادیا۔ آپ ﷺ اپنی امت کواس فعل سے بچانا چاہتے تھے**)[۱] اس لیے تنبیہ کے طور پر فرمایا۔ جب آپ ﷺ اپنے متعلق یہ فرماتے ہیں تو چہ جائیکہ کسی ولی کی قبر پر سجدہ کیا جائے اور اس سے حاجتیں مانگی جائیں اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف:

کئی سال پہلے کا قصہ ہے: ایک مرتبہ ہم دو چار ساتھی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر دہلی، مہرولی گئے- جو ہمارے سلسلہ کے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بڑے خلیفہ ہیں- وہاں دیکھا کہ ایک آدمی سجدہ میں گرا ہوا ہے۔ اس کو روکا کہ بھائی! یہ پیشانی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے سامنے جھکنے کے لیے بنائی ہے، لیکن وہ حجت کرنے لگا۔ **بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ہم کو تو جو کچھ بھی ملا ہے اسی دروازے سے ملا ہے، یہ اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ ہر مؤمن کو چاہیے کہ ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو باز رکھے۔**

مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں:

اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت بھی اسی انداز سے کرنی چاہیے، ایک کافر اپنے دیوی دیوتا کے

---

(۱) أخرجه البخاري: ۱۳۳۰.

سامنے سجدہ کرتا ہے، اس کو تو ہم کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو گیا۔ اور ہمارا کوئی آدمی بزرگوں کی قبروں کے سامنے سجدہ کرے، تو اس کا ایمان سلامت رہتا ہے!!! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ خواجہ الطاف حسین حالیؒ نے مسدس میں اسی مضمون کو بہت اچھے انداز سے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں ۔

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر	جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہرِ سجدہ تو کافر (۱)	کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں	پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں	اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں	شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے	نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

حقیقت تو یہ ہے کہ جو معاملہ مشرکین اپنے دیوتاؤں اور بتوں کے ساتھ کرتے تھے آج کا مسلمان اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے بزرگوں کے مزارات پر وہی معاملہ کرتا ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

چوکنا رہیے!!!

دوسری بات یہ ہے کہ آج ہم اس ملک میں، جس ماحول میں رہتے ہیں، اور اس وقت اس ملک پر جو لوگ برسرِ اقتدار ہیں، وہ سب کفر اور شرک میں مبتلا ہیں۔ اور اب رفتہ رفتہ وہ یہاں کے تعلیمی نظام کو مشرکانہ بنانا چاہتے ہیں، اور اسی لیے اسکولوں میں باقاعدہ سرسوتی دیوی (સરસ્વતી દેવી) کی مورتی رکھی جاتی ہے، اور آنے والے ہر بچہ کو اس بات

(۱) بعض نسخوں میں یہ کلمات ہیں ۔ کہے آگ کو قبلہ اپنا تو کافر

کا پابند کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، جس کو سرسوتی وندنا (સરસ્વતી વંદના) کہتے ہیں۔ یوگا بھی ان کے ہاں عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔ چناں چہ یہ لوگ ان مختلف شکلوں کو اس وقت بتدریج غیر مسلم اسکولوں میں، عصری تعلیم گاہوں میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ ہمارا ملک سیکولر ہے، مذہبی نہیں ہے۔ تو یہ تعلیم گاہیں مذہبی خیالات سے دور اور پاک ہونی چاہیے، اِن میں ان چیزوں کی طرف میلان نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ سب کیا جا رہا ہے۔ ایسے موقع پر ہم سب مسلمانوں کو بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، کہیں نصاب میں ایسی چیزیں جن سے ہمارے بچوں کے عقیدے خراب ہوتے ہوں، یا اسکول میں بچوں سے ایسے اعمال کروائے جائیں، جن سے -نعوذ باللہ- ایمان سے محرومی کا اندیشہ ہو، تو ان سے چوکنا رہ کر ہمیں اس کو ختم کرنے، دور کرنے کی اجتماعی طور پر سعی کرنی چاہیے۔

شرکیہ عمل کے لیے ہم تیار نہیں، مفکر اسلام:

آج سے کئی سال پہلے یو پی کی حکومت نے راجیو گاندھی کے دورِ حکومت میں باقاعدہ سرکلر جاری کیا تھا کہ تمام اسکولوں میں آنے والے بچے اسکول میں آتے ہوئے پہلے سرسوتی وندنا (સરસ્વતી વંદના) کریں گے، یعنی سرسوتی دیوی کو ہاتھ جوڑیں گے۔ تو اس زمانہ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہٗ نے راجیو گاندھی کے پاس جا کر پوری قوت سے بات کی کہ ہم اپنی اولاد کو اسکولوں میں بھیجنا بند کر دیں گے۔ یہ تو کھلا شرک ہے، ہم اپنی اولاد کے لیے اس کو برداشت نہیں کریں گے۔ ہم اس ملک میں اپنی پوری توحید اور اپنے تمام ایمانی اعمال کے ساتھ رہیں گے، ہم کسی بھی شرکیہ عمل کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ اُسی زمانہ میں حضرت نے اپنے بیانات میں یہ مضمون جگہ جگہ بیان فرمایا:

اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ۙ اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ. (البقرۃ:۱۳۳)
حضرت یعقوب علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو جمع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے دنیا سے جانے کے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا. (البقرۃ:۱۳۳) (جواب میں ان بچوں نے عرض کیا کہ ہم آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادوں حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق کے معبود اسی ایک اللہ کی عبادت کریں گے۔ وَّ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ (البقرۃ:۱۳۳) (ہم اسی کے سامنے سر جھکائیں گے) تو ہمیں اس ملک میں ایسی چیزوں سے بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ اور اب تو باقاعدہ انہوں نے ان کی ایک نئی تعلیمی پالیسی (Policy) وضع کی ہے اور وہ بالکل کفریہ اور شرکیہ ہے۔ ایسے موقع پر تمام مسلمانوں کو متحد ہوکر اپنے ایمان کی حفاظت کی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا سبق، شریعت کے حکم بدلے نہیں جاسکتے:

دوسرا سبق اس میں یہ ہے کہ ان لوگوں کے صلح کی پیشکش کرنے پر جواب میں کہا گیا تھا کہ تم اپنے کفر پر رہتے ہوئے اور ہم اپنے ایمان پر رہتے ہوئے مذہب کے معاملہ میں، آپس میں متحد نہیں ہوسکتے۔ ایسی ایکتا اور ایسے اتحاد کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ ایسی صلح جس کے نتیجہ میں ہمیں اپنے مذہبی اصول کو قربان کرنا پڑے، اپنے ایمان سے ہاتھ دھونا پڑے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ اور ویسے بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح کے سلسلہ میں ایک اصول بتلا دیا ہے کہ الصلح جائز بین المسلمین إلا صلحاً حرم حلالاً أو أحل حراماً. (مسلمانوں کے درمیان ہر صلح جائز ہے، مگر وہ صلح جو شریعت کی حلال کردہ کسی چیز کو

حرام قرار دیتی ہو، یا شریعت کی حرام کردہ کسی چیز کو حلال قرار دیتی ہو؛ وہ جائز نہیں ہے)[۱]
گویا شریعت کے حکم بدلے نہیں جاسکتے۔

لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق:

سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں وضاحت سے گزر چکا کہ لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق.[۲] اللہ تعالیٰ نے بہت سے لوگوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اولاد کو ماں باپ کی اطاعت کا، بیوی کو شوہر کی اطاعت کا؛ لیکن ان کے سلسلہ میں بھی تاکید ہے کہ ماں باپ اگر کوئی ایسا حکم دیتے ہیں جس کی وجہ سے شرک لازم آتا ہو تو قرآن نے کہا: وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا. (لقمان:۱۵) ان کی بات مت ماننا؛ البتہ ماں باپ ہیں، دنیوی زندگی میں ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنا؛ لیکن ان کی بات پر عمل کرتے ہوئے شرک اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ کسی حال میں بھی ایسی کوئی شکل جس سے-نعوذ باللہ-شرک لازم آتا ہو، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، یا شریعت نے جس کو حرام قرار دیا ہوا ایسا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ کوئی بھی صلح ایسی ہو جو شریعت کے کسی صریح حکم کو بدلنے والی ہو اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے۔ ہمارے بڑوں نے اس معاملہ میں-ماشاءاللہ-بہت ہمت سے کام لیا ہے۔

---

(۱) أخرجه أبو داود برقم: ۳۵۹۴ والترمذي: ۱۳۹۲ وابن ماجة: ۲۳۵۳.

(۲) أخرجه الطبراني بهذا اللفظ في الأوسط برقم: ۳۹۱۷ (ط: دار الحرمين، القاهرة) وأخرجه أحمد في مسنده برقم: ۲۰۶۵۳ و ۲۰۶۵۶ ولفظه: "لا طاعة فی معصیة الله".

کاش میری سو جانیں ہوتیں

ایک دل سوز واقعہ:

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ کی ماتحتی میں ایک لشکر بھیجا گیا تھا، رومیوں نے اس لشکری دستہ کو قید کرلیا، اور قید میں رومی بادشاہ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ کو پہلے تو لالچ دلایا کہ اگر تم مذہبِ اسلام چھوڑ دو، تو میں اپنی بیٹی کا نکاح تم سے کرادوں، اور اپنی آدھی سلطنت تم کو دے دوں۔لیکن یہ تیار نہیں ہوئے۔انہوں نے کہا: آدھی کیا؟ تیری پوری سلطنت کیا؟ پوری دنیا کی سلطنت بھی دے، تب بھی میں اسلام اور ایمان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔اس نے دیکھا کہ لالچ کام نہیں کرتا، تو دھمکی دی کہ میں تمہیں قتل کردوں گا۔اور باقاعدہ عملی طور پر ایک دیگ آگ پر چڑھائی، اس میں تیل ڈالا، جب تیل خوب کھولنے لگا، تو قیدیوں میں سے ایک قیدی کو ان کے دیکھتے ہوئے اس میں ڈالا، اندر پڑتے ہی اس کے سب اعضاء الگ ہوگئے، اور وہ جل گیا۔کہا کہ دیکھو! تمہارے ساتھ بھی یہ معاملہ ہوگا۔انہوں نے کہا: تم جو چاہو، کرو۔بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو پکڑو، اور اندر ڈالو۔جب ان کو ڈالنے کے لیے پکڑا تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکلے، بادشاہ سمجھا کہ شاید نرم پڑ گئے ہیں، تو اس نے بلا کر پوچھا: کیا بات ہے؟ آنکھوں میں آنسو آگئے!!! کچھ ارادہ بدلا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! **آنکھوں میں آنسو تو اس لیے آئے ہیں کہ مجھے افسوس ہے کہ آج اللہ کے راستے میں قربان کرنے کے لیے میرے پاس ایک ہی جان ہے۔اگر میرے ہر بال کے برابر میرے پاس جانیں ہوتیں، تو میں ان ساری جانوں کو اللہ کے راستے میں قربان کردیتا۔** بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ اپنی بات سے نہیں ہٹیں گے۔تو کہا:

اچھا! ایک کام کرو، میری پیشانی کو بوسہ دو تو چھوڑ دوں۔ انہوں نے کہا: مجھ اکیلے کو چھوڑو گے یا میرے ساتھیوں کو بھی؟ اس نے کہا کہ ساتھیوں کو بھی۔ تو حضرت عبداللہ بن حذافہؓ نے کہا: ٹھیک ہے۔ کافر بادشاہ کی پیشانی کو بوسہ دینا اس قدر ناجائز نہیں، بلکہ اس کا ایک درجہ ہے۔ تمام احکام کی شریعت میں کیٹیگری رکھی گئی ہے، تو انہوں نے سوچا کہ اس سے سب ساتھیوں کی جان بچ جاتی ہے، اس لیے مان لیا۔ دیکھو! جان کی دھمکی دی گئی تھی، تب بھی وہ نہیں مانے، لیکن ساتھیوں کی جان بچانے کے لیے تسلیم کیا۔ بوسہ دیا، اور خود کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی جان بچا کر لے آئے۔ مدینہ منورہ واقعہ کی خبر پہنچ چکی تھی۔ حضرت عمرؓ کا دور خلافت تھا، حضرت عمرؓ نے اعلان کیا، سب کو حکم دیا کہ مدینہ سے باہر جا کر ان کا ستقبال کریں، اور ان کی پیشانی کو سب بوسہ دیں، اور سب سے پہلے میں بوسہ دوں گا۔[۱]

اس کی اجازت ہے:

بہر حال! یہ دوسرا سبق ہے کہ ایمان کے معاملہ میں کسی کے ساتھ صلح نہیں کی جاسکتی، ایسی صلح کی شریعت اجازت نہیں دیتی، جس میں ہمیں اپنے مذہب کے اصولوں کو چھوڑنا پڑے، اس کے باب میں ہمیں رعایت کرنی پڑے۔ ہاں! اس کو چھوڑے بغیر اگر کوئی صلح کی جاسکتی ہے تو اس کی گنجائش ہے۔ وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا. (الانفال:۶۱) (اگر غیر مسلم صلح کے لیے مائل ہوتے ہیں تو اے نبی! آپ بھی مائل ہو جائیں) **تو ایسی صلح جس میں دین کے اصولوں کو قربان نہ کرنا پڑتا ہو تو اس کی اجازت ہے۔ جیسے ہم مل جل کر ایک مشترکہ دشمن**

(۱) معرفة الصحابة لأبي نعيم الأصبهاني: ۳/ ۱۲۱۵ [۳۰۶۲] (ط: دارالوطن، الرياض) و شعب الإيمان للبيهقي: ۳/ ۱۷۹ [۱۵۲۲] (ط: مكتبة الرشد، الرياض) والاستيعاب في معرفة الأصحاب لابن عبدالبر: ۳/ ۸۹۰ [۱۵۰۸] (ط: دارالجيل، بيروت) وتاريخ دمشق لابن عساكر: ۲۷/ ۳۵۷-۳۶۰ [۳۲۳۷] (ط: دارالفكر للطباعة والنشر)

کامقابلہ کریں گے،مل جل کر اپنے ملک کوترقی دینے کے لیے تجارت وغیرہ میں ساتھ رہ کر کام کریں گے،تواس کی اجازت ہے۔شریعت اس سے منع نہیں کرتی۔

یہ دوسبق اس سورت سے ہمیں دیے گئے ہیں،ان کا ہمیں خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۂ کوثر

(مؤرخہ: ۲۸ ر ذی الحجہ ر ۱۴۳۹ھ مطابق ۸ ر ستمبر ۲۰۱۸ء شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم○ بسم الله الرحمٰن الرحيم○

اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ ۝١ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ ۝٢ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ ۝٣

مکی یا مدنی......؟

یہ سورۂ کوثر ہے، مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ یہ سورت مکی ہے یا مدنی؟ اس سلسلے میں دونوں باتیں کہی گئی ہیں۔ حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور جمہور سے منقول ہے کہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اور مسلم شریف میں حضرت انسؓ کی روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی؛[1] لیکن عام طور پر حضرات مفسرین اس کو مکی ہی شمار

---

(۱) صحیح مسلم: ۵۳ [۴۰۰].

کرتے ہیں۔اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے متعلق بتلایا جاتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحب زادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ جو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے، اور وہیں اُن کا انتقال ہوا، اس موقع پر بھی کافروں اور منافقوں نے خوشیاں منائی تھیں، ہوسکتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اس موقع پر اس کو دوسری مرتبہ نازل کیا گیا ہو۔[۱]

شانِ نزول:

اس سورت کے شان نزول کے متعلق بتلایا جاتا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحب زادے کا انتقال ہوا، تو اس وقت کافروں نے بطورِ خاص عاص بن وائل نے بڑی خوشیاں منائیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب اولاد، سوائے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار صاحب زادیوں نے تو بڑی عمر پائی، اور ایمان بھی لائیں۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحب زادے بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت و مشیت کا یہی تقاضا تھا، چوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین بنایا تھا، اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ نبی کی اولاد بھی نبی ہوتی ہے، ان کو بھی پیغمبری سے نوازا جاتا ہے، اور ماننے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو غلو کے شکار ہوتے ہیں، وہ ان کے بڑے ہونے کے بعد ان کو کوئی مسئلہ نہ بنالیں، اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نرینہ اولاد کو بچپن ہی میں اٹھالیا۔

(۱) حضرت زینب رضی اللہ عنہا:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحب زادیاں چار تھیں۔ سب سے بڑی صاحب زدای حضرت

---

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زادالمسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

زینبؓ ہیں۔ جب نبی کریم ﷺ کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ہوا، اس وقت حضور اکرم ﷺ کی عمر شریف پچیس سال تھی، نکاح کے پانچ سال بعد حضرت زینبؓ پیدا ہوئیں، یہ صاحب زادیوں میں سب سے بڑی ہیں۔ اس وقت نبی کریم ﷺ کی عمر شریف تیس سال کی تھی۔

(۲) حضرت رقیہؓ:

اوران کے تین سال بعد حضرت رقیہؓ پیدا ہوئیں۔ اس وقت حضور اکرم ﷺ کی عمر شریف تینتیس سال تھی۔ حضرت زینبؓ کا نکاح ان کے خالہ زاد بھائی حضرت ابوالعاص بن ربیع – حضرت خدیجہؓ کے بھانجے – سے ہوا تھا۔ بعد میں وہ بھی ایمان لائے اور حضرت زینبؓ جب ہجرت کے لیے روانہ ہوئیں، تو بعض مشرکین نے پیچھا کیا، اور آپؓ کے ہودج پر برچھا لگایا، اس سے آپؓ نیچے پتھر پر گریں، حمل سے تھیں، اسی وقت سے بیمار رہوئیں، اور اسی بیماری میں آپؓ کا انتقال ہوا۔ حضرت شیخؒ نے حکایات صحابہؓ میں پورا قصہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ سنہ ۸ ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۳) حضرت ام کلثومؓ:

دوسری صاحب زادی حضرت رقیہؓ اور تیسری صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ دونوں کا نکاح حضور ﷺ نے پہلے ابولہب کے دونوں بیٹوں سے کرایا تھا، بڑا بیٹا عتبہ، اور چھوٹا بیٹا عتیبہ تھا۔ حضرت رقیہؓ کا نکاح عتبہ سے کرایا تھا، اور حضرت ام کلثومؓ کا نکاح عتیبہ سے کرایا تھا۔ رخصتی ہونے سے قبل ہی حضور اکرم ﷺ کی دعوتِ اسلام کا سلسلہ شروع ہوا، اور ابولہب نے آپ ﷺ کی مخالفت شروع کی، اس موقع پر سورۂ لہب نازل ہوئی۔ یہ پورا قصہ آپ سن چکے ہیں۔ اس وقت ابولہب نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا: اگر تم ان (حضور ﷺ) کی

بیٹیوں کو طلاق نہیں دو گے تو میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چناں چہ اس کے دونوں بیٹوں نے حضور ﷺ کی دونوں صاحب زادیوں کو طلاق دے دی۔ یہ قصہ بھی سورۂ لہب کے ضمن میں آپ کو بتلایا گیا ہے۔اس وقت اِن دونوں کی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔

تین ہجرتوں کی سعادت:

پھر حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت رقیہؓ -دوسرے نمبر کی صاحب زادی- کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کیا۔ وہ بھی ایمان لائے تھے۔اور جب مسلمانوں نے مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کی ہجرت کی،تو اُن ہجرت کرنے والوں میں یہ جوڑا - حضرت عثمانؓ ،اورآپ ﷺ کی صاحب زادی حضرت رقیہؓ -بھی تھا۔پھر حبشہ میں کسی نے افواہ چلا دی کہ مکہ والے سب ایمان لے آئے،تو جو لوگ ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے وہ یہ سوچ کر کہ ہم تو ان کی ایذاؤں کی وجہ سے یہاں آئے ہوئے تھے،اب وہ سب ایمان لے آئے ہیں،تو ہم واپس چلے جائیں۔لیکن جب واپس آئے،تو معلوم ہوا کہ یہ خبر تو جھوٹی تھی،تو دوبارہ ہجرت کی۔حبشہ کی دونوں ہجرتیں حضرت رقیہؓ نے اپنے شوہر حضرت عثمانؓ کے ساتھ کی ہیں۔پھر وہاں سے وہ مدینہ بھی پہنچے۔گویا تین ہجرتیں ہوئیں۔

حضور ﷺ جب غزوۂ بدر کے لیے نکلے تو اس وقت حضرت رقیہؓ بیمار تھیں،اور حضرت عثمانؓ حضور ﷺ کے ساتھ غزوۂ بدر میں شرکت کرنا چاہتے تھے۔لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کو روک دیا،اورتاکید فرمائی کہ تم ان کی خبر گیری میں رہو۔ چناں چہ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی اوراس کی خوش خبری لے کر جب آدمی مدینہ منورہ پہنچا،تو اُس نے دیکھا کہ لوگ حضرت رقیہؓ کو دفن کر کے فارغ ہوئے ہیں۔ان کا انتقال سنہ ۳ھ میں ہوا۔

ذوالنورین:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے حضور ﷺ نے دوسری صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ کو بھی حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دیا، یہ کہہ کر کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں ان کے نکاح میں دے رہا ہوں۔ اسی لیے حضرت عثمانؓ کا لقب ذوالنورین تھا دونور والے۔ نبی کریم ﷺ کی دو صاحب زادیاں ان کے نکاح میں تھیں، اس لیے ان کو ذوالنورین کہا جاتا تھا۔ حضرت ام کلثومؓ کا انتقال سنہ ۹ھ میں ہوا۔ حضور ﷺ ان کی تدفین میں شریک رہے ہیں۔

(۴) حضرت فاطمہؓ:

اور چوتھی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ۔ نبوت کے ایک سال بعد پیدا ہوئیں۔ گویا آپ ﷺ پر وحی کا سلسلہ شروع ہوا، اس کے بعد ان کی پیدائش ہوئی۔ حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا، اور پھر ان ہی سے آپ ﷺ کی اولاد چلی۔ آج تک سادات کا سلسلہ ان ہی سے ہے۔ یہ تو صاحب زادیاں ہیں۔

(۱) حضرت قاسمؓ:

اور صاحب زادوں میں نبی کریم ﷺ کے بڑے صاحب زادے حضرت قاسمؓ حضرت زینبؓ سے پہلے پیدا ہوئے، یا بعد میں؟ اس سلسلے میں مؤرخین میں اختلاف ہے بعض حضرات فرماتے ہیں: پہلے حضرت زینبؓ، پھر حضرت قاسم پیدا ہوئے۔ بعض حضرات کا قول اس کے برعکس ہے۔ بہر حال! دو سال کی عمر میں حضرت قاسمؓ کا انتقال ہو گیا تھا۔

(۲) حضرت عبداللہؓ:

دوسرے صاحب زادے حضرت عبداللہؓ نبوت کے بعد پیدا ہوئے۔ اوران کی پیدائش کے بعدان کے علاوہ صاحب زادوں میں ایک حضرت ابراہیمؓ ہیں، جو مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کی باندی حضرت ماریہ قبطیہؓ سے پیدا ہوئے تھے۔ان تین صاحب زادوں کے متعلق سب کا اتفاق ہے۔ان کے علاوہ کے سلسلے میں بعض کہتے ہیں کہ طیب بھی تھے، طاہر بھی تھے۔یعنی کل ملاکر پانچ تھے۔بعض کہتے ہیں کہ طیب اور طاہر ایک ہی صاحب زادے کا لقب تھا۔توکل چار ہوئے۔بعضوں نے کہا کہ طیب اور طاہر حضرت عبداللہ جو نبوت کے بعد پیدا ہوئے تھے،نبوت کے بعد پیدا ہونے کی وجہ سے ان ہی کے لقب تھے۔اوراسی کو حضرات مؤرخین نے راجح قرار دیا ہے۔

جب کوئی نرینہ اولاد باقی نہ رہی:

حضرت عبداللہؓ بچپن ہی میں انتقال کر گئے،اس کے بعد آپ ﷺ کی کوئی نرینہ اولاد باقی نہ رہی۔ اس وقت مکہ کے مشرکین نے جو آپ ﷺ کے دشمن تھے اوران میں خاص طور پر عاص بن وائل،اورآپ ﷺ کا چچا ابولہب،ان لوگوں نے خوشیاں منائیں۔ اور یوں کہا کہ اب ان کی تو کوئی نرینہ اولاد نہ رہی۔ اورعرب لوگ جس کی نرینہ اولاد ختم ہو جاتی / نہ ہوتی،اس کو ابتر کہتے تھے۔گویا ان کے دنیا سے جانے کے بعد دنیا میں ان کا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔اولاد ہی سے آدمی کا سلسلہ چلتا ہے،اور جب وہ ختم ہوگئی تو یہ بے نام ونشان ہوگیا۔اس پر عاص بن وائل نے کہا تھا کہ یہ ابتر ہیں۔ اوراسی پر اللہ تبارک و

تعالیٰ نے بشارت سناتے ہوئے یہ سورت نازل فرمائی۔[1]

سب سے چھوٹی سورت:

کلمات اور حروف کے اعتبار سے قرآن کی سورتوں میں یہ سب سے چھوٹی سورت ہے۔کلمات ۱۴/ بتلائے گئے ہیں، اور حروف ۴۲/ ہیں۔گویا تمام سورتوں میں یہ سب سے چھوٹی سورت کہلاتی ہے۔

اس سورت میں آپ ﷺ کو دو خوش خبریاں دی گئی ہیں، اور دو حکم دیے گئے ہیں۔پہلی خوش خبری تو یہ دی گئی: اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ (اے نبی! یقین جانو! ہم نے آپ کو کوثر عطا کر دی ہے)۔

کوثر کیا ہے؟

کوثر کیا ہے؟ یہ کلمہ کثرة سے بنا ہے۔لغت اور ڈکشنری کے اعتبار سے کوثر خیر کثیر کو کہتے ہیں، یعنی بہت زیادہ بھلائی۔[2] اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو دنیوی، اخروی، مادی اور روحانی بہت ساری بھلائیوں سے نوازا تھا۔آپ ﷺ کو نبوت عطا فرمائی، قرآن عطا فرمایا، آپ ﷺ کو اتنی بڑی امت دی۔سب بھلائیاں ہی بھلائیاں ہیں۔دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی۔گویا ان سب کی طرف اشارہ ہے۔

---

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

(۲) كتاب العين للفراهيدي: ۳۴۸/۵ (ط: مكتبة الهلال)

جنت کی نہر:

اور ان ہی میں سے ایک وہ نہر بھی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے جنت میں بنائی ہے، جس کا نام نہر کوثر ہے۔ اور ان ہی میں سے وہ حوض بھی ہے جو میدان حشر میں ہوگا، جو چوکور (ચોરસ) ہوگا۔ کوثر حوض بھی ہے اور نہر بھی ہے۔ نہر تو جنت میں ہے، اور اسی نہر سے دو پرنالے- ایک چاندی کا اور ایک سونے کا - میدان حشر میں اس حوض میں پانی ڈالنے کے لیے لائے گئے ہیں۔ اور ان سے پانی اس حوض میں گرتا رہتا ہے۔ اور وہ پانی اسی نہر سے پہنچتا رہتا ہے۔ اس حوض کا نام بھی حوض کوثر ہے۔ جب محشر میں لوگ دوبارہ زندہ کرکے پہنچائے جائیں گے تو پیاسے ہوں گے، اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کے لوگوں کو اسی میں سے پانی پلائیں گے۔ تو یہ کوثر حوض بھی ہے، اور اس حوض میں پانی جنت کی جس نہر سے آتا ہے اس نہر کا نام بھی نہر کوثر ہے۔[۱]

اولاد کی زیادتی:

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ تفسیر فتح العزیز (تفسیر عزیزی) میں فرماتے ہیں کہ کوثر سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کی زیادتی بھی مراد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد دو طرح کی ہے: حقیقی اور مجازی۔ حقیقی اولاد جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی، آج دنیا میں دیکھیے! سادات پورے عالم میں بڑی تعداد میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد کو اتنا کثیر بنایا کہ پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ سادات کا سلسلہ

---

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

آپ جہاں جہاں جائیں گے، وہاں نظر آئے گا۔ تو آپ ﷺ کی اولاد کی اتنی کثرت ہے -جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت فاطمہؓ کے ذریعہ فرمائی- کہ کسی کی اولاد کی اتنی کثرت نہیں ہے۔ یہ تو حقیقی اولاد ہے جو آپ ﷺ کی صاحب زادی سے وجود میں آئی۔

مجازی اولاد:

اور دوسری مجازی اولاد ہے۔ وہ آپ ﷺ پر ایمان لانے والے تمام اہل ایمان ہیں۔ ان کی تعداد تو اتنی زیادہ ہے کہ قیامت کے روز تمام امتوں میں سب سے زیادہ بڑی امت آپ ﷺ کی ہوگی۔[۱]

ترمذی شریف کی روایت ہے کہ میدان حشر میں اہل جنت کی ۱۲۰/ صفیں لگیں گی، ان میں سے ۸۰/ یعنی دو تہائی صفیں امت محمدیہ کی ہوں گی۔[۲] اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ ﷺ کی روحانی اور مجازی اولاد کی کتنی بڑی تعداد ہے!!! اور وہ سب میدان حشر میں حوض کوثر پر آپ ﷺ کے دست مبارک سے پانی پیے گی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت سنائی۔

تمام علوم پائے:

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ علوم کی کثرت یہ بھی اس کوثر میں آجاتی ہے۔[۳] اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امت کو جتنے علوم عطا فرمائے کسی اور امت کو اتنے علوم نہیں دیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے پہلے جتنی بھی امتیں گذری ہیں، ان تمام کے علوم اس امت نے

---

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

(۲) سنن الترمذي: ۲۵۴۶.

(۳) تفسیر عزیزی/ ۲۶۰۔

پائے ہیں، اس لیے کہ یہ بعد میں آئی۔ نیز خود اس امت نے بہت سے علوم کی ایجاد کی: نحو، صرف، معانی، بلاغت، تفسیر، حدیث، اصول تفسیر، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم رجال وغیرہ اس امت نے ایجاد کیے ہیں۔ تو اگلوں اور پچھلوں کے سارے علوم اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عطا فرمائے۔ اور کوثر کا عرفی معنی نہر یا حوض ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمایا۔[۱]

بہر حال! اس پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے سب باتیں اڑائیں، خوشیاں منائیں اس کی وجہ سے آپ ﷺ کا دل رنجیدہ ہوا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس خوش خبری کے ذریعے آپ ﷺ کو خوشی عطا فرمائی۔

پہلی خوش خبری:

مسلم شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہمارے درمیان نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہوئی، جو وحی کے نزول کے وقت طاری ہوتی تھی، جب وہ کیفیت دور ہوئی، تو آپ ﷺ مسکرانے لگے۔ ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کیوں مسکراتے ہیں؟ تو جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایک سورت نازل فرمائی، اور پھر آپ ﷺ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر پوری سورت سنائی، پھر خود ہی سوال کیا کہ جانتے ہو کوثر کیا ہے؟ اور پھر آپ ﷺ نے کوثر کی تشریح فرمائی۔[۲] بہر حال! اس سورت کو نازل فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو خوش

---

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

(۲) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

خبریاں عطا فرمائی تھیں۔ان میں سے ایک خوش خبری تو یہ ہے۔

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے:

دوسری خوش خبری تیسری آیت میں ہے: اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ. شنأ–یشنأ کا معنی ہے بغض و عداوت رکھنا، دشمنی رکھنا۔ وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا (المائدة:۸) (کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کرو) اسی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے شانئ یعنی دشمن، اسی سے کہا: اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (یقین جانو! تمہارا دشمن ہی ہے وہ جس کی جڑ کٹی ہوئی ہے) ابتر یعنی جس کی دم کٹی ہوئی ہو، جڑ کٹی ہوئی ہو۔ جو بے اولاد ہو اس کو بھی ابتر کہتے ہیں، جس کا اب نام و نشان نہیں۔ وہ آپ کو بے نام و نشان کہتا ہے!!! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: نہیں! آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں، یہ آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہے۔

چناں چہ آج پورے عالم میں کروڑوں کی تعداد میں آپ ﷺ کے ماننے والے ہیں، وہ ہر وقت اپنی جان آپ ﷺ کی عزت و آبرو کے لیے چھڑکنے کے لیے تیار ہیں، آپ ﷺ پر درود شریف پڑھنے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں، آپ ﷺ کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ حاضری کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں، اور آپ ﷺ ہی کی نسبت سے اپنی اولاد کے نام احمد یا محمد رکھتے ہیں ان کی تعداد اور کثرت دیکھو۔

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے	رفعت شان ورفعنا لک ذکرک دیکھے

(اقبالؔ)

وہی دُم بریدہ ہے:

نیز اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ آپ ﷺ کا نام اذان میں بھی جُڑوایا

اور اقامت میں بھی ۔ دنیا میں سورج گردش کرتا ہے، تو ہر لمحہ کسی نہ کسی جگہ نئی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے ۔ ہمارا غروب تو کب سے ہو گیا؛ لیکن اس وقت کسی نہ کسی جگہ سورج غروب ہو رہا ہوگا، اور اس کے بعد مغرب کی اذان ہوگی ۔ اِس وقت کہیں عشاء کا وقت شروع ہو رہا ہوگا، کہیں فجر کا وقت شروع ہو رہا ہوگا، کہیں ظہر کا وقت شروع ہو رہا ہوگا، کہیں عصر کا وقت شروع ہو رہا ہوگا۔ گویا پورے عالم میں ہر وقت کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی نماز کا وقت شروع ہو رہا ہے، اور نماز بھی پڑھی جا رہی ہے ۔تو اذان اور اقامت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ ﷺ کا نام بھی لیا جا رہا ہے ۔آپ ﷺ کا نام لینے والے اللہ تعالیٰ نے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں پیدا فرمائے ۔تو جو آپ ﷺ کو بے نام ونشان کہتا تھا، آج آپ ﷺ سے زیادہ کسی کا نام لینے والا نہیں ہے ۔اور عاص بن وائل وغیرہ جو آپ ﷺ کو بے نام ونشان کہتے تھے ان کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وہی ابتر اور دم بریدہ ہے ۔آج اس کا کوئی نام جاننے والا بھی نہیں، اور اگر اس کا نام لیا بھی جاتا ہے تو اس واقعے کی نسبت سے، اور وہ بھی اچھائی کے ساتھ نہیں؛ بلکہ برائی کے ساتھ لیا جاتا ہے ۔ ورنہ نام بھی کون جانتا ہے؟ اور اس کے نام پر نام رکھنے والے آج دنیا میں کتنے ہیں؟ کسی نے بھی اس کے نام پر اپنی اولاد کا نام رکھا؟ تو حقیقت میں وہی بے نام ونشان ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بڑی عزت عطا فرمائی ہے ۔

یہ دو خوش خبریاں تھیں، پہلی آیت میں، اور تیسری آیت میں ۔ بیچ کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو حکم بھی دے دیے ۔

دو حکم:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اتنی بڑی خیر عطا فرمائی ہے تو اے نبی! فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ (تم اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھو، اور قربانی کرو)۔ نحر اونٹ کے ذبح کرنے کو کہتے ہیں؛ لیکن یہاں مطلق قربانی مراد ہے۔

نمازِ عید و قربانی واجب ہے:

یہاں کون سی نماز مراد ہے؟ تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت تو یہ ہے کہ اس سے پانچوں وقت کی فرض نمازیں مراد لی گئی ہیں۔[1] اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت جو علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عید الاضحیٰ کی نماز مراد لی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پہلے نبی کریم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ قربانی پہلے کرتے تھے، اور پھر نماز پڑھتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی، تو آپ ﷺ پہلے عید کی نماز پڑھنے لگے، اور اس کے بعد قربانی کرنے لگے۔[2] تو اس سے معلوم ہوا کہ نماز سے عید کی نماز مراد ہے۔ اور فصَلِّ اور وانحر یہ دونوں امر کے صیغے ہیں اسی لیے احناف اس بات کے قائل ہیں کہ عید کی نماز بھی واجب ہے، اور قربانی بھی واجب ہے۔ ان ہی آیتوں کی وجہ سے ان کے وجوب کے قائل ہیں، ان ہی سے وجوب پر استدلال کیا گیا ہے۔

دشمن کی ناکامی کا غیبی نسخہ:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی کسی کی مخالفت پر آمادہ ہے، دشمنی پر اترا ہوا

---

(۱) رواہ الضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما (تفسیر القرطبي) ورواہ الطبري بسندہ عن علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ.

(۲) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

ہے، اس کی طرف سے اس کے خلاف اسکیموں کو اگر وہ ناکام ونامراد بنانا چاہے، تو اس کا غیبی نسخہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت میں بتلادیا کہ نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ اس کا اہتمام کروگے تو اللہ تعالیٰ آپ کے دشمن کو ناکامی عطا فرمائیں گے۔

اب کوثر کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ ارشادات ہیں، مشکوٰۃ شریف میں صاحب مشکوٰۃ نے کوثر کی مناسبت سے جو روایات ذکر کی ہیں ان ہی کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

چند احادیثِ حوضِ کوثر:

مشک کے مانند خوشبودار:

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں شب معراج میں جنت میں چل پھر رہا تھا، اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہر کی دونوں جانب موتیوں کے بنائے ہوئے ایسے قبے ہیں کہ موتیوں کو اندر سے تراش کر اس نہر پر ایک ایک موتی کا ایک ایک قبہ بنا دیا گیا ہے۔ میں نے دریافت کیا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ کوثر ہے، جو آپ کے رب نے آپ کو عطا فرمائی ہے، اس کے اندر کی مٹی بہت تیز خوشبودار مشک ہے۔[۱] گویا یہ جنت کی نہر ہے، نہر بھی ہے، اور اسی سے پانی لا کر میدان حشر میں حوض بھی بنایا گیا ہے۔

---

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

آسمان کے تارے، کوثر کے پیالے:

(۲) حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت، سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے حوض کا طول وعرض یعنی لمبائی اور چوڑائی اتنی زیادہ ہے کہ اس کی ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لیے ایک مہینے کی مدت درکار ہے۔ یعنی اُس زمانہ میں جو سفر کے ذرائع تھے، ان کے ذریعے سے ایک مہینے کی مسافت کے بقدر اس کی لمبائی بھی ہے، اور چوڑائی بھی۔ حوض کوثر چوکور ہے، اس کے گوشے برابر ہیں، یعنی طول وعرض دونوں برابر ہیں۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہے، اس کی خوشبو مشک سے زیادہ عمدہ ہے، اس کے لوٹے اتنے ہیں جتنے آسمان کے ستارے، جو اس میں سے پیے گا کبھی پیاسا نہ ہوگا۔[۱] جس نے ایک مرتبہ پی لیا تو کبھی اس کو پیاس نہ ستائے گی۔ پھر جنت میں جو پینا وغیرہ ہوگا وہ صرف لذت حاصل کرنے کے لیے ہوگا، پیاس بجھانے کے لیے نہیں۔

ضرور پہچانیں گے:

(۳) حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرا حوض اس قدر لمبا اور چوڑا ہے کہ اس کے دونوں طرفوں کے درمیان اُس فاصلے سے بھی زیادہ فاصلہ ہے جو ''ایلہ'' سے ''عدن'' تک ہے۔[۲] (ایلہ فلسطین کے علاقے میں ایک بندرگاہ ہے، اور عدن یمن میں واقع ہے۔ ان دونوں کے درمیان جتنا فاصلہ ہے، حوض کوثر کا ایک سِرا دوسرے سِرے سے اتنا دور ہے) سچ جانو! وہ برف سے زیادہ سفید اور اُس شہد

---

(۱) رواه الشيخان: البخاري: ۲۰۹۳ ومسلم: ۴۲۴۴.

(۲) رواه الشيخان: البخاري: ۲۰۹۳ ومسلم: ۴۲۴۴.

سے زیادہ میٹھا ہے جو دودھ میں ملا ہوا ہو، اور اس کے برتن ستاروں کی تعداد سے زیادہ ہیں، اور میں دوسری امتوں کو اپنے حوض پر آنے سے ہٹاؤں گا، جیسے دنیا میں کوئی شخص دوسروں کے اونٹوں کو اپنے حوض سے ہٹاتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا اُس روز ہم کو آپ پہچانتے ہوں گے؟ یعنی ہم آئیں گے تو آپ ہم کو پہچانیں گے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! ضرور پہچانیں گے۔ اس لیے کہ تمہاری ایک علامت ہوگی، وہ کسی اور امت کی نہیں ہوگی، وہ یہ کہ تم حوض پر میرے پاس ایسی حالت میں آؤ گے کہ وضو کے اثر سے تمہارے چہرے روشن ہوں گے، اور ہاتھ پاؤں سفید ہوں گے۔[۱] تو وضو کرو گے اور نمازیں پڑھو گے تب یہ چیز پائی جائیں گی نا!!!! اس لیے اس کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

(۴) مسلم شریف کی دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: آسمان کے ستاروں کی تعداد کے برابر حوض میں سونے چاندی کے لوٹے نظر آرہے ہوں گے۔[۲]

دو پرنالے، سونے اور چاندی کے:

(۵) مسلم شریف کے حوالے سے ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: آپ ﷺ نے فرمایا: اُس حوض میں دو پرنالے گر رہے ہوں گے جو جنت کی نہر سے اس کے پانی میں اضافہ کررہے ہوں گے۔ ایک پرنالہ سونے کا اور دوسرا چاندی کا ہوگا۔ یعنی محشر میں جو حوض بنایا جائے گا اس کا پانی جنت کی نہر کوثر سے آئے گا۔[۳]

بہرحال! احادیث شریفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہر کوثر جنت میں ہے اور میدان حشر

(۱) رواہ الشیخان: البخاري: ۲۰۹۳ ومسلم: ۴۲۴۴.

(۲) رواہ الشیخان: البخاري: ۲۰۹۳ ومسلم: ۴۲۴۴.

(۳) صحیح مسلم: [۳۷] ۲۳۰۱.

میں اس میں سے ایک شاخ لائی جائے گی، جس میں اوپر سے پانی آتا رہے گا، اور ایمان والے اس میں سے پیتے رہیں گے۔

جامِ کوثر کس کے لیے:

(٦) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک اور روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میرا حوض اتنا بڑا ہے کہ جتنا عدن اور عمّان کے درمیان فاصلہ ہے۔ (عدن یمن میں ہے، عمان جورڈن میں ہے) برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا، اور مشک سے بہتر اس کی خوشبو ہے۔ اس کے پیالے آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ ہیں، جو اس میں سے ایک مرتبہ بھی پی لے گا اس کے بعد کبھی بھی پیاسا نہ ہوگا۔ سب سے پہلے اس پر مہاجرین، فقراء آئیں گے۔ کسی نے مجلس میں سے پوچھا: یا رسول اللہ! ان مہاجرین، فقراء کا حال بتا دیجیے! تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ وہ ہیں کہ دنیا میں جن کے سروں کے بال بکھرے ہوئے اور چہرے بھوک، محنت اور تھکن کے باعث بدلے ہوئے ہوتے تھے، ان کے لیے بادشاہوں اور حاکموں کے دروازے نہیں کھولے جاتے تھے، اور عمدہ عورتیں ان کے نکاح میں نہیں دی جاتی تھیں۔[1] اور ان کے معاملات کی خوبی کا حال یہ تھا کہ اُن کے ذمے کسی کا حق ہوتا تھا وہ ادا کر دیتے تھے، اور ان کا حق جو کسی کے ذمے ہوتا وہ پورا نہ وصول کرتے تھے؛ بلکہ تھوڑا بہت چھوڑ دیتے تھے۔ گویا ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارا حق کسی پر ہے تو اس کو وصول کرنے میں کچھ چھوڑ دیا جائے، دوسروں کا حق پورا ادا کیا جائے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جب یہ حدیث سنی تو کہا کہ میرے نکاح میں تو عبد الملک بن مروان کی بیٹی ہے، اور میرے لیے تو بادشاہوں کے دروازے کھولے جاتے

---

(۱) رواه الشيخان البخاري: ۲۰۹۳ ومسلم: ۴۲۴۴.

ہیں، تو میں کیسے ان لوگوں میں سے ہوسکوں گا؟ تو پھر انہوں نے یہ اہتمام کیا کہ بال جب تک خشک ہو کر بکھرنے نہ لگتے تھے تب تک وہ تیل استعمال نہیں کرتے تھے؛ تاکہ بکھرے ہوئے بال والی صفت اپنے اندر پائی جائے۔[۱]

اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ نعمت عطا فرمائے، اس کے لیے جن اعمال کا اہتمام کرنا ہے اس کے لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔

(۱) مسند عمر بن عبدالعزیز: ۱/۱۲۲ [۲۴] (ط: مؤسسة علوم القرآن، دمشق).

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ ماعون

(مؤرخہ ۵؍محرم الحرام ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۵؍ستمبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ؕ بسم الله الرحمٰن الرحيم ؕ

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۱﴾ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ﴿۳﴾ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ الَّذِیۡنَ هُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۙ﴿۶﴾ وَ یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ٪﴿۷﴾

وجہ تسمیہ:

یہ سورۃ الماعون ہے۔ اس کا آخری کلمہ الماعون ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام سورۂ الماعون رکھا گیا۔

مکی یا مدنی؟

اکثر حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے؛ لیکن حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ یہ مدنی ہے۔[۱] بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اس کا آدھا حصہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوا۔ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ تک۔ جس میں مشرکین کی حرکتوں اور ان کے کرتوتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ گویا یہی مناسب ہے کہ اس کا نزول مکہ میں ہوا ہو۔ اور باقی آدھا حصہ جس میں منافقین کی حرکتیں اور ان کے کرتوت ذکر کیے گئے ہیں۔ تو یہی مناسب ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں نازل ہوا ہو۔[۲]

شانِ نزول مع اختلافِ روایات:

اوپر والا جو آدھا ہے اس کے شان نزول کے سلسلے میں مختلف روایات ہیں:

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ نے تفسیر فتح العزیز میں لکھا ہے کہ ابوجہل کی عادت تھی کہ جب کسی صاحب مال آدمی کا انتقال ہونے والا ہوتا، تو وہ اس کے پاس جا کر کہتا کہ تم اپنے یتیموں کو میرے حوالے کر دو، میں ان کی کفالت کروں گا اور خبر گیری کروں گا، اور دوسرے ورثاء ان کو نہ ستائیں، ان کا حق ضائع اور برباد نہ کر دیں، میں اس

---

(۱) ابن عطیہ اندلسیؒ ''المحرر الوجیز'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''هي مكية بلا خلاف علمته.'' زجاج ونحاس بھی اس کے مکی ہونے کے قائل ہیں، اور علامہ ابن جوزیؒ نے جمہور سے اس کے مکیہ ہونے اور ابن عباس وقتادہؓ سے اس کے مدنیہ ہونے کی صراحت کی ہے۔

(۲) ابن حزم اندلسیؒ ''الناسخ والمنسوخ'' میں رقم طراز ہیں: اس سورت کا نصف مکی ہے اور نصف مدنی۔ یہ سورت شروع سے وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ تک مکہ مکرمہ میں عاص بن وائل کے باب میں نازل ہوئی۔ اور فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ سے آخر تک مدینہ منورہ میں عبد اللہ بن ابی بن سلول کے باب میں نازل ہوئی۔ ابن سلامہ مقری، زمخشری اور ابن جوزی نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔

کا خیال رکھوں گا۔اس طرح مرنے والے سے ان کے یتیموں کی ذمہ داری خود لیتا تھا اور اس طرح ان کے مال پر قابض بھی ہوتا تھا، اوراس کے بعد ان یتیموں کے حقوق کو ضائع کرتا تھا، ان کو ننگا، بھوکا چھوڑ دیتا تھا۔ایسے یتیموں میں سے ہی ایک یتیم جو اس کا ستایا ہوا تھا، ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، اورآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فریاد کی۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو لے کر ابوجہل کے پاس گئے اوراس کو قیامت کا ڈر بتا کر کہا: ڈر! قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دے گا؟ اس کا حق ادا کر۔تو اس نے کہا کہ قیامت کیا چیز ہے؟ میں کسی قیامت کو مانتا نہیں ہوں۔اس کے اس جواب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دل گرفتہ ہوئے،تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ سورت نازل کی گئی۔[۱]

بعض روایات میں دوسرے کفار کے بھی نام آتے ہیں۔کسی نے عاص بن وائل، کسی نے ولید بن مغیرہ، کسی نے ابوسفیان کا نام بھی لیا ہے۔گویا مشترک طور پر یہ حالت ان لوگوں کی بیان کی گئی ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے، دوبارہ پیدا کیے جانے اوراس کے بعد آدمی کو اس کے اعمال صالحہ کا اچھا بدلہ، اور برے اعمال کی بری سزا ملنے کے قائل نہیں تھے، ایسے لوگوں ہی کا قصہ ہے۔

کیا آپ نے دیکھا......؟؟؟

اس لیے اس کی شروعات اَرَءَيْتَ الَّذِیْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ سے کی گئی۔(کیا آپ نے اسے دیکھا جو جزاء وسزا کو جھٹلاتا ہے؟)لفظ دین کے متعلق سورۂ فاتحہ میں گزرا تھا: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (روزِ جزاء کا مالک) جس دن اللہ تبارک وتعالیٰ نیکوکاروں کو ان کے نیک اعمال

(۱) تفسیر عزیزی: ۶۵۵-۶۵۶ (کتب خانہ فیض ابرار، انکلیشور، گجرات)۔

کا اچھا بدلہ اور گنہگاروں کو ان کے گناہوں کی سزا دیں گے۔تو جزاء وسزا اس دن دی جائے گی،اس لیے اس کو یوم الدین کہا گیا۔تو دین اسی بدلے کو کہا جاتا ہے۔گویا باری تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کیا آپ نے اس آدمی کو دیکھا جو جزاء و سزا کو جھٹلاتا ہے؟یعنی جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے،اوراُس دوسری زندگی میں جن لوگوں نے نیک اعمال کیے تھےان کو نیک اعمال کا اچھابدلہ،اورجن لوگوں نے گناہ کیے تھےان کوگناہوں کی سزادی جائے گی۔

دوبارہ زندگی؛عقلی دلیل:

ہم دنیامیں دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی زندگی بھر اچھےاورنیک اعمال کا اہتمام کرتا ہے لیکن اس کے باوجوداس کی زندگی کے دن تکلیفوں میں گزرتے ہیں،ان نیک اعمال کی وجہ سے اس کو دنیا میں کوئی بھلائی پہنچی ہو،اچھے حالات آئے ہوں ، ایسا نظرنہیں آتا۔اور بسا اوقات دیکھتے ہیں کہ ایک ظالم ہے، بدکار ہے،اپنی بدکاری اور ظلم وزیادتی میں پھل پھول رہاہے،لوگوں کوستا رہا ہے،لوگوں کےساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کرتا ہے،پوری زندگی اسی طرح گزرتی ہے،اور ہمیں کچھ ایسا نظرنہیں آتا کہ اس کو ان برے کاموں کی وجہ سے دنیا میں کوئی تکلیف پہنچی ہو۔تو اگر دوبارہ زندہ ہونے والے نہیں ہیں تو پھر اِن کا کیا؟ باری تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوٗنَ(السجدۃ-۱۸) (جو ایمان والا ہے بھلا وہ فاسق اور بدکار کی طرح ہوسکتا ہے؟ دونوں برابرنہیں ہو سکتے) نیکوکار کو اپنی نیکی کا اور بدکار کو اپنے گناہوں کا بدلہ ملے گا۔نیکوکار کو اچھا بدلہ اور بدکار کو اس کی سزا ضرور ملے گی۔ گویا ایک قدرتی نظام ہے،اس کا تقاضا یہ ہے کہ دوبارہ زندگی ہو،آدمی دوبارہ پیدا

کیا جائے۔ یہ اس کی عقلی دلیل ہے۔

بہر حال! یہاں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب فرماتے ہوئے تسلی دے رہے ہیں کہ کیا آپ نے اس آدمی کو دیکھا جو جزاء وسزا کو جھٹلاتا ہے؟ یعنی آخرت کا قائل نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو آخرت کا قائل نہیں ہے، تو اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ حق داروں کے حق کو ادا کرے گا، فضول ہے۔

آگے اس کی کچھ اور علامتیں اور اس کے کچھ اور کرتوت بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے بتلائے:

إنما يأكلون في بطونهم نارا:

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)

اب دیکھیے! اس آیت میں یتیم کو دھکے دینے کو آخرت کے انکار کرنے والے کی ایک نشانی کے طور پر بتلایا گیا، یہ بتلا کر گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ حرکتیں اصل تو ایسے ہی آدمی کی ہوسکتی ہیں جو آخرت کا قائل نہ ہو، جزاء وسزا کا انکار کرتا ہو۔ اگر کسی مؤمن میں بھی پائی جاتی ہیں، تو اس کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں یہ چیز ہونی نہیں چاہیے۔ یہ حرکتیں اصل تو کافر ہی کی ہونی چاہیے۔ اب یتیموں کے حقوق کو ضائع اور برباد کرنا بھی بڑا خطرناک ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں دستور یہ تھا کہ بچہ اگر نابالغ ہے، تو اس کو اس کا مال نہیں دیتے تھے۔ جو بڑا ہوتا تھا وہی مال لے لیتا تھا۔ ان کے ہاں ایک جملہ تھا کہ جو آدمی گھوڑے پر سوار ہو، ہاتھ میں نیزہ اور تلوار لے، اور دشمن کا مقابلہ کرے وہی اس بات کا حق دار ہے کہ اس کو وراثت اور

مال دیا جائے۔ نابالغ بچے میں اس کام کی طاقت نہیں ہے۔[۱] لہٰذا وہ لوگ اس کا حق مار لیا کرتے تھے۔ قرآن کریم میں اس طرح یتیموں کا مال کھا جانے اور اس کے حق کو مارنے پر بڑی سخت وعیدیں سنائی گئیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا. (النساء:۱۰) (جو لوگ بطور ظلم کے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ ڈال رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کو آگ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بڑا خطرناک عمل ہے۔ اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔

معاشرے کا جائزہ لینا چاہیے:

دیکھیے! ہمیں اپنے معاشرے کا جائزہ لینا چاہیے۔ ہمارے معاشرے میں کوئی کہنے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ میں یتیم کا حق کھاتا ہوں؛ لیکن معاشرہ میں کچھ سلسلے جاری ہیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو فوری طور پر وراثت تقسیم نہیں کی جاتی، بلکہ اگر ان سے کہا بھی جائے کہ بھائی! شریعت کا حکم ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جائے، تو اس کے مال میں وارثوں کے جو حصے رکھے ہیں، اس کے مطابق اس کو فوری طور پر تقسیم کرے کہ ہر ایک حصے دار کو اس کا حصہ، اور حق دار کو اس کا حق پہنچا دو۔

تو لوگ کہتے ہیں کہ مولانا صاحب! ابھی تو کفن بھی میلا نہیں ہوا، اور آپ بانٹنے کی بات کرتے ہیں!!! یہ تو اجنبی پنے کی باتیں ہوئیں، ہم تو آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، ایسی بات کریں گے۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ہی آپس میں جھگڑے شروع ہوتے ہیں۔ ایک کہے گا کہ اس نے زیادہ کھا لیا، دوسرا کہے گا کہ میرے حصہ میں کم آیا۔ یہ اسی کا نتیجہ

---

(۱) تفسیر القرطبي، سورة النساء وسورة الماعون.

ہے۔خاص کر اگر وارثوں میں کوئی صغیر اور نابالغ ہو، جیسے کبھی باپ کا انتقال ہو جاتا ہے، اس کی کئی اولاد میں ایک- دو لڑکے تو بالغ ہوتے ہیں، اور باقی چھوٹے ہیں، تو شریعت نے اس بات کی تاکید فرمائی کہ ہر ایک کے حصے باقاعدہ تقسیم کر کے الگ کر دیے جائیں، اور جو نابالغ کا حصہ ہے اس کے نام سے اس کو محفوظ کر لیا جائے، اس کا ذاتی، ضروری خرچ ہے، وہ اس میں سے لیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ ایک پائی بھی اس میں سے نہیں لی جا سکتی ہے۔

اب ہمارے یہاں تقسیم نہیں کرتے، اس کا حصہ مشترکہ مال میں موجود ہے، اور سب اس کو کھاتے پیتے ہیں۔تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ یتیم کے اپنے خرچ سے زیادہ اس کے مال سے لیا جاتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح لوگ یتیم کے مال کو کھانے کے جرم میں گرفتار ہوتے ہیں، اور کہنے کو یوں کہتے ہیں کہ ہم تو یتیم کا مال نہیں کھاتے۔حالاں کہ یہ وعید ان کو بھی لاگو پڑتی ہے۔

یتیم کے معاملے میں احتیاط:

چناں چہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ اتنے ڈر گئے کہ جن کے ہاں یتیم ہوا کرتا تھا اس کا سب مال الگ کیا، اس کا کھانا پکانا بھی الگ کیا، اپنے ساتھ نہیں؛ تاکہ یتیم کا مال کھانے کی نوبت نہ آئے۔[1] اس کی وجہ سے کچھ دشواریاں پیش آئیں کہ اس یتیم اکیلے کے لیے الگ کھانا پکے، اور گھر کے دوسرے لوگوں کے لیے الگ پکے، اس پر قرآن پاک نے تنبیہ بھی فرما دی: وَاِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ (البقرۃ:۲۲۰) اگر مل جل کر رہتے ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، جو یتیم کے مال کو بگاڑنا چاہتا

---

(۱) تفسیر الطبري و بحر العلوم للسمرقندي و أسباب النزول للواحدي وغيرها.

ہے اور جو اس کو ٹھیک رکھنا چاہتا ہے اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ یعنی جس کے دل میں یتیم کے مال کی حفاظت کی نیت ہے اس کو اللہ خوب جانتا ہے۔ اس لیے اگر مقصد یتیم کے مال کو ضائع ہونے سے بچانا ہے، اور الگ سے پکانے کی صورت میں اس کا خرچ زیادہ ہوگا، تو مال ملانے میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ ایک آدمی کا کھانا الگ سے پکائیں تو خرچ زیادہ ہوگا۔ ہاں! حساب پکا رکھو، تا کہ ضرورت سے زیادہ خرچ اس کے حصے میں نہ ڈالا جائے۔ بہر حال! جب یہ آیت نازل ہوئی تو پھر صحابہؓ نے ان یتیموں کا حصہ ساتھ کیا۔ حاصل یہ ہے کہ شریعت مطہرہ نے یتیم کے معاملے میں بہت تاکید فرمائی ہے۔

بچوں کے ہدایا کا حکم:

عام طور پر بچوں کا ہدیہ بچوں کے نام سے آتا ہے کہ یہ فلاں کے لیے ہے، اب وہ باپ کے پاس ہے، تو باپ، باپ ہونے کے باوجود اس بچے کے مال کو اس کی حقیقی ضرورتوں کے علاوہ میں استعمال نہیں کر سکتا ہے۔ اگر کرے گا، تو وہ زیادتی کرنے والا قرار دیا جائے گا۔ نابالغ کے مال میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے، اس کا خاص لحاظ کرنا چاہیے۔ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ آپ نے اپنے بچے کی نیت سے کپڑے بنوائے، جب اس کو پہنائے تو اس کے ہو گئے، بڑا ہونے کے بعد اسی کے کپڑے جس کا سائز چھوٹا پڑ گیا، اس کو بعد والے بھائیوں کو دے دیتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ اسی نابالغ بچے کی ملکیت ہے، آپ کو اس میں تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر آپ دینا چاہتے ہیں تو اس کی موجودہ حقیقی قیمت تجویز کرو، اتنی قیمت اس کے نام پر الگ جمع کرو، پھر وہ کسی کو دو۔ اسی لیے فقہاء نے احتیاط اسی میں لکھا ہے کہ بچوں کو باقاعدہ مالک قرار نہ دیا جائے، اپنی ملکیت میں رکھتے

ہوئے ان کو پہنایا جائے۔ بہر حال! شریعت نے احتیاط کا پہلو مدنظر رکھا ہے۔ لیکن عام طور پر ہمارے ہاں اس کو نہیں دیکھا جاتا۔ بچوں کے لیے ہدیے، پیسے اور بہت سی چیزیں آتی ہیں، عام طور پر عورتیں ان کے ہدیے کے پیسے خرچ ہی کر ڈالتی ہیں، یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ کل قیامت میں حساب دینے کا وقت آئے گا تو پتا چلے گا۔ بہر حال! یہ نابالغ کا مسئلہ بڑا کٹھن ہے۔ یہ تو مطلق نابالغ کی بات ہوئی۔

یتیم کا مسئلہ سنگین:

اور اگر نابالغ یتیم ہے، جیسے شوہر کا انتقال ہو گیا، چاہے بچے کی ماں ہے؛ لیکن بچہ تو نابالغ ہونے اور باپ کے انتقال ہو جانے کی وجہ سے یتیم ہے۔ اس کا مسئلہ بڑا سنگین ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے) ذرا ہمیں بھی اپنا جائزہ لینے، سوچنے اور دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ہم تو اس وعید میں نہیں آتے ہیں؟ ہر آدمی اپنے آپ کو دیکھ لے، اپنے حالات کا جائزہ لے لے۔

دے دے یا دلا دے:

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. (اور وہ مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا) یعنی کسی غریب کو کھانا کھلانے اور دینے کی ترغیب نہیں دیتا۔ خود تو کیا کھلاتا؟ کسی دوسرے کو بھی یہ نہیں کہتا کہ غریبوں کو کھلاؤ۔ یعنی وہ اس درجہ کا بخیل ہے۔ اگر ایک آدمی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتا تو کوئی حرج نہیں، گنہگار نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسا کوئی موقع ہو کہ مسکین اور غریب بھوک میں مبتلا ہیں، حاجت مند ہیں، تو لوگوں کو ان کو کھلانے کی ترغیب دینی چاہیے۔ مصیبت زدہ کی مصیبت دور کرنے کی ترغیب دینی چاہیے۔

جیسے آج کل کیرالہ کے سیلاب زدگان کا مسئلہ ہے، ان کے لیے خود مدد نہیں کرسکتا تو ترغیب دینی چاہیے۔

......تو ترغیب دینا واجب ہے:

البتہ یہ جانتا ہے کہ میں اس شخص کو ترغیب دوں گا تو اس پر کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے؛ بلکہ الٹا ناراض ہوگا تو اس کو ترغیب دینا ضروری نہیں ہے۔ ایسے لوگ جن سے امید اور توقع ہو ان کو ترغیب دی جاسکتی ہے۔ اور اگر بھوک کی وجہ سے بالکل مرنے کے قریب ہو جائے، تو اگر طاقت ہے تو خود کھلانا ورنہ دوسروں کو ترغیب دینا واجب لکھا ہے۔

بہر حال! جزاء وسزا کا انکار، یتیم کو دھکے دینا اور مسکین کو کھانا کھلانے اور کھانا دینے کی ترغیب نہ دینا، یہ تین باتیں مشرکین کے متعلق بتلائی گئیں۔

نماز سے غفلت؛ تین صورتیں:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ

ویل بڑی خرابی کو کہتے ہیں۔ عذاب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس سورت کے آخری حصے میں جو برائیاں بتلائی گئی ہیں وہ منافقین میں تھیں، اور مکی دور میں منافقین نہیں تھے، بلکہ مدنی دور میں منافقین وجود میں آئے ہیں، اس لیے بہت سے اہل علم یوں کہتے ہیں کہ یہ آخری حصہ مدینہ میں نازل ہوا۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (پھر بڑی خرابی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت سے برتتے ہیں)۔

نماز سے غفلت برتنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً: بہت سے منافقین وہ تھے

کہ کوئی دیکھ رہا ہوتو نماز پڑھتے تھے، کوئی نہ دیکھ رہا ہو، تنہائی میں ہوں تو چھوڑ دیتے تھے، آج مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ ہیں کہ لوگوں کو معلوم ہورہا ہے تو نماز پڑھیں گے تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ نماز نہیں پڑھتا۔ اور تنہا ہوں، جہاں کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو تو نماز چھوڑ دیتے ہیں۔

نماز کے معاملے میں غفلت سے کام لیتے ہیں، مثلاً: آگے پیچھے کر دیتے ہیں، وقت کی رعایت نہیں کرتے، کبھی وقت میں پڑھی، کبھی اس کو چھوڑ بھی دی۔

بے توجہی:

یا جیسی توجہ، دھیان اور جی لگا کر پڑھنی چاہیے ویسی نہیں پڑھتے ہیں۔ یہ سب نماز سے غفلت میں داخل ہے۔ یا جیسے اس کے فرائض، واجبات، مستحبات، سنن کو ادا کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ وقت ملتا ہے تو پڑھتے ہیں، دنیوی کام کاج آ گیا تو نہیں پڑھتے، وہ بھی اس میں داخل ہے۔ یہ باتیں جو بیان کی گئی ہیں اصل میں وہ تو منافقین کی حرکتیں ہیں؛ لیکن ان کو بیان کرکے مؤمنین کو بھی متنبہ کیا جارہا ہے کہ یہ منافقین کے کام ہیں، اپنے آپ کو ان سے بچاؤ۔ تاکہ کہیں تم پر یہ لیبل نہ لگ جائے۔

اَلَّذِیۡنَ ھُمۡ یُرَآءُوۡنَ (جو دکھاوا کرتے ہیں، دکھلانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں)

بہت سے وہ ہوتے ہیں کہ کوئی دیکھ رہا ہو تو پڑھ رہے ہیں، ورنہ نہیں پڑھتے۔ یا دیکھ رہا ہو تو ذرا اچھی طرح پڑھتے ہیں، اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو ایسے ہی مرغ کی طرح ٹھونگیں مار کر جلدی جلدی پوری کر دیتے ہیں۔

یہ ایک قدم آگے نکل گیا:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں کہ یہ ریاکار بعض چیزوں میں

شرک سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ریا کار انسانوں کو یعنی جن کو دکھلانے کے لیے یہ عمل کر رہا ہے ان کو اللہ کے مقابلے میں ترجیح دے رہا ہے۔ وہ تو جانتا ہے کہ اللہ بھی دیکھ رہے ہیں، تو یہ اللہ کی خاطر عمل نہیں کرتا؛ بلکہ انسانوں کے دکھلانے کے لیے کرتا ہے۔ تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں انسانوں کو عظمت دیتا ہے۔ مشرکین تو شریک کرتے ہیں، یہ تو ایک قدم آگے نکلا۔ پھر یہ کہ شرک کرنے والے اپنی دنیوی ضرورتوں کے معاملے میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں، جیسے کسی کے پاس اولاد مانگی، کسی سے روزی کا سوال کیا؛ لیکن یہ تو خالص عبادت؛ نماز، جو اللہ کے لیے پڑھی جانی چاہیے، وہ دوسروں کو دکھلاتا ہے تو یہ ایک قدم آگے نکل گیا۔ الحاصل شاہ عبد العزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ دکھلاوے والا شرک بہت خطرناک ہے۔[۱]

ماعون سے مراد:

وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ. (اور دوسروں کو معمولی چیز دینے سے بھی انکار کرتے ہیں)

ایک تو جتنے بھی اعمال خیر کرتے ہیں، دکھلانے کے لیے کرتے ہیں، یہ منافقین کی خاصیت ہے۔ اور دوسرا ماعون سے بھی انکار کرتے ہیں۔

ماعون کا کیا مطلب؟ اس سلسلے میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، ابن عمر اور حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ یہاں ماعون سے زکوٰۃ مراد ہے۔[۲] یعنی وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ اصل ماعون تو تھوڑی سی چیز کو کہتے ہیں۔ چوں کہ مال میں فرض زکوٰۃ مال کا چالیسواں حصہ ہے، (ڈھائی فی صد) تو ڈھائی فی صد کوئی بڑی چیز نہیں ہے، معمولی چیز ہے۔ لیکن یہ ڈھائی

---

(۱) تفسیر عزیزی: ۶۵۸-۶۵۹ (کتب خانۂ فیض ابرار، انکلیشور، گجرات)

(۲) تفسیر الطبري وتفسیر القرطبي.

فی صد ہونے کے باوجود بہت سے لوگ اس کو ادا نہیں کرتے۔ گویا یہ منافقین زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ ان پر دوسرے حقوق ہیں جن کے طلب کرنے والے بندوں میں سے ہیں ان کے حقوق تو ان بندوں کے ڈر سے ادا کرتے ہیں، اس لیے کہ اگر ادا نہیں کریں گے، تو لوگوں میں ہماری رسوائی ہوگی، وہ ہمارا (ہائے ہو) کریں گے، یا حاکم کے ہاں نالش کر دیں گے، اس کی وجہ سے لوگوں میں ہمارا نام بدنام ہوگا؛ لیکن زکوٰۃ نہیں دیتے تو کس کو پتا چلتا ہے؟ وہ اللہ سے نہیں ڈرتے اس لیے زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ بہر حال! حضرت عبداللہ بن عباسؓ (کی ایک روایت میں) حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے نزدیک ماعون سے زکوٰۃ مراد ہے۔

دوسرا مطلب:

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی دوسری روایت میں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ماعون سے وہ معمولی چیز مراد ہے جس کے آپس میں استعمال کے لیے، عاریۃ کے طور پر لوگوں میں لینے دینے کا دستور ہوتا ہے۔[۱] جیسے آپ کے ہاں مہمان زیادہ آگئے، ضرورت پیش آگئی، آپ کے ہاں کوئی بڑا پتیلا نہیں ہے۔ پڑوسی کے پاس گئے کہ آج ہمارے ہاں آٹھ دس مہمان ہو گئے ہیں، تمہارا بڑا پتیلا دے دو۔ تو دیتے ہیں۔ یا دیگر استعمال کی چیزیں، ڈول، آگ، پانی، نمک وغیرہ۔ اُس زمانے میں عام طور پر ایسا ہوتا تھا۔ تو ان چیزوں کا پڑوسیوں میں عاریت کے طور لینے دینے کا رواج ہے، یہ لوگ بخل کی وجہ سے وہ بھی نہیں دیتے۔ اور اہل حرفت، اہل صنعت، پیشہ ور لوگوں کے آپس کے اوزار بھی اس میں آجاتے ہیں۔ ایک الیکٹریشین ہے، دوسرے الیکٹریشین کو کسی اوزار کی ضرورت پیش آئی تو وہ آپس میں دیتے ہیں؛ لیکن اگر کوئی نہ دے تو اسی ماعون کا مصداق بنے گا۔ یا

---

(۱) تفسير الطبري وتفسير القرطبي.

ایک پلمبر دوسرے پلمبر کو کسی اوزار کی ضرورت پڑے، تو اس کو اپنے اوزار دیتا ہے؛ لیکن اگر کوئی نہ دے تو وہ اسی ماعون میں داخل ہو جائے گا۔ یا اہل علم ہے، تو وہ آپس میں قلم، کاغذ وغیرہ اشیاء کی آپس میں لین دین کرتے ہیں۔ اور کوئی ہونے کے باوجود نہ دے، تو یہ بھی اسی ماعون میں داخل ہوگا۔ کیوں کہ عام طور پر ایسی چیز سے منع نہیں کیا جاتا۔

بہرحال! اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ کفار اور منافقین کی چیزوں سے اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچانے کا اہتمام کریں۔ تاکہ ان کے حق میں جو وعیدیں آئی ہیں، ان کا مصداق بننے کی نوبت نہ آئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ان چیزوں کا اہتمام نصیب فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ قریش

(مؤرخہ: ۲۶ر محرم الحرام ۱۴۴۰ھ مطابق ۷ر اکتوبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۝

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۝۱ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ ۝۲ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ۝۳ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ۝۴

قریش کون ہیں......؟؟؟

یہ سورۂ قریش ہے بقول جمہور مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اور بقول ضحاک وکلبی مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔

قریش، عرب کے ایک بڑے قبیلے کا نام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق اسی قبیلے سے

ہے۔حضور اکرم ﷺ کا نسب مبارک اس طرح ہے: محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف بن قصي بن كلاب بن مرة بن كعب بن لؤي بن غالب بن فهر بن مالك بن نضر بن كنانة. نضر بن کنانہ تیرھویں پشت پر نبیٔ اکرم ﷺ کے جد اعلیٰ ہیں، ان کی اولاد قریش کہلاتی ہے۔حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں کنانہ کو منتخب فرمایا، اور ان کی اولاد میں قریش کو، اور قریش میں بنو ہاشم کو، اور بنو ہاشم میں مجھے یعنی نبی کریم ﷺ کو منتخب فرمایا۔[1]

نضر بن کنانہ- جو نبی کریم ﷺ کے تیرھویں نمبر کے جد اعلیٰ ہیں- کی اولاد کو قریش کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ حرم کے باہر بھی پھیلے ہوئے اور منتشر تھے۔تو نبی کریم ﷺ کے پانچویں جد اعلیٰ قصی بن کلاب نے جو قریش حرم سے باہر منتشر تھے ان کو جمع کر کے حرم میں آباد کیا کہ آپ لوگ حرم ہی میں آباد رہو، حرم سے باہر نہیں۔اسی لیے ان قصی کو مُجَمِّع کہا جاتا ہے۔اور گویا یہی قریش کو حرم میں لا کر آباد کرنے والے ہوئے۔اس کے بعد سے قریش کے تمام قبائل حرم ہی میں آباد تھے۔

قریش کی وجہ تسمیہ:

قریش کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ تو منتشر تھے، ان کو پھر حرم میں لا کر جمع کیا اور آباد کیا، علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں تَقَرُّش منتشر لوگوں کے اکٹھا ہو جانے کو کہتے ہیں، تو چوں کہ یہ منتشر تھے، اور حضرت قصی بن کلاب کی کوششوں سے پھر حرم میں مجتمع ہوئے، اور وہیں آباد ہوئے اس اعتبار سے قریش کہا جاتا ہے۔[2]

---

(۱) صحيح مسلم: ۲۲۷۶.

(۲) تفسير القرطبي، سورة قريش.

اور دوسری وجہ تسمیہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ نے تفسیر فتح العزیز میں بیان کی ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے بھی منقول ہے، فرماتے ہیں کہ قریش ایک سمندری جانور کا نام ہے، جو تمام جانوروں پر غالب آتا ہے، تو یہ قبیلہ بھی اپنی فصاحت و بلاغت اور شجاعت وسخاوت کی وجہ سے عرب کے تمام قبائل پر غالب تھا، اس لیے اس کو قریش نام دیا گیا۔[۱] قریش کی یہ دو وجہ تسمیہ زیادہ مشہور ہیں، اور بھی اس سلسلے میں کچھ باتیں کہی گئی ہیں۔

بہر حال! قریش ہی کے ان تمام قبائل کی شاخیں حرم ہی میں کعبۃ اللہ کے آس پاس آباد تھیں، ان ہی کے نام پر اس سورت کو نام دیا گیا ہے۔

وادیِ غیر ذی زرع میں آباد قوم:

یہ سب مکہ مکرمہ میں حرم میں آباد تھے، اور حرم، مکہ مکرمہ ایک ایسی وادی ہے- وادی پہاڑوں کے درمیان کے ہموار علاقے کو کہتے ہیں، جس کو گجراتی میں ખીણ کہا جاتا ہے- جہاں معیشت کا کوئی سبب موجود نہ تھا، نہ کھیتی باڑی، نہ باغات، نہ ہی کوئی صنعت۔ ایسی جگہوں پر عموماً لوگ آباد نہیں ہوتے، بلکہ لوگ ایسی جگہوں پر آباد ہوتے ہیں، جہاں معیشت کے اسباب میسر ہوں، جن کے ذریعے وہ اپنا گذر بسر اطمینان وسکون کے ساتھ کر سکیں؛ لیکن مکہ ایک وادیِ غیر ذی زرع تھی۔

قرآن پاک میں وہ دعا موجود ہے، جو سیدنا حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی بیوی حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیلؑ کو وادیِ غیر ذی

---

(۱) تفسیر القرطبي وتفسیر عزیزي وغیرهما.

زرع میں چھوڑتے وقت کی تھی: رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ۔(ابرھیم:۳۷) (اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو ایک ایسی وادی میں، جہاں کوئی کھیتی نہیں ہوتی ہے، ٹھہرایا ہے تیرے حرمت والے گھر کے پاس، مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ نماز کو قائم کریں۔ اور اے اللہ! لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرمادے، اور ان کو پھلوں سے روزی عطا فرما) ان ہی کی اس دعا کی برکت ہے کہ وہاں خود کوئی پیداوار نہ ہونے کے باوجود ساری دنیا کے پھل آتے ہیں، اور لوگ اطمینان اور سکون کے ساتھ ان کو استعمال کرتے ہیں۔

اہلِ مکہ پر بہت بڑا انعام:

ایک اور موقع پر حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے دعا کی تھی: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ۔(البقرۃ-۱۲۶) (اے اللہ! اس مکہ مکرمہ کو امن والا شہر بنا، اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما) عرب قبائل میں آپسی عداوتیں، دشمنیاں ہوا کرتی تھیں، اور اس علاقے میں کوئی ذریعۂ معیشت نہ ہونے کی وجہ سے ان میں غربت اور افلاس تھا، جس کے نتیجے میں وہ آپس میں لوٹ مار کرتے تھے، عداوتوں کی بنا پر ایک دوسرے کا قتل کرتے تھے، نہ جان محفوظ، نہ مال محفوظ، نہ عزت وآبرو محفوظ تھی؛ لیکن حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کی اس دعا کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو امن والا شہر بنایا کہ وہاں کوئی کسی کو چھیڑتا نہیں تھا۔ سب کی جان، مال اور عزت وآبرو بھی محفوظ تھی۔ یہاں تک کہ حرم اور کعبۃ اللہ کی برکت سے شکار کے جانور تک وہاں محفوظ رہتے

تھے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا اہل مکہ پر ایک بہت بڑا انعام تھا۔

تجارت کے دو سفر:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے پہلے قریش کا جو قبیلہ وہاں آباد تھا، ان کے لیے ایسی جگہ میں جہاں بظاہر معیشت کا کوئی سامان نہیں تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے لیے ایک سبب یہ پیدا فرما دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پردادا، حضرت عبد المطلب کے والد، ہاشم نے باقاعدہ تجارتی اسفار کا سلسلہ شروع کیا، وہ لوگوں کا مال لے کر سفر کرتے تھے۔ اور قریش کے تمام قبائل، شاخوں میں سے ہر ایک کا مال مضاربت کے طور پر لے کر جاتے تھے، تجارت کے ذریعے کمائی حاصل کرتے تھے، اور سب کو ان کے حصے کے مطابق پہنچاتے تھے جس کی وجہ سے سب لوگ بڑے اطمینان اور سکون سے اپنی زندگیاں گزارتے تھے۔

اور یہ تجارت کے سفر دو ہوتے تھے: (۱) گرمی کے زمانے میں شام کا تجارتی سفر کرتے تھے؛ شام کا علاقہ ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے۔ وہاں کی چیزیں مکہ مکرمہ میں لاتے تھے اور مکہ میں بیت اللہ کی زیارت کے لیے، حج وعمرہ کے لیے آنے والے لوگ وہ چیزیں ان سے خریدتے تھے اس طرح ان کی تجارت ہوا کرتی تھی۔ (۲) سردی کے زمانے میں ان کا دوسرا تجارتی سفر یمن کی طرف ہوتا تھا؛ یمن گرم علاقہ ہے، تو وہاں کم سردی ہوتی تھی، لہٰذا وہ سردی کے زمانے میں آب وہوا کے اعتبار سے زیادہ موافق رہتا تھا۔

تو یہ لوگ تجارت کی غرض سے یہ دو بڑے سفر کرتے تھے۔ اور اس کے عادی تھے۔ عادی ہونے کی وجہ سے اتنے طویل طویل سفر بھی ان کے لیے کوئی دشوار اور مشکل نہیں تھے۔ جب مشکل چیز کا بھی آدمی عادی بن جاتا ہے، تو اس کے لیے عادت کی وجہ سے وہ چیز آسان

ہوجاتی ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ان کے اوپر ایک انعام تھا کہ ذریعۂ معاش کے طور پر انہوں نے تجارت کو اختیار کیا تھا، اور دونوں موسموں میں الگ الگ جگہ کا تجارتی سفر کرتے تھے، اور اس کی عادت ہونے کی وجہ سے ان کے لیے یہ تجارتی اسفار طویل ہونے کے باوجود بڑے آسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس انعام کا اس سورت میں تذکرہ فرمایا ہے۔

حرم کی نسبت پر امن وامان:

دوسری بات یہ ہے کہ پورا علاقہ بالخصوص حجاز وغیرہ کا علاقہ جہاں نبِی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش ہوئی، وہاں مستقل کبھی کوئی حکومت قائم نہیں رہی، اور عام طور پر امن وامان قائم کرنا قانون کو جاری کرنا یہ حکومتوں کا کام ہوا کرتا ہے۔ اور وہاں آج تک ایسی کوئی معقول حکومت نہیں تھی جو قانون کو جاری کرتی اور امن وامان قائم کرتی۔ جس کی وجہ سے آپس میں بہت کچھ قتل وغارت اور لوٹ مار ہوتی تھی؛ لیکن اس کے باوجود قریش چوں کہ اللہ کے گھر کے متولی اور نگہبان تھے، اس بیت اللہ کی نسبت کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوگوں کے قلوب میں محبت ڈالی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اتنے طویل سفر میں وہ تجارت کے بڑے بڑے قافلے لے کر جاتے تھے۔

قافلے کی لمبائی کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کی ماتحتی میں جانے والے قریش کے جس قافلے کا تعاقب کیا تھا، اس میں سامان سے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹ تھے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک۔ ایک ہزار اونٹوں کا قافلہ سامان سے لدا ہوا!!! اور لے جانے والے چالیس پچاس آدمی!!! گویا ایسے بدامنی کے ماحول میں بھی یہ لوگ اس طرح جاتے تھے کہ ان کی جان ومال پر حرم

کی نسبت کی وجہ سے کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔ اتنے طویل اسفار میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مال وجان کی حفاظت حاصل تھی۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام تھا، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انہیں دیا گیا تھا۔ نیز ان تجارتی اسفار کے نتیجے میں ان کو کھانے پینے اور معیشت کے اسباب بآسانی میسر تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں تھیں جن نعمتوں کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس سورت میں بیان کیا ہے، کہ اس گھر کے مالک یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے امن دیا، یعنی ساری دنیا تو ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ قرآن پاک میں سورۂ عنکبوت میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ حَوۡلِهِمۡ. (العنکبوت-٦٧) (کیا یہ لوگ اس بات کو دیکھتے نہیں کہ ہم نے حرم کو امن والی جگہ بنایا جہاں یہ لوگ پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں؟ حالاں کہ اس کے آس پاس کا جو علاقہ ہے وہاں سے لوگ اچک لیے جاتے ہیں) یعنی وہاں ان کی جانیں محفوظ نہیں ہیں، لیکن حرم کی نسبت پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو یہ امن وامان اور سکون عطا فرمایا ہے۔ تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ذکر کیا ہے۔

تین احسانات:

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اپنے تین احسانات گنوائے ہیں۔ (۱) سردی اور گرمی دونوں موسموں میں تجارت کے طویل طویل دو سفر امن وسکون کے ساتھ کرنا، کوئی ان کے مال کو چھیڑتا نہیں تھا۔ (۲) ایک وادئ غیر ذی زرع میں آباد ہونے کے باوجود کھانے پینے کی چیزیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کثیر مقدار میں دوسری جگہوں سے وہاں پہنچائی

جاتی تھیں۔(۳) کوئی امن قائم کرنے والی حکومت موجود نہ ہونے کے باوجود وہاں ہر طرح کا امن وامان تھا۔ان احسانات کو گنوا کر اللہ تبارک وتعالیٰ ان لوگوں کو متوجہ کر رہے ہیں کہ جس اللہ نے تم کو ان نعمتوں سے نوازا ہے؛ چاہیے تو یہ تھا کہ تم بتوں کی پوجا کرنے کے بجائے اس گھر کے مالک یعنی اللہ کی عبادت کرتے۔

ایک سبق:

اس میں ہمارے لیے سبق یہ ہے کہ دین کی نسبت پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اگر کسی کو دنیوی نعمتوں سے نوازا ہو، یا اعزاز واکرام کی شکلیں عطا فرمائی ہوں تو اس کا شکر یہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت اور فرماں برداری میں زیادہ اہتمام کیا جائے۔بخاری شریف میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تہجد کی نماز میں اتنا طویل قیام فرماتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاؤں مبارک پر ورم آجاتا تھا۔صحابہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کی تو اگلی پچھلی خطائیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے معاف کر دی ہیں۔لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ.(الفتح-۲) اس کے باوجود آپ اتنی مشقتیں اٹھاتے ہیں؟ طویل طویل عبادتیں کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں پاؤں پر ورم آجاتا ہے؟ اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: أفلا أكون عبداً شكوراً؟ (کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟)[1] یعنی جب اللہ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، تو اب اس کی شکر گزاری یہ ہے کہ میں اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری میں اور زیادہ اہتمام کا لحاظ کروں۔تو اس میں ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ دین کی نسبت پر اللہ کی طرف سے جو نعمتیں دی جاتی ہیں ان کا حق یہ ہے کہ آدمی اللہ

---

(۱) صحيح البخاري: ۱۱۳۰ و ۴۸۳۶ و ۴۸۳۷ و ۶۴۷۱.

تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری میں مزید اہتمام کرے۔نہ یہ کہ اللہ کی طرف سے غفلت کا معاملہ برتتے۔اسی کو اس سورت میں بتایا گیا ہے۔

ترجمہ:

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ

ایلٰف: عادی ہونا، مانوس ہونا، کسی چیز کے ساتھ طبعی طور پر مناسبت ہونا۔ چوں کہ قریش کے لوگ عادی ہیں۔

اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۚ

وہ سردی اور گرمی کے موسموں میں سفر کرنے کے عادی ہیں (سردی میں یمن کی طرف اورگرمی میں شام کی طرف)

فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۔

اس لیے ان کو چاہیے کہ وہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں۔(کون اس گھر کا مالک؟)

الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ۵ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ

جس نے بھوک کی حالت میں ان کو کھانا دیا اور بدامنی سے انہیں محفوظ رکھا۔

جب اللہ تعالیٰ کے یہ انعامات تم پر ہیں، لہٰذا تم کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کرنا چاہیے، اوراس کے علاوہ کسی اور کو ماننا نہیں چاہیے۔اس سورت میں یہ سبق دیا گیا ہے۔

دوسرا سبق:

اس سورت میں ایک سبق اور بھی ہے کہ جہاں لوگوں کی معاشی ضرورتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری کی جاتی ہوں، اور جہاں وہ رہتے ہیں وہاں امن وامان کی فضا ہو، تو یہ دو

اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں، ان کی قدر کرنی چاہیے۔ جس علاقے میں آپ رہتے ہیں وہاں آپ کے لیے اسباب معاش آسانی کے ساتھ میسر ہیں، آپ اپنا گذر بسر اطمینان کے ساتھ کر لیتے ہیں، اور وہاں کوئی خوف او ڈر بھی نہیں ہے، امن و امان کی فضا ہے تو یہ دو ایسی بڑی نعمتیں ہیں کہ دنیا کی کوئی دوسری نعمت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ان نعمتوں کی قدردانی کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ فیل

(مؤرخہ ۱۱؍صفر المظفر ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۰؍اکتوبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم۝

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ ۝۱ اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِيۡ تَضۡلِيۡلٍ ۝۲ وَّ اَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ ۝۳ تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ ۝۵

وجہ تسمیہ:

یہ سورۂ فیل ہے۔ فیل عربی زبان میں ہاتھی کو کہا جاتا ہے۔ یہ اصل میں فارسی زبان میں لفظ پیل تھا، اوراسی کو عربی میں منتقل کیا گیا، تو ’’پ‘‘ کو ’’ف‘‘ سے بدل کر فیل ہو گیا۔ اہل

عرب بھی ہاتھی کو فیل ہی کہتے ہیں۔ اس سورت میں بھی ہاتھی والوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس لیے اس کا نام سورۂ فیل ہے۔

عام الفیل:

اس سورت میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے پہلے پیش آیا۔ ربیع الاول ۵۷۰ء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی۔ اور یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے ۵۰ یا ۵۵ /دن پہلے محرم میں پیش آیا۔ اسی لیے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کا تذکرہ کیا جاتا ہے، وہاں مؤرخین لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت عام الفیل میں ہوئی۔

واقعۂ فیل:

واقعہ یہ ہے کہ یمن میں پہلے شاہان حُمیَر کی حکومت تھی۔ ان کا سب سے آخری بادشاہ ذونَواس تھا۔ یہ لوگ بت پرست تھے، اس زمانے میں یمن ہی میں کچھ لوگ نصرانی بھی تھے، حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان رکھنے والے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے والے تھے۔ یہ بادشاہ بت پرست تھا، لہٰذا اس نے اہل ایمان پر بڑے مظالم ڈھائے۔ اس نے ایک بہت بڑی، لمبی چوڑی خندق کھدوائی اور اس کو آگ سے بھر دیا، اور اس میں تقریباً بیس ہزار (۲۰۰۰۰) ان عیسائیوں کو- جو خدائے واحد کی عبادت کرنے والے تھے- ڈال کر ختم کر دیا۔ یہ اصحاب اخدود کا واقعہ ہے، جو قرآن کریم میں، سورۂ بروج میں ہے۔ اس میں سے دو آدمی کسی طرح بھاگ کر نکل گئے اور ملک شام پہنچے۔ وہاں قیصر روم کی حکومت تھی، اس حکومت سے انہوں نے ذونواس- جو شاہان حمیر میں سے ہے- کی شکایت

کی کہ اس نے نصاریٰ (خدائے واحد کی عبادت کرنے والوں) پر مظالم ڈھائے ہیں۔تو اس سے انتقام لیا جائے۔

یمن میں شاہِ حبشہ کی حکومت:

قیصر کے پاس جب شکایت پہنچی،تو قیصر نے حبشہ کے بادشاہ کو خط لکھا،وہ بھی نصرانی تھا اور یہ واقعہ چوں کہ یمن میں پیش آیا تھا،اور یمن حبشہ سے قریب ہے۔(بحر احمر کے شمال میں یمن ہے،جنوب میں براعظم افریقہ ہے،اور وہیں حبشہ (ایتھوپیا) واقع ہے)الغرض قیصر روم نے حبشہ کے بادشاہ کو خط لکھا کہ تم اُس سے انتقام لو۔چناں چہ اس نے ایک عظیم الشان فوج اپنے دو کمانڈروں ارباط اور ابرہہ کی ماتحتی میں یمن بھیجی۔اور انہوں نے ایسا زوردار حملہ کیا کہ یمن کو ذونواس کی حکومت اور اس کے مظالم سے نجات دلائی۔ذونواس تو بھاگ گیا اور سمندر میں ڈوب گیا اور اس کی موت واقع ہوئی۔اور اب یمن میں شاہِ حبشہ کا جو لشکر آیا تھا اس کی حکومت قائم ہوئی۔

کنیسہ کی تعمیر:

بعد میں ان دونوں کمانڈروں میں بھی ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے لیے آپس میں مقابلہ ہوا،اس میں ابرہہ دوسرے پر غالب آیا،اور شاہِ حبشہ نے پھر اسی کو یمن میں اپنا گورنر مقرر کیا۔اس طرح شاہ حبشہ کا تسلط یمن میں ہوا۔ابرہہ چوں کہ نصرانی مذہب کا ماننے والا تھا اور بڑا پر جوش تھا،تو اس نے سوچا کہ میں ایک بہت بڑا کنیسہ تعمیر کروں۔چناں چہ اپنی اس سوچ کے مطابق اس نے قُلَّیس نام کا ایک بڑا کنیسہ تعمیر کروایا۔اس کی اونچائی اتنی تھی کہ اگر کوئی آدمی اس کے نیچے کھڑا رہ کر دیکھے تو اس کی اونچائی تک اس کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی

تھی۔ اور اس کو سونے، چاندی اور جواہرات سے مرصع کیا، اور بہت شاندار بنایا۔ اور بنانے کے بعد اس نے لوگوں میں اعلان کیا کہ تم لوگ مکہ مکرمہ میں کعبہ کی زیارت اور حج کے لیے جاتے ہو، تو وہاں جانے کے بجائے یہاں آکر عبادت کیا کرو۔

ابرہہ کی قسم:

یمن کے عربوں میں اگرچہ بت پرستی رائج ہو چکی تھی؛ لیکن دین ابراہیمی اور اسی طرح کعبۃ اللہ کی محبت ان کے مزاجوں میں پیوست تھی، تو یہ اعلان ان کو بہت گراں گزرا، اور ان تمام قبائل میں جو عرب تھے: عدنان، قحطان، قریش تمام میں غم و غصہ کی ایک لہر پھیل گئی۔ اور وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ چناں چہ ان میں سے ایک آدمی اس کنیسہ میں جاکر پاخانہ کر کے آگیا۔ اور جب ابرہہ کو پتا چلا تو اس کو بہت غصہ آیا۔ اور ایک قافلہ اس کنیسہ کے قریب ٹھہرا ہوا تھا، اس نے اپنی ضرورت کے لیے آگ جلائی تھی، پھر وہاں سے اس آگ کو جلتا ہوا چھوڑ کر روانہ ہو گیا، تو وہ آگ پھیلی اور کنیسہ کے کچھ حصے کو بھی جلا دیا، اور نقصان پہنچایا، تو ابرہہ کو اور زیادہ غصہ آیا۔ اور اس نے قسم کھائی کہ جس کعبہ کے خاطر انہوں نے میرے کلیسا کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔

کعبۃ اللہ کو ڈھانے کی پلاننگ:

چناں چہ اس نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا اور کعبہ پر حملہ کرنے کے لیے پہلے تو اس نے شاہِ حبشہ سے اجازت مانگی۔ تو شاہِ حبشہ نے صرف اجازت ہی نہیں دی؛ بلکہ اپنا ایک عظیم الشان اور بے نظیر ہاتھی، جس کا نام محمود تھا، وہ بھیجا کہ اس پر بیٹھ کر حملہ کرو، اور اس کے علاوہ بھی آٹھ بڑے بڑے ہاتھی بھیجے؛ تاکہ ان کے ذریعے کعبۃ اللہ کی عمارت کو ختم کرنے

میں مدد لی جاسکے۔ تجویز یہ تھی کہ کعبۃ اللہ کی عمارت جن ستونوں پر قائم ہے ان ستونوں کو لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر ان زنجیروں کو ان ہاتھیوں کی گردنوں میں ڈالا جائے اور چلایا جائے؛ تاکہ پورا کعبہ -نعوذ باللہ- اکھڑ کر ختم ہوجائے۔ بہر حال! ساٹھ ہزار (۶۰۰۰۰) کی فوج اور ان ہاتھیوں کو لے کر کعبۃ اللہ کو ڈھانے کے لیے ابرہہ روانہ ہوا۔

درمیانی طاقتوں سے مقابلہ:

چوں کہ خود یمن میں بھی عرب آباد تھے، جن کے دلوں میں کعبۃ اللہ کی محبت پیوست تھی، وہ سب اس کے مقابلے کے لیے جمع ہوئے۔ اور ذونفر نامی ایک آدمی کی ماتحتی میں وہ ابرہہ کے لشکر کے مقابلے پر آئے؛ لیکن اس کو شکست ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ یہ آگے بڑھے، اور اس پر اللہ کا عذاب آئے۔ شکست ہوئی تو ابرہہ نے ذونفر کو قید کرلیا۔ ارادہ تو قتل کا تھا؛ لیکن اس نے کہا: مجھے قتل مت کرو، ہوسکتا ہے تمہارے کام آؤں۔ تو اس نے زنجیروں میں قید کرکے اپنے ساتھ رکھا۔ پھر آگے بڑھا اور قبیلۂ خَشعم کے علاقے سے جب گزر ہوا تو قبیلۂ خَشعم کے سردار نُفیل بن حبیب نے بھی اپنے قبیلے کی دونوں شاخوں کے نوجوان لڑاکوؤں کے ذریعے اس کا مقابلہ کیا؛ لیکن ان کو بھی شکست ہوئی۔ اور نفیل بن حبیب کو بھی ابرہہ نے قید کرکے اپنے ساتھ لے لیا۔

اہلِ طائف کی رہنمائی:

اب یہ لشکر آگے بڑھا اور جب طائف کے پاس پہنچا تو طائف والوں کو پہلے سے ہی معلوم ہوچکا تھا کہ اس کے مقابلے میں جو لوگ آئے ہیں، انہوں نے شکست کھائی ہے۔ تو انہوں نے اپنی خیر اسی میں سمجھی کہ مقابلے پر نہ آئیں۔ اس لیے کہ طائف والوں کا بت

لات تھا، وہ اس کی پوجا کرتے تھے، اور انہوں نے اس کی ایک مستقل عبادت گاہ بنا رکھی تھی، ان کو یہ ڈر تھا کہ اگر ہم مقابلے پر آئیں گے، تو ہمارے لات کی عبادت گاہ کو ابرہہ اجاڑ دے گا۔ تو انہوں نے مقابلے کے بجائے اس کے ساتھ مقابلہ نہ کرنا طے کیا؛ بلکہ جب وہ ان کے قریب سے گزرا تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہارا مقابلہ نہیں کریں گے؛ بلکہ تمہارا تعاون کریں گے۔ ہم اپنے ایک سردار ابورغال کو تمہارے ساتھ بھیجتے ہیں تاکہ وہ راستہ بھی بتلائے۔ چناں چہ اس کو بھیجا۔ پھر اسی کی رہنمائی میں یہ لوگ آگے بڑھے۔

اونٹوں پر قبضہ:

پھر مکہ کے قریب مُغَمَّس نامی مقام پر ابرہہ نے پڑاؤ ڈالا۔ وہاں لشکر ٹھہرا ہوا تھا اور وہیں قریب میں مکہ والوں کے اونٹ چرا کرتے تھے، تو لشکر نے مکہ والوں کے تمام اونٹوں پر قبضہ کیا۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا حضرت عبد المطلب کے دوسو (۲۰۰) اونٹ بھی تھے۔ ان سب اونٹوں پر انہوں نے قبضہ کیا۔ اس کے بعد قبیلۂ حمیر کا حناطہ نامی ایک آدمی اس کے ساتھ تھا، اس کے ساتھ ابرہہ نے مکہ والوں کو پیغام بھیجا کہ دیکھو! میں تو کعبہ کی عمارت کو ختم کرنے کے لیے آیا ہوں، اگر تم میرا مقابلہ نہیں کروگے، تو میں تم کو نہیں چھیڑوں گا، کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ چناں چہ جب وہ یہ پیغام لے کر مکہ مکرمہ لوگوں کے پاس پہنچا، تو مکہ والوں نے کہا کہ سردار عبد المطلب ہیں، ان سے ملو۔

وہ آپ کو نہیں چھوڑے گا:

جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبد المطلب سے ملا، تو عبد المطلب نے کہا کہ بھائی! یہ تو اللہ کا گھر ہے، جس کا گھر ہے وہ اس کی حفاظت کرے گا۔ اللہ اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ تم اس کو

میری بات پہنچادو۔ تو حناطہ نے کہا کہ میں آپ کی اس کے ساتھ ملاقات کروادیتا ہوں، آپ خود اس سے بات کر لیجیے۔ چناں چہ جب حناطہ عبد المطلب کو ابرہہ کے پاس لے گیا۔ تو جب وہ وہاں پہنچے تو ابرہہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عبد المطلب کو قد اونچا اور چہرہ بھی وجیہ عطا فرمایا تھا۔ ان کی وجاہت اور رعب کو دیکھ کر ابرہہ اپنے تخت سے نیچے اتر آیا، اور نیچے بیٹھا، اور عبد المطلب کو بھی اپنے ساتھ بٹھایا۔ ابرہہ نے پوچھا کہ کیا ہے آپ کی بات؟ عبد المطلب نے کہا کہ میرے دوسو (۲۰۰) اونٹ پر آپ کے لشکر نے قبضہ کر لیا ہے، ان کو چھوڑ دیجیے۔ تو ابرہہ کہنے لگا کہ آپ کو دیکھ کر آپ کی عظمت اور بڑائی میرے دل میں قائم ہوئی تھی؛ لیکن آپ کی یہ بات سن کر سب ختم ہو گئی۔ میں تو یوں سمجھتا تھا کہ یہ کعبہ جس کو میں ڈھانے کے لیے آیا ہوں، جو تمہارے دین کی بنیاد ہے، تم مجھ سے اس کے متعلق درخواست کرو گے کہ ایسا مت کرو۔ اس کے بجائے تم نے تو اپنے اونٹوں کے چھڑانے کی درخواست کی۔ تو حضرت عبد المطلب نے جواب میں کہا: میں اونٹوں کا مالک ہوں، مجھے اپنے اونٹوں کی فکر ہے، اس لیے میں نے یہ درخواست کی۔ اور جس گھر کو تم اجاڑنے کے لیے آئے ہو، اس کا ایک مالک ہے، وہ اس کی حفاظت کرے گا، ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے، اور ہم بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتے؛ کیوں کہ ہمارے پاس اتنے اسباب اور طاقت نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھو! وہ آپ کو چھوڑے گا نہیں۔

عبد المطلب کی دعا:

خیر! یہ بات کر کے عبد المطلب وہاں سے واپس آئے، اور قریش کے کچھ سردار قسم کے لوگوں کو ساتھ لے کر کعبۃ اللہ پر پہنچے، اور اس کے دروازے کا کڑا پکڑ کر اللہ تبارک و

تعالیٰ سے دعا کی: اے اللہ! ہر آدمی اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو اپنے گھر کی حفاظت فرما، یہ صلیب اور اس کی طاقت تیری طاقت پر غالب نہ آنے پائے۔ یہ دعا کر کے انہوں نے لوگوں سے کہا کہ یہاں سے ہٹ جاؤ، اور پہاڑوں اور وادیوں میں چلے جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر کوئی عذاب آئے اور ہم بھی اس میں پھنس جائیں۔ بہر حال! یہ لوگ وہاں سے پہاڑ پر چلے گئے، اور اس انتظار میں رہے کہ ابرہہ کیا کرتا ہے؟

ہاتھی کے کان میں کیا کہا......؟؟؟

دوسرے دن ابرہہ نے اپنے لشکر کو تیار کیا، صف بندی کی اور سب سے پہلے محمود ہاتھی کو اٹھانا چاہا۔ نفیل بن حبیب - جو اس کے ساتھ تھے - نے جا کر اس ہاتھی کے کان میں کہا کہ تو اللہ کے حرم میں ہے!!! چناں چہ اس ہاتھی کو اٹھانا چاہا، نہیں اٹھا۔ بڑی مشکل سے آنکڑے اس کے کانوں میں ڈالے، تبر مارے، تب اٹھا، اس کو کعبۃ اللہ کی طرف چلانا چاہتے، تو نہیں چلتا تھا۔ یمن کی طرف چلانا چاہتے، تو چلتا تھا۔ شام کی طرف چلانا چاہتے، تو چلتا تھا۔ مشرق کی طرف چلانا چاہتے، تو چلتا تھا؛ لیکن مغرب کی طرف کعبۃ اللہ تھا، اس طرف جب چلانے کی نوبت آتی، تو نہیں چلتا تھا۔

خدائی لشکر:

اسی دوران سمندر کی طرف سے پرندوں کے غول درغول آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان میں سے ہر پرندے کی چونچ میں ایک کنکری اور اس کے دونوں پنجوں میں چنے یا مسور کے برابر ایک ایک کنکری تھی، اس طرح ہر پرندے کے پاس تین کنکریاں تھیں۔ انہوں نے آکر لشکر پر یہ کنکریاں برسائیں۔ جس کے سر پر پڑتی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا رِیوالور

(revolver) کی گولی ہے، سیدھی پورے جسم کو پھاڑ کر نیچے زمین میں چلی جاتی تھی بہت سے وہیں ختم ہو گئے، بہت سے تو وہاں سے بھاگے؛ لیکن ان گولیوں کے اثر کی وجہ سے ان کے جسم میں چیچک کی طرح بڑے بڑے پھوڑے نکل آئے۔

ابرہہ کا عبرت ناک انجام:

خود ابرہہ کے جسم میں بھی یہی کیفیت پیدا ہو گئی؛ البتہ وہ وہاں مرا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے قابل عبرت بنانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ سب یہاں مر جاتے تو یمن والوں کو پتا کیسے چلتا کہ ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا؟ تو کچھ تو یہاں مرے، کچھ بھاگ کر یمن کی طرف گئے۔ اور راستے میں خود ابرہہ کی انگلیاں کٹ کٹ کر پیپ سے بہہ رہی تھیں، اسی حالت میں وہ یمن پہنچا۔ اور یمن پہنچ کر اس کا سینہ پھٹ گیا، اور اس کا پورا جسم پیپ سے بہہ کر ختم ہو گیا۔ لوگوں نے اس کا یہ عبرت ناک انجام دیکھا، دوسرے لوگ بھی اسی طرح مرے۔ اور اس ہاتھی کو سنبھالنے والے دو پیل بان وہیں مکہ مکرمہ میں اندھے اور اپاہج بن گئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے بھی ان دونوں کو مکہ میں دیکھا ہے۔ وہ مکہ ہی میں تھے، بھیک مانگتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی واقعے کو اس سورت میں بیان فرمایا ہے۔[۱]

ارہاص؛ نہ کہ معجزہ:

اس واقعے کو حضرات محدثین نے نبی کریم ﷺ کا معجزہ قرار دیا ہے؛ لیکن معجزہ کی جو اصطلاحی تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کرے، اور اپنی

---

(۱) السيرة النبوية لابن إسحاق: ۳۶- ۵۲ و ۱۱۳ - ۱۱۵ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان) و تفسير الطبري، سورة الفيل، نقلاً عن ابن إسحاق.

نبوت کی دلیل اور علامت کے طور پر جو چیز خرقِ عادت پیش کرے، اس کو معجزہ کہا جاتا ہے۔

بخاری شریف میں بھی نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: مامن الأنبياء نبي إلا أعطي ما مثله أمن عليه البشر. (ہر نبی کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایسی نشانی دی جاتی ہے جس کو دیکھ کر لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں)[1] تو اسی کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ اور جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت نبی کریم ﷺ کی ولادت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کو معجزہ کا نام دینا تو ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں! اس کو ارہاص کہا گیا ہے۔ یعنی کسی نبی کی ولادت سے پہلے یا اس کی ولادت کے بعد نبوت ملنے سے پہلے کچھ ایسی چیزیں، علامات، نشانیاں جو معجزہ جیسی ہوں، ان سے ظاہر ہوں، تو اس کو معجزہ نہیں کہا جاتا؛ بلکہ ارہاص کہا جاتا ہے۔ جیسے: نبیٔ کریم ﷺ کی ولادت ہوئی، تو کسریٰ کے محل کے کنگرے گر گئے تھے، اور آتش پرستوں کے عبادت خانے میں وہ آگ جو سالہا سال سے نہیں بجھی تھی، وہ بجھ گئی تھی۔ یہ سب ارہاصات کہلاتے ہیں۔ تو اس (ہاتھی والے قصے) کو بھی ارہاص سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہرحال! اس واقعے کو اس سورت میں بیان کر کے قریش پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو انعام فرمایا، اس کو بیان کیا جا رہا ہے کہ دیکھو! جو کعبۃ اللہ کو برباد کرنے کے لیے آیا تھا، اس کو ہم نے اس طرح ٹھکانے لگایا اور اس طرح ہم نے تمہاری حفاظت کی۔

دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت:

چناں چہ اس واقعے کے بعد پورے ملک حجاز اور اطراف میں قریش کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور لوگ کہنے لگے کہ یہ تو اللہ والے ہیں، ان کو چھیڑا نہیں جا سکتا۔ جو بھی ان کے

---

(۱) صحيح البخاري: ۴۹۸۱.

مقابلے پر آئے گا وہ برباد ہوگا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے قافلے سال میں دو مرتبہ -گرمی کے زمانے میں شام، اور سردی کے زمانے میں یمن کی طرف- تجارت کے لیے ایسے علاقوں میں جاتے تھے جہاں کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا تھا، کوئی ان کے ان تجارتی قافلوں کو چھیڑتا نہیں تھا۔ اسی نعمت کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ قریش میں بیان کیا ہے، جو آپ سن چکے ہیں۔ اس سورت میں چوں کہ دفعِ مضرت ہے، اس لیے اس کو پہلے بیان کیا اور سورۂ قریش میں جلبِ منفعت ہے، اس لیے اس کو سورۂ قریش میں بیان کیا گیا ہے۔

ترجمہ ووضاحت:

باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟)

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ

(کیا اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی ساری تدبیریں بیکار نہیں کر دیں؟)

وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ

(اور ان پر اللہ تعالیٰ نے غول کے غول پرندے بھیجے)

ابابیل یا تو یہ اسم جمع ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اُبُّول کی جمع ہے، اُبُّول پرندوں کے غول (جھنڈ) کو کہا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ایک پرندہ ہوتا ہے، اس کو لوگ ابابیل کہتے ہیں، وہ یہاں مراد نہیں ہے۔ تمام مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے۔

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ

(وہ (پرندے) ان کے اوپر مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے)

سجیل اصل میں فارسی لفظ ہے، سنگ اور گِل کے مجموعے سے بنا ہے۔ مٹی کا گارا بنا کر اس کی گولیاں بنائی جائیں، اور ان گولیوں کو آگ میں پکایا جائے، تو وہ پتھر جیسی مضبوط ہو جاتی ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ ''کنکر کی پتھریاں'' کیا ہے۔[۱]

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ

(چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا بنا دیا جیسے کھایا ہوا بھوسا)

کھیت میں سے جب کھیتی کاٹ لی جاتی ہے، تو کھیتی کٹ چکنے کے بعد کھیت میں کھیتی کے کٹے ہوئے ذرات کو بھوسا کہتے ہیں۔ اس بھوسے کو جانور کھالیں، پھر کھانے کے بعد جانور جگالی ([illegible]) کرتا ہے، وہ باہر نکالتا ہے تو بالکل نرم اور قابل نفرت ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا بنا دیا۔

(۱) تفسیر عزیزی، سورۂ فیل۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ ہُمَزَہ

(مؤرخہ: ۱۸/صفر المظفر ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۷/اکتوبر ۲۰۱۸ء، شبِ یک شنبہ)

الحمد للّٰہ نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ باللّٰہ من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ باللّٰہ من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده اللّٰہ فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا اللّٰہ وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى اللّٰہ بإذنه وسراجاً منيراً صلى اللّٰہ تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ باللّٰہ من الشيطٰن الرجيم○ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحيم○

وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ ﴿١﴾ الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴿٢﴾ يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ﴿٣﴾ كَلَّا لَيُنۡۢبَذَنَّ فِى الۡحُطَمَةِ ﴿٤﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحُطَمَةُ ﴿٥﴾ نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ﴿٦﴾ الَّتِىۡ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـِٕدَةِ ﴿٧﴾ اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ﴿٨﴾ فِىۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿٩﴾

وجہ تسمیہ:

یہ سورۂ ھمزۃ ہے۔ چوں کہ اس کی پہلی آیت میں لفظ ھمزۃ آیا ہے، اس مناسبت سے اس کا نام سورۂ ہمزہ رکھا گیا۔

شانِ نزول:

اس سورت کے شانِ نزول کے سلسلے میں مذکور ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے جب لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کیا اور رفتہ رفتہ لوگ آپ ﷺ پر ایمان لانے لگے اور ایمان والوں کا حلقہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگا، تو مکہ کے سردار قسم کے لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر اس طرح اِن کے ماننے والوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جائے گی، تو ہماری چودھراہٹ اور ہماری ریاست خطرے میں پڑ جائے گی، چناں چہ جب انہوں نے خطرہ محسوس کیا، تو حسد، عداوت اور بغض کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی غیبت اور آپ ﷺ پر طعن وتشنیع شروع کر دی۔ وہ اپنی مجلسوں میں غائبانہ نبیٔ کریم ﷺ اور مسلمانوں کی برائیاں کرتے تھے، اور باقاعدہ اس کا پروپیگنڈا شروع کیا۔ اور بسا اوقات ان میں سے بعض تو روبہ رو نبیٔ کریم ﷺ کو اور مسلمانوں کو طعن وتشنیع کرتے تھے۔ اور اس کو انھوں نے اپنا مشغلہ اور مِشن بنالیا تھا۔

بعض لوگوں کے نام بھی مختلف روایات میں وارد ہوئے ہیں مثلاً: اَخنَس بن شریق ولید بن مُغِیرہ، امیہ بن خلف، جمیل بن عامر جمحی اور ابی بن خلف۔ یہی مکہ مکرمہ کے سردار قسم کے لوگ تھے۔ اور یہی لوگ حضور ﷺ اور مسلمانوں کی برائیاں (پیٹھ پیچھے اور سامنے) اور طعن وتشنیع کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اس پر تسلی کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر یہ سورت نازل فرمائی۔[1]

اس سورت میں کسی کا نام نہیں لیا گیا، بلکہ ان کی برائیوں اور کرتوت کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ جو لوگ بھی ایسے کرتوتوں کے مرتکب ہوں گے، اُن کے لیے وہی وعیدیں ہیں، جو اِن کے لیے اِس سورت میں بیان کی گئی ہیں۔

---

(۱) تفسير الطبري وبحر العلوم للسمرقندي ومعالم التنزيل للبغوي.

العبرة لعموم اللفظ:

حضرات اصولیین کا قاعدہ ہے کہ کوئی آیت کسی خاص شخصیت کے سلسلے میں، اس کے کسی خاص عمل کی وجہ سے نازل ہوئی، تو وہ اُسی کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی؛ بلکہ اس قسم کی حرکت جو بھی کرے گا، وہ اس میں شمار کیا جائے گا۔ یہاں بھی ایک عمومی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اُن کے اِن کرتوتوں اور ایذارسانیوں کی وجہ سے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچتی تھی۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ پر باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿٩٩﴾ (الحجر) (اے نبی! ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُن کی باتوں سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے، لیکن [ہم آپ کو یہ تاکید کرتے ہیں کہ] آپ اپنے رب کی پاکی حمد وثنا کے ساتھ بیان کیجیے اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے والے بنیے، اور اللہ کی عبادت میں لگے رہیے موت تک) گویا ان کے ان طعنوں، غیبت اور شرارتوں کا کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیگر مقامات پر بھی ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہی تلقین کی گئی ہے کہ صبر اور تقویٰ سے کام لیا جائے۔ یہاں اس سورت میں ان کی ان ہی حرکتوں کو ذکر فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وعید سنائی گئی ہے۔

ھمزة اور لمزة کی تحقیق:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ِۙ

ھمزة اور لمزة دونوں فُعَلَةٌ کے وزن پر ہیں، یہ مبالغے کے صیغے ہیں، ھمزة: یعنی بڑی خرابی ہے اس آدمی کے لیے جو پیٹھ کے پیچھے دوسروں پر عیب لگانے والا ہے۔ لمزة:

منہ پر طعنہ دینے کے عادی کو کہتے ہیں۔ [۱] بعض حضرات مفسرین اور اہل لغت نے اس کے برعکس بھی ترجمہ کیا ہے۔یعنی همزة کا ترجمہ طعنہ دینے والا اور لمزة کا ترجمہ پیٹھ پیچھے برائی کرنے والا۔ صاحب تفسیر قرطبی نے یہ دونوں چیزیں بیان کی ہیں۔ [۲] لیکن عام طور پر ہمارے اکابر جو اردو میں ترجمہ کرتے ہیں وہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ همزة: غائبانہ دوسروں پر عیب لگانے والا، اور لمزة: منہ پر طعنے دینے کا عادی۔

اس کو اپنے مال پر اعتماد ہے:

ویل بہت بڑی خرابی، ہلاکت اور بربادی کو کہتے ہیں۔ گویا اِس سے ہر اُس آدمی کو بہت بڑی بربادی اور ہلاکت کی وعید سنائی گئی، جو لوگوں کو تکالیف پہنچاتا ہے اور پیٹھ پیچھے عیب لگاتا ہے، اور منہ زبانی طعن وتشنیع کرتا ہے۔

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ. (جس نے مال اکٹھا کیا اور گن گن کر رکھا)

ان دونوں باتوں کے ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟ وہ بھی بتلائی۔ اس لیے کہ دراصل اس نے مال جمع کر رکھا ہے، اور اس سے محبت ہے۔ اور اس کو اپنے مال پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میری مال کی فراوانی اور دولت کی وجہ سے کوئی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اس لیے وہ ایسی حرکتیں کرتا ہے۔

تین برائیاں:

الحاصل! اس سورت میں تین برائیوں کی طرف خاص طور سے تنبیہ کی گئی ہے:

---

(۱) نقله الطبري عن مجاهد.

(۲) نقله الطبري عن مجاهد قبله.

(۱) غائبانہ اُن لوگوں پر عیب لگانا جو بُری ہیں۔ یہ کہہ کر گویا مسلمانوں کو بھی متنبہ کیا جارہا ہے کہ اپنے آپ کو ایسے کرتوتوں اور حرکتوں سے باز رکھو، ورنہ یہی وعید تم پر بھی صادق آسکتی ہے۔

(۲) گن گن کر رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مال کو خرچ نہیں کرتا ہے۔

(۳) اس میں لالچ اور حرص ہے، اس کی وجہ سے مال جمع کرتا ہے۔ اور بخل کی وجہ سے گن گن کر رکھتا ہے، خرچ نہیں کرتا ہے۔

مال کے ذریعے بھی اللہ کا قرب:

کوئی آدمی شریعت کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق، جائز طریقے سے مال کمائے، اور اللہ تعالیٰ نے جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہاں خرچ کرے، بخل سے کام نہ لے، مالی حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کرے، تو کوئی حرج نہیں۔ مال بھی اللہ کی ایک نعمت ہے، اس کے ذریعے سے آدمی اللہ کا قرب حاصل کرسکتا ہے۔

اللہ کی جلائی ہوئی آگ:

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ. (وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا)

گویا اس کو اپنے مال پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ اس مال کی وجہ سے میں ہمیشہ رہوں گا، یہ مال مجھے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ حالاں کہ اس دنیا میں کون ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے آیا ہے؟ یہ دنیا ہی باقی رہنے والی نہیں ہے!!! كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ. (الرحمٰن:۲۶) ہر ایک کو دنیا سے جانا ہے۔

یہاں تک اللہ تعالیٰ نے ان کی عادتیں اور خصلتیں بتلائیں۔ آگے وعید سنائی جارہی

ہے۔ویل کہہ کر وعید سنائی تھی۔اب مزید سنائی جارہی ہے۔

كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ. (ہرگز نہیں! اس کو تو ایسی جگہ میں ڈالا جائے گا جو اس کو چورا چورا کردے گی)

حَطَمَ يَحْطِمُ کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو توڑ پھوڑ کر چورا بنا دینا۔تو جہنم میں آگ کا ایک طبقہ ہے،اس طبقے کا نام حطمة ہے،اس کو اس میں ڈالا جائے گا، جو اس کے جسم کو توڑ پھوڑ کر چورا چورا کردے گا۔

وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ (اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ چورا چورا کرنے والی چیز کیا ہے؟) یعنی جس جگہ میں اس کو ڈالا جائے گا، جو چورا چورا کرنے والی اور توڑ پھوڑ کرنے والی ہے، وہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ آگے اس کی وضاحت فرماتے ہیں۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ. (اللہ کی جلائی ہوئی آگ ہے)

الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ. (جو دلوں پر غالب آجاتی ہے)

دلوں کو جلانے والی آگ:

دیکھو! دنیا میں اگر کسی آدمی کو آگ میں ڈالا جائے، تو پہلے آگ اس کی کھال پر اثر کرتی ہے، پھر اس کے بعد گوشت، پھر ہڈی پر۔اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اسی میں آدمی کی موت واقع ہوجاتی ہے، اور دل تک اس کا اثر پہنچنے کی نوبت نہیں آتی۔لیکن جب جہنمیوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا، تو جہنم میں لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى. (الاعلی:۱۳) (وہ نہ تو مرے گا، نہ زندہ رہے گا) یعنی وہ زندگی، زندگی نہیں ہے۔موت نہیں آئے گی۔جب موت نہیں آئے گی، تو دنیا میں تو آگ کا اثر دل تک پہنچے اس سے پہلے موت آجاتی ہے اس لیے وہ اثر نہیں پہنچ

پاتا؛ لیکن جہنم میں تو دل پر بھی اثر پہنچے گا۔ لہٰذا وہ اس کے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ ہوگی۔

چار گرمیاں:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں ایک تو آگ کی گرمی ہوتی ہے، جس کی کیفیت تو سب جانتے ہیں۔ دوسری سورج کی گرمی ہوتی ہے۔ گرمی کے زمانے میں سورج جب قریب آتا ہے، اس کی وجہ سے لوگوں کو کتنی تکلیف محسوس ہوتی ہے؟ لوگ اے سی (A.C.) میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور تیسری گرمی آدمی کے اندر کی ہوتی ہے۔ آدمی کو جب بخار آتا ہے تو اس کے جسم کی گرمی ہوتی ہے۔ تو بخار کی گرمی کی وجہ سے آدمی بہت زیادہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔ بخار اندر ہی اندر ہے، اس لیے اس کو تکلیف کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ البتہ بخار مسامات کے ذریعے، پسینے کی شکل میں باہر نکل جائے تو کچھ چین وسکون محسوس ہوتا ہے۔ یہ تین قسم کی گرمیاں ہیں جس کو لوگ جانتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں چوتھی قسم کی گرمی بیان کی ہے، وہ اللہ کی جلائی ہوئی آگ ہے۔ تو جس گرمی سے لوگ دنیا میں واقف نہیں ہیں۔ اسی کو فرمایا جارہا ہے: نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ (اللہ کی جلائی ہوئی آگ) الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَۃِ (جو دل کے اندر تک جا پہنچے گی)[۱]

ناقابلِ برداشت آگ:

اِنَّھَا عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَۃٌ (بے شک وہ ان پر بند کردی جائے گی)۔

آگ اگر کھلی ہو تو اس کا اثر دھیرے دھیرے کم ہوجاتا ہے؛ لیکن اگر آگ کو بند کر دیا جائے، تو اس صورت میں اس کی شدت اور تاثیر مزید تیز ہوجاتی ہے۔ گویا آگ کو باہر

---

(۱) تفسیر عزیزی: ۲/ ۶۴۲ (کتب خانۂ فیض ابرار، انکلیشور، گجرات)۔

نکلنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ جیسے کسی بند ڈبے میں رکھا جائے۔

فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (وہ آگ کے لمبے لمبے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے)

یعنی جہنم میں آگ کے ایسے لمبے شعلے ہوں گے، جو چاروں طرف سے ایسے معلوم ہوں گے جیسے ان کو آگ کے ستونوں میں بند کر دیا گیا ہو۔ تو اس آگ کی شدت نا قابل برداشت ہوگی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو یہ وعیدیں سنائیں۔

ایک وقت آئے گا:

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کو بتلا دیا گیا ہے کہ آج وہ اپنے مال ودولت کی فراوانی کی وجہ سے، اور اپنے روپے پیسے پر اترانے کی وجہ سے یوں سمجھتے ہیں کہ کون ہمارا کچھ بگاڑ سکتا ہے؟ لیکن ایک وقت آئے گا کہ موت آئے گی اور پھر اللہ تعالیٰ ان کو جہنم کے اس طبقے میں ڈالیں گے، جہاں ان پر یہ عذاب سختی کے ساتھ مسلط کر دیا جائے گا۔ بہر حال! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جن لوگوں نے اس طرح کا معاملہ کیا تھا ان کے لیے یہ وعیدیں ہیں۔

آج بھی ایسے لوگ ہیں......!!!

اور یہ اُسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تک دنیا میں رہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اس طرح کا معاملہ ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آج بھی دنیا میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو -نعوذ باللہ- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عیب لگاتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طعنے دیتے ہیں۔ تو یہ بات اسی زمانہ کے ساتھ خاص نہیں تھی۔ آج بھی لوگ ایسا کرتے ہیں۔ جیسے ایک شخص نے

ساری دنیا کے کارٹون بنانے والوں کو-نعوذ باللہ- دعوت دی تھی، کہ فیس بک پر نبی کریم ﷺ کے کارٹون بنائے جائیں، اور اس کے لیے بہت بڑا انعام بھی رکھا۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ توہین کے اس معاملے پر ان لوگوں کے لیے بھی یہی وعید ہے۔ کہ دنیا میں ایسے کم بخت رذیل اور کمینے لوگ ہیں کہ جو دلیل سے بات نہیں کرتے، جب ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی، تو وہ اس طرح سب وشتم، گالی گلوچ اور برائی پر اتر آتے ہیں۔ دنیا کا دستور یہی ہے کہ جب کسی کے پاس دلیل نہیں ہوا کرتی، تو وہ دوسرے طریقے اور ہتھکنڈے اپناتا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح ہو رہا ہے کہ جو اپنے آپ کو جدید تہذیب کے دعوے دار کہتے ہیں، حقوق انسانی کے علَم بردار کہتے ہیں وہ بھی -نعوذ باللہ- نبی کریم ﷺ کی شان میں اسی طرح گستاخیاں اور برائیاں کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے لوگوں کو باقاعدہ دعوت دی جارہی ہے، ان کے لیے یہ سب وعیدیں ہیں۔

اہل ایمان کی آزمائش:

اس میں خود اہل ایمان کے ایمان کی بھی بڑی آزمائش ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کی جانے والی اس گستاخی پر آپ کیا ایکشن لے رہے ہیں؟ آپ اس کا کیا جواب دے رہے ہیں؟ گویا ہمارے ایمان کو چیلینج کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی محبت تو ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ لایؤمن أحدکم حتی أکون أحب إلیه من نفسه ووالده وولده والناس أجمعین. (نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی جان، باپ، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں)[1]

---

[1] صحیح البخاري: ۱۵ و صحیح مسلم: ۴۴.

جب تک حضور ﷺ کی محبت سب کی محبت پر غالب نہ ہو، تب تک آدمی کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔آپ ﷺ کی شان میں اس طرح کی گستاخیاں کر کے اہل ایمان کو غیرت دلائی جارہی ہے، اور چیلینج کیا جارہا ہے کہ ان کو چاہیے کہ ایسا کرنے والوں کی اس حرکت پر اپنا تأثر دیں۔ وہ تأثر کیا ہے؟ جوش میں آکر ان کو گالیاں دینے کے بجائے ایسا جواب دینا چاہیے، جو ان پر اثر انداز ہو۔

فیس بُک کا استعمال چھوڑ دیجیے:

اور وہ جواب کیا ہے؟ حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے کسی موقع پر فرمایا تھا کہ یہ فیس بک ہے، اسی کے ذریعے یہ لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی فیس بک کو کلک کرتا ہے تو ایک مرتبہ کلک کرنے پر فیس بک والے کو ڈھائی ڈالر کا فائدہ ہوتا ہے۔تو یہ لوگ ایسے لاکھوں ڈالر کماتے ہیں۔آپ اس فیس بک کے استعمال کو چھوڑ دیجیے۔ہم لوگ کثرت سے موبائل استعمال کرنے کی وجہ سے اس کے ایسے عادی بن چکے ہیں کہ ہم اپنے دشمنوں کو، حضور ﷺ کی برائی کرنے والوں کو، نادانستہ طور پر فائدہ اور طاقت پہنچا رہے ہیں۔ان کا جواب یہی ہے کہ جب پیسے کی مار پڑے گی، تو سیدھے ہو جائیں گے۔آپ ان کے خلاف احتجاج کرتے رہو، وہ اس کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔لیکن جب پیسے کی مار پڑتی ہے، تو وہ خود بخود سیدھے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اہل ایمان کی ایمانی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ ان چیزوں کو استعمال نہ کریں؛ تاکہ اس کی وجہ سے جو نقصان ہو تو وہ خود ہی ایسی چیزوں سے باز آجائیں گے۔

یہی اصل جواب ہے:

حاصل یہ ہے کہ یہ وعید آپ ﷺ کے زمانے میں مکہ مکرمہ کے سردار ایسی حرکتیں کرتے تھے، ان کے لیے اصل تو اس سورت میں نازل ہوئی؛ لیکن ان کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہمارے اس ملک میں بھی ایسے لوگ ہیں جو -نعوذ باللہ- نبیٔ کریم ﷺ کی شان میں ایسے گستاخانہ الفاظ استعمال کرتے ہیں، جس کو ہم پڑھتے ہیں تو ہماری ایمانی غیرت جوش میں آجاتی ہے۔ لہٰذا اُن کو ایسے انداز میں جواب دینا چاہیے، جس سے ان کو نقصان پہنچے۔ یہی اصل جواب ہے۔ جوش میں آکر ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے کہ ان کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، ہم بلاوجہ بدنام ہوجاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ عصر

(مؤرخہ ۲۵؍صفر المظفر ۱۴۴۰ھ-مطابق ۳؍نومبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۝

وَالۡعَصۡرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾

بقامت کہتر بہ قیمت بہتر:

یہ سورۂ عصر ہے، چوں کہ پہلی ہی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے عصر یعنی زمانے کی قسم کھائی ہے، اس کلمۂ عصر کی وجہ سے اس کا نام سورۂ العصر رکھا گیا ہے۔ یہ قرآن پاک کی دوسرے نمبر کی سب سے چھوٹی سورت ہے۔ پہلے نمبر کی سورۂ کوثر ہے، اس میں دیگر

سورتوں کے مقابلے میں کم سے کم حروف اور کلمات ہیں۔اس سے کچھ کم چھوٹی یہ سورۃ العصر ہے۔گویا یہ دوسرے نمبر کی چھوٹی سورت ہے۔لیکن اپنے مضامین کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

زندگی درست کرنے کے لیے:

امام شافعیؒ کا مقولہ ہے کہ اگر لوگ اس سورت میں غور کریں،تو ان کی زندگی کے درست کرنے کے لیے یہ اکیلی کافی ہو جائے گی۔[۱] اور حضرت عبیداللہ بن حِصنؒ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ میں سے دو آدمی جب آپس میں ملتے تھے،تو وہ جدا نہیں ہوتے تھے؛ یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو سورۂ عصر نہ سنا دے۔گویا اس میں بڑی نصیحت ہے۔ ہر ایک سورۂ عصر پڑھ کر اپنے ساتھی کو سناتا تھا،اس کے بعد سلام کر کے جدا ہوتا تھا۔[۲]

شانِ نزول:

اس کے شانِ نزول کے سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں لکھا ہے کہ کلب بن اُسید نامی قریش کا ایک آدمی تھا،اس کو ''ابوالاَسدَین'' سے بھی یاد کیا جاتا تھا،یہ اس کی کنیت تھی۔حضرت ابوبکرؓ کا زمانۂ جاہلیت میں دوست تھا۔جب حضرت ابوبکرؓ نے اسلام قبول کیا تو ایک دن وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا،اور کہنے لگا: ابوبکر! تم تو بڑے عقلمند آدمی تھے!!! اور ہمیشہ تجارت میں اپنی عقلمندی اور دانائی کی وجہ سے

---

(۱) تفسیر ابن کثیر.

(۲) المعجم الأوسط للطبراني: ۵/۲۱۵ [۵۱۲۴] ط: دار الحرمین، القاهرة.

بہت نفع حاصل کرتے تھے !!! تم نے یہ کیا کیا کہ اسلام قبول کرلیا؟ اور لات اور عزی کے دین اور اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر تم بہت بڑے خسارے میں پڑ گئے، ان کی شفاعت سے محروم ہو گئے۔تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں فرمایا: جو آدمی حق قبول کرتا ہے وہ کبھی خسارے میں نہیں رہتا۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی گفتگو پر حضرت ابوبکرؓ کی تائید میں اوران کی بات کی خوبی کے بیان میں یہ سورت نازل فرمائی۔حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہ شانِ نزول بتلایا ہے۔[۱]

اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھائی ہے: وَالْعَصْرِ ۔عصر: زمانے کو بھی کہتے ہیں، عصر کا وقت بھی مراد لیا جاسکتا ہے، اور آدمی کی زندگی کا زمانہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔

قسم یقین دہانی کے لیے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں جو قسم کھائی ہے، عام طور پر انسان اور لوگ اپنی باتوں میں جب قسم کھاتے ہیں، قسم کا استعمال بسا اوقات مخاطب کو اپنی بات کا اطمینان اور یقین دلانے کے لیے ہوتا ہے۔گویا وہ اپنی سچائی ظاہر کرنے کے لیے قسم کھاتا ہے۔اس مقصد کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کو قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا (النساء:۱۲۲) اللہ سے زیادہ کون سچا ہوسکتا ہے؟

قسم بطور دلیل:

البتہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے کبھی کبھی اپنی بات اور گفتگو میں قوت پیدا کرنے کے لیے بھی قسم استعمال کی جاتی ہے۔ہاں ! اس مقصد کے لیے تسلیم کر سکتے ہیں۔

---

(۱) تفسیر عزیزی ص: ۶۴۳،۶۴۴، کتب خانۂ فیض ابرار، انکلیشور، گجرات۔

حضرات مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام میں جو قسم ہے وہ دراصل ایک دلیل اور شاہد کے طور پر ہے، اس چیز پر جس کی اللہ نے قسم کھائی ہے۔ اللہ نے قرآن پاک میں بہت ساری چیزوں کی قسم کھائی ہے۔ زمانے کی، قلم کی، بلد امین- مکہ مکرمہ- کی، قیامت وغیرہ۔ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (القیمة-۱) وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ (التین-۳) وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ (القلم-۱) وَ الْعَصْرِ (العصر-۱) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جس چیز کی قسم کھائی ہے، وہ مابعد کے مضمون کی صداقت کے لیے بطور دلیل اور شاہد ہے۔ دیکھو! جس چیز کی قسم کھائی جارہی ہے اگر اس کی حقیقت میں تم غور کروگے، تو اس کے بعد جو چیز بیان کی جارہی ہے، تمہیں اس کی سچائی کا اندازہ ہوجائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ جو قسمیں کھاتے ہیں، وہ عموماً اسی مقصد کے لیے ہوتی ہیں۔ یہاں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمانے کی قسم کھائی ہے، اس کے بعد حقیقت بیان کی گئی ہے کہ: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ (بے شک تمام انسان خسارے اور گھاٹے میں ہیں) یہاں ایک مضمون بیان فرمایا ہے کہ تمام انسان خسارے اور گھاٹے میں ہیں، اس کی صداقت اور تاکید کے لیے زمانے کی قسم کھائی گئی۔ گویا باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ زمانے کے حالات میں اگر کوئی آدمی غور کرے تو اس کو یہ بات صاف معلوم ہوگی کہ انسان خسارے اور گھاٹے میں ہے۔

زندگی ایک تجارت:

کیوں؟ اس لیے کہ انسان کو دنیا میں آخرت کی تجارت کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ. (الصف-۱۰) گویا اس زندگی کے سارے کاموں کو ایک تجارت سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری جگہ

ہے: اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (التوبۃ-۱۱۱) (اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے خرید لیا) گویا جنت اس کی قیمت مقرر کی گئی ہے۔ قرآن نے اس کو تجارت سے تعبیر کیا۔

اور حدیث شریف میں بھی نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: کُلُّ الناس یَغْدُو، فبائع نَفْسَه فمُعْتِقُها أو مُوبِقُها. (ہر انسان جب صبح کو اپنے گھر سے نکلتا ہے تو وہ اپنی جان کا سودا کرتا ہے، یا تو وہ اپنے آپ کو بچا لے جاتا ہے یا اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے)[۱] اگر اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری کی، اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کی، اللہ کے حکم کے مطابق دن گزارا، تو وہ اپنے آپ کو بچا لے گیا، اپنی جان کو جہنم کے عذاب سے آزاد کرا لیا۔ اور اگر اس کے خلاف کیا ہے تو اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: کُلُّ الناس یَغْدُوا، فبائع نَفْسَه. (ہر آدمی جب صبح کو نکلتا ہے تو اپنی جان کا سودا کرتا ہے) اس کو تجارت سے تعبیر کیا۔ گویا اللہ نے انسان کو جو دنیا میں بھیجا ہے، اس کے لیے یہ ایک تجارت ہے۔

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم:

اس تجارت کا سرمایہ کیا ہے؟ ہر تجارت کے لیے کوئی نہ کوئی پونجی، کیپیٹل (Capital) اور سرمایہ ہوا کرتا ہے۔ تاجر سرمایے اور کیپیٹل سے تجارت کرتا اور نفع کماتا ہے۔ اور سرمایے کو بھی ترقی دیتا اور بڑھاتا ہے۔ تو انسان کی تجارت کے لیے سرمایہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تجارت کے لیے جو سرمایہ عطا فرمایا ہے، وہ اس کی زندگی ہے۔ یہ ایک ایسا سرمایہ ہے جو ہر وقت گھٹتا جا رہا ہے، اس میں کمی آتی جا رہی ہے۔ ایک عربی شاعر کا

---

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۲۲۳.

شعر ہے:

حياتك أنفاس تُعَدُّ فكلّما مضى نَفَسٌ منها انتقصت بها جزءًا

(تمہاری زندگی چند سانسوں کا نام ہے، جب تمہاری ایک سانس گزری تو گویا تمہاری زندگی میں اتنی کمی آگئی)

جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے زندگی میں کمی آتی جاتی ہے۔ اور زندگی گزرتی جارہی ہے، ہم اس کو روک نہیں سکتے۔ حضرت خواجہ صاحب کا شعر ہے:

ہورہی ہے عمر مثلِ برف کم چپکے چپکے رفتہ رفتہ دم بہ دم

دوسرمایے:

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: سرمایے دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) منجمد: ایسا سرمایہ کہ آدمی جب اس کو استعمال کرے تب وہ اس کے ہاتھ سے نکلے گا۔ اگر اس کو استعمال نہ کرے تو وہ باقی رہتا ہے۔ مثلاً: آپ کے پاس اگر ایک لاکھ روپے ہیں، تو یہ منجمد سرمایہ ہے۔ آپ ابھی استعمال نہ کرنا چاہیں، تو پیٹی یا تجوری میں رکھ دو، ایک مہینے کے بعد، ایک سال کے بعد، دو سال کے بعد اس کو نکال کر استعمال کر سکتے ہیں، وہ اپنی حالت پر باقی رہیں گے۔

(۲) سیّال: یعنی جاری سرمایہ۔ مثلاً: آپ اس سے فوری طور پر فائدہ اٹھالیں تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ رفتہ رفتہ وہ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جیسے: ایک بزرگ ایک مرتبہ بازار سے گزر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی برف بیچ رہا ہے۔ وہ آواز لگارہا تھا: لے لو اُس آدمی کی چیز! جو ہر وقت اس کے ہاتھ سے نکلتی جارہی ہے۔ برف تو پگھلتا رہتا ہے،

اب وہ جتنا جلدی اس کو بیچ کر اس کے پیسے بنالے تب تو ٹھیک ہے، اور اگر برف جلدی نہیں بکا تو وہ دھیرے دھیرے پگھل کر ختم ہو جائے گا۔ اس کا سرمایہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ہماری زندگی کے ایام بھی ایسے ہی ہیں۔[۱]

آج اگر ہم کو کوئی کام نہیں ہے تو آج کے دن کو ہم فریزڈ کر کے رکھنا چاہیں، یا تجوری میں بند کر کے رکھنا چاہیں کہ آج تو کچھ کام نہیں ہے، چلو! اس دن کو محفوظ کر لیں، کبھی کام ہوگا تو اس دن کو ہم استعمال کریں گے۔ ایسا کر سکتے ہیں؟ نہیں۔ ہم اس کو بچا کر رکھ نہیں سکتے، وہ ہمارے ہاتھ سے نکلتا چلا جا رہا ہے۔ تو یہ ایک ایسا سیال سرمایہ ہے کہ اگر ہم اس سے ہاتھوں ہاتھ فائدہ اٹھالیں تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ ہم گھاٹے میں ہیں۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھو کہ اگر کسی آدمی کے پاس سورت شہر کے کسی اعلیٰ مارکیٹ ایریا میں ایک بیگہ زمین ہے، جو کروڑوں کی قیمت کی ہے۔ یہ زمین ایسا منجمد سرمایہ ہے، جو اس کے ہاتھ سے اس وقت تک نہیں نکلے گا، جب تک اس کو بیچ کر اس سے نفع حاصل نہ کر لے۔ اور اس کے پاس پیسے بھی ہیں۔ کسی نے کہا کہ دیکھو! یہ بڑی موقع کی زمین ہے، اگر تم یہاں کوئی تجارتی سینٹر بناؤ، ایک بڑی عمارت بناؤ، جس میں دکانیں بھی ہوں، دفتر بھی ہوں، تو ان سے آپ کو کروڑوں کی شکل میں کرایہ ملے گا۔ چناں چہ اس نے اس زمین پر ایک بہت بڑی عمارت بنائی، دکانیں، آفسیں سب کچھ بنایا۔ اب وہ عمارت تیار ہو گئی۔ خود زمین، دکانیں، دفتر تو منجمد سرمایے ہیں؛ لیکن اب ان دکانوں اور دفتروں کو کرایے پر دے کر جو آمدنی حاصل کرے گا، تو وہ کرایہ ایک سیال سرمایہ ہے۔ اس طرح کہ عمارت تیار ہو گئی، آفسیں اور دکانیں بن گئیں، لوگ کرایے پر لینے آرہے ہیں: مجھے تمہاری دکان کرایے

---

(۱) معارف القرآن - سورۂ عصر (حضرت مفتی شفیع صاحب عثمانیؒ)۔

پر چاہیے، تو یہ کہتا ہے: ابھی نہیں! میں ذرا سوچتا ہوں! ابھی نہیں! ابھی نہیں! کرتے کرتے دو سال نکال دیے، تو اب دو سال کا جو کرایہ آسکتا تھا، اس نے اس کو ضائع اور برباد کر دیا۔ الغرض دکانیں الگ سرمایہ، اور ان سے حاصل ہونے والا کرایہ الگ سرمایہ ہے۔ کرایہ سیال سرمایہ ہے، کرایہ پر دے کر ہاتھوں ہاتھ نفع حاصل کرتا ہے، تو ٹھیک، ورنہ اتنا نقصان ہوگا۔ آئندہ بھی جتنی دیر کرتا جائے گا اتنا مزید نقصان ہوگا۔

گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی:

تو حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی کے ان ایام کو ہم جتنا زیادہ اللہ کی اطاعت وفرماں برداری میں، عبادت میں، ذکر وتسبیح میں اور مأمور بہا امور میں صرف کریں گے، تو ان اوقات کے ذریعے ہم آخرت کا ذخیرہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اگر ہم نے کچھ نہیں کیا، یہاں تک کہ یہ اوقات ہمارے ہاتھ سے نکل گئے، تو کم ازکم یہ نقصان تو ضرور ہوا کہ ان اوقات میں ہم آخرت کی جو بڑی دولت حاصل کر سکتے تھے وہ حاصل نہیں کر پائے۔ اور اگر خدانخواستہ ان اوقات کو ہم نے اللہ کی نافرمانی میں استعمال کیا، یہ تو اپنا ڈبل نقصان کیا۔ جب آدمی اپنی زندگی پر غور کرتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ ہر حال میں اس کے ہاتھ سے نکلی چلی جارہی ہے، اور ہر آدمی نقصان اور گھاٹے میں ہے۔ سرمایہ اس کا کم ہوتا جارہا ہے۔

جب سال پورا ہوتا ہے تو لوگ سال گرہ مناتے ہیں، اور خوشیاں مناتے ہیں؛ اگرچہ یہ اسلامی طریقہ نہیں ہے، غیر اسلامی طریقہ ہے، لیکن لوگوں کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی یہ حرکت کرتے ہیں۔ سال گرہ منانے والے دعوتیں کرتے ہیں، خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ ہماری زندگی میں ایک سال بڑھ گیا، ہم بائیس سال کے تھے، اب تیئیس سال کے ہو گئے۔

اکبر الٰہ آبادی بڑے حقائق پیش کرنے والے ہیں۔ انہوں نے ایسے لوگوں سے کہا ہے: بڑھا کہاں؟ گھٹا ہے۔ مان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ساٹھ سال کی زندگی عطا فرمائی ہے، تو جب ایک سال ہوگا تو یوں کہا جائے گا کہ ساٹھ سال میں سے ایک سال کم ہوا۔ ہم لوگ تعبیر یوں کرتے ہیں کہ بڑھا۔ یہ دھوکا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی اس کو اپنے شعر میں کہتے ہیں:

جب سال گرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا یہاں گرہ سے ایک اور برس جاتا رہا

ہماری گانٹھ میں سے ایک برس گیا۔ پہلے زمانے میں لوگ پیسے اپنی اوڑھی ہوئی چادر کے کنارے میں باندھتے تھے۔ جیسے گجراتی میں کہتے ہیں: ખર્ચવા ગાંઠના۔ تو گرہ میں سے یعنی اپنی جیب میں سے۔ یعنی جب سال گرہ ہوئی تو یہ بھید کھلا کہ اپنی جیب میں سے ایک سال گیا، بڑھا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ جو قیمتی سرمایہ عطا فرمایا ہے، اس سے جتنا زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہو اٹھانا چاہیے۔ جو لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں وہ کامیاب ہیں، ورنہ ہاتھ سے یہ دولت نکلی چلی جارہی ہے اور انسان گھاٹے میں ہے۔

چالیس سال سے روٹی نہیں کھاتے تھے!!!

اسی لیے ہمارے بزرگوں کے حالات میں سنتے ہیں کہ وہ ایک ایک منٹ کی اور ایک ایک لمحہ کی قدر کیا کرتے تھے!!! آپ نے فضائل کی کتابوں میں سنا ہوگا کہ شیخ علی جرجانیؒ ایک اللہ والے تھے۔ وہ روٹی کھانے کے بجائے ستو پھانک لیا کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ صرف ستو پھانک لیا کرتے ہیں، روٹی نہیں کھاتے؟ تو فرمایا کہ میں نے حساب لگایا کہ روٹی کھانے میں چبانا پڑتا ہے، اس میں دیر لگتی ہے۔ لہٰذا میں ستو پھانک لیتا ہوں، تو مجھے ۷۰ رمرتبہ سبحان اللہ زیادہ پڑھنے کا فائدہ ہوتا ہے۔ چناں چہ ان

کے متعلق لکھا ہے کہ ۴۰ رسال سے وہ روٹی نہیں کھاتے تھے، صرف ستو پھانکتے تھے: تاکہ جو وقت بچے اس کو تسبیح پڑھنے میں استعمال کریں۔[۱] آپ اندازہ لگائیں! جو آدمی اپنے کھانے کے ٹائم میں سے کٹنگ کرکے تسبیح پڑھتا ہو وہ کبھی دوسرے وقت کو ضائع کرسکتا ہے؟

قرآن پاک کی پچاس آیتیں پڑھ سکتا ہوں:

حضرت داود طائیؒ کے متعلق منقول ہے کہ وہ روٹی چبا کر کھانے کے بجائے پانی میں بھگو دیتے تھے۔ کھانے کے لیے روٹی آتی تو اس کو پانی میں بھگو دیتے تھے، جب نرم ہو جاتی تو منہ میں ڈال کر حلق سے نیچے اتار لیتے تھے۔[۲] روٹی کا مقصد ہے غذا، جب حلق سے نیچے جائے گی تب بھی وہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ البتہ بھگو کر کھانے کی وجہ سے لذت اور ذائقہ نہیں رہے گا۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ جب پلیٹ میں پانی کے ایک دو قطرے رہ گئے ہوں اور روٹی کا جو حصہ وہاں لگا ہوا ہے، وہ جب منہ میں آتا ہے تو ذائقہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا موڈ خراب ہو جاتا ہے؛ لیکن انہوں نے زندگی بھر اسی طرح روٹی کھائی۔ کیوں؟ وہ کہتے تھے کہ میں نے روٹی چبا کر کھانے اور بھگو کر کھانے کے درمیان حساب لگایا، تو معلوم ہوا کہ میں اتنی دیر میں قرآن پاک کی پچاس آیتیں پڑھ سکتا ہوں۔ یہ وہ حضرات تھے جو اپنی زندگی کے اوقات کو وصول کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ اور ایک ایک منٹ کی قدر کرتے تھے۔

آخرت کی تجارت بڑی نفع بخش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو جو خصوصیات و امتیازات عطا فرمائے، ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نیکی کا بدلہ دس

---

(۱) إحياء علوم الدين للغزالي ، كتاب كسر الشهوتين ، الفائدة السابعة: تيسير المواظبة على العبادة و الضوء اللامع للسخاوي: ۵/۳۲۸-۳۳۰ (ط: دار مكتبة الحياة، بيروت) والبدر الطالع للشوكاني: ۱/۴۸۸-۴۹۰ (ط: دار المعرفة، بيروت).

(۲) حلية الأولياء للأصفهاني: ۷/۳۴۵ و ۷/۳۴۸-۳۵۰ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

گنا رکھا ہے۔ یہ تو کم سے کم ہے، اور جب بڑھتے ہیں تو دس گنا سے سات سو گنا تک۔ اور اگر مال خرچ کیا جاتا ہے تو اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے، أضعافاً مضاعفة کا وعدہ فرمایا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (البقرة-۲۶۱) اللہ جس کو چاہیں اس کو سات سو سے بھی زیادہ دے سکتے ہیں۔ روزے کے متعلق وارد ہے کہ اس کا ثواب اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ تو اس امت کو نیکیوں کا اتنا زیادہ بڑھا وا ملا ہے، جب آدمی اس کو سوچے اور آخرت کے لیے عمل کرے تو بہت کچھ ذخیرہ آخرت کے لیے جمع کر سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس عمر سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور ان کی عمریوں ہی گزرتی جا رہی ہے وہ گھاٹے میں ہیں۔

چار صفات:

اسی کو کہا گیا: وَالْعَصْرِ ، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ

(قسم ہے زمانے کی، بے شک انسان بڑے گھاٹے میں ہے)

انسان سے مراد نوع انسانی ہے۔ البتہ کون لوگ گھاٹے اور خسارے میں نہیں ہیں؟

جو چار کام کرتے ہیں، وہ گھاٹے اور خسارے میں نہیں ہیں:

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیے) گویا انہوں نے اپنی ذات کو ٹھیک کر لیا، کامل بن گئے، اپنے اندر کمال پیدا کر دیا۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (اور ایک دوسرے کو حق بات کی اور صبر کی نصیحت کریں) دوسروں کو حق بات اور صبر کی نصیحت کرنا، دوسروں کو درجۂ کمال تک پہنچانا ہے۔ خود کامل بنیں اور دوسروں کو کامل بنانے کے لیے محنت کریں، مکمّل بنیں۔ یہ چار صفتیں

جس کے اندر ہوں گی وہ خسارے میں نہیں ہے۔

......ہم خسارے سے نہیں بچ سکتے:

اس سے معلوم ہوا کہ خسارے سے بچنے کے لیے آدمی کا صرف اپنے طور پر کامل بن جانا کافی نہیں ہے۔ہم نے ایمان قبول کر کے اعمال صالحہ کا اہتمام کرلیا، اپنی زندگی ٹھیک کر لی؛ پھر بھی ہم گھاٹے سے نکلے نہیں ہیں۔گھاٹے سے نکلے ہوئے اس وقت کہلائیں گے جب دوسروں کی بھی اصلاح اور کمال کی فکر کریں گے۔ بالخصوص اپنے ماتحتوں اور جن پر ہمیں اقتدار و اختیارات حاصل ہیں، ان کو جب تک کامل و مکمل بنانے کی محنت نہیں کریں گے، حق کی نصیحت و وصیت نہیں کریں گے، تب تک ہم خسارے سے بچ نہیں سکتے۔

حق سے مراد عقائد حقہ اور اعمال صالحہ اور صبر سے مراد گناہوں سے بچنے کی تاکید ہے۔بعض حضرات نے حق سے مراد صرف عقائد حقہ، اور صبر سے اعمال صالحہ اور گناہوں سے بچنے کی تاکید دونوں کو شامل کرلیا ہے، یعنی یہ دونوں کام بھی ساتھ ہونے چاہیے۔جب تک یہ نہیں ہوگا تب تک آدمی اپنے آپ کو خسارے اور گھاٹے سے نہیں بچا سکتا۔اس سے معلوم ہوا کہ گھاٹے سے بچنے کے لیے صرف اپنے آپ کو ٹھیک کر لینا کافی نہیں ہے؛ بلکہ دوسروں کو کامل بنانے کے لیے محنت کرنا بھی ضروری ہے۔حق اور صبر کی وصیت اور گناہوں سے بچنے کی تاکید، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضروری ہے، اس کے بغیر آدمی اپنے آپ کو خسارے اور گھاٹے سے نہیں بچا سکتا۔

جب کوئی برائی دیکھے تو......

امر بالمعروف کے سلسلے میں آپ نے فضائل تبلیغ میں سنا ہوگا، بخاری شریف میں

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے: حضور ﷺ نے فرمایا: من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ. (تم میں سے کوئی آدمی جب کوئی غلط کام دیکھے، تو اس کو اپنے ہاتھ سے سدھارے) ومن لم یستطع فبلسانہ (جو اس کو ہاتھ سے روکنے اور سدھارنے کی طاقت نہیں رکھتا وہ اپنی زبان سے روکے) ومن لم یستطع فبقلبہ وذلک أضعف الإیمان. (اور جو ہاتھ سے بھی درست کرنے کی طاقت نہیں رکھتا وہ اپنے دل سے اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے)[1]

ہاتھ سے روکنے کا مطلب:

ہاتھ سے روکنے کی طاقت سے مراد یہ ہے کہ اس کو اقتدار حاصل ہو۔ علماء نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو لوگ صاحب اقتدار ہیں وہ اپنے ہاتھ سے برائیوں کو دور کرنے کا اہتمام کریں۔ صاحب اقتدار، مثلاً: بادشاہ وقت ہے، حاکم وقت ہے یا اس کے ماتحت مختلف علاقوں کے حکام، جن کو بادشاہ کی طرف سے حاکم بنایا گیا ہے، وہ اپنے اس اقتدار سے جس علاقے پر ان کو حکومت حاصل ہے، اس سے برائیوں کو دور کرسکتے ہیں، کوئی ان کو روکنے والا نہیں ہے۔ اگر ان کے پاس طاقت ہے، تو اس طاقت کے ذریعے سے وہ ان برائیوں کو دور کرسکتے ہیں۔ طاقت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فلاں برا کام کررہا ہے تو میں ڈنڈا لے کر جاؤں۔ نہیں! اگر آپ ڈنڈا لے کر جائیں گے، تو وہ آپ کے مقابلے پر آئے گا، اور پھر جھگڑے ہوں گے۔ شریعت نے ہاتھ سے دور کرنے کا حکم اسی کو دیا ہے جس کو اقتدار حاصل ہو۔

اقتدار کی مختلف شکلیں ہیں۔ بعض حضرات کو محدود اقتدار حاصل ہوتا ہے، جیسے اپنے

---

(۱) صحیح مسلم: ۴۹.

گھر میں ہم میں سے ہر ایک کو اپنی بیوی، اپنی اولاد اور اپنے ماتحتوں پر اقتدار حاصل ہے۔ اگر وہ کوئی برا کام کررہے ہیں تو ہم طاقت سے ان کو روک سکتے ہیں۔ وہاں یہ کام کرنا چاہیے، نہیں کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ اس کے علاوہ دوسروں کو وہی روکے جو صاحب اقتدار ہو، اقتدار نہ ہو تو وہاں دوسرا طریقہ ہے۔

ایمان کا کمزور درجہ:

ومن لم یستطع فبلسانه. زبان سے روکے۔ اگر ہم لوگوں کو برائی کرتا ہوا دیکھیں اور ہمارے پاس اقتدار نہیں ہے، تو ڈنڈا لے کر نہیں جائیں گے؛ بلکہ ان کو زبان سے روک دیں گے، ان چیزوں کی برائی ان کے سامنے بیان کریں گے، نیکی کا کام ہے تو اس کی اہمیت اور فضائل بیان کریں گے، اور اس پر عمل کرنے کے لیے آمادہ کریں گے۔ اس کے بعد وہ عمل نہ کرے تو ہماری جو ذمہ داری تھی وہ پوری ہوگئی۔ فبلسانه. اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو کہ زبان سے روکنے کی صورت میں سامنے والے کی طرف سے شدید اور ناقابل برداشت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں صرف دل سے برا سمجھے؛ لیکن یہ ایمان کا کمزور درجہ ہے۔

وصیت کے معنیٰ:

بہرحال! وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ میں بھلی باتوں کا حکم اور بری باتوں سے روکنا ہے۔ جس کو تواصي سے تعبیر کیا ہے۔ وصیت دراصل اس نصیحت کو کہتے ہیں جو آدمی موت کے وقت اپنے متعلقین کو کرتا ہے۔ وہ بڑی تاکید اور دل سوزی کے ساتھ کی جاتی ہے، بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ کی جاتی ہے، اس لیے اس کو وصیت سے تعبیر کیا گیا ہے،

تو گویا آپ بھی کسی کو بھلی بات کا حکم کریں تو اسی انداز سے کریں۔بھلی بات کا حکم کرنے میں بھی ہمارا طریقہ درست ہو۔

حق بات حق طریقے سے:

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ حق بات، حق نیت سے اور حق طریقے سے اگر کہی جائے تو کبھی نقصان نہیں کرتی۔ (اصلاحی خطبات ۸ / ۴۵)بعض لوگ یوں کرتے ہیں کہ میں بڑا ہوں، میری بزرگی ان کے سامنے ظاہر ہو، اپنی بڑائی ظاہر کرنے یا سامنے والے کو بے عزت کرنے والا انداز اختیار کریں تو یہ نیت درست نہیں ہے۔ نیت بھی درست ہے؛ لیکن اس کے لیے لوگوں کے ساتھ جو طریقہ اپناتا ہے، وہ اس انداز سے کہتا ہے کہ سننے والا اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہے،تو بہت سی مرتبہ یہ طریقہ ہی سامنے والے کو ضد پر آمادہ کرتا ہے ،وہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

بہرحال ! تینوں باتوں کا دھیان رکھنا چاہیے۔ بات بھی درست ہو، صحیح نیت سے کہنا چاہیے اور صحیح طریقہ سے کہنا چاہیے تو ان شاء اللہ کبھی نقصان نہیں ہوگا۔تو جو لوگ ایمان اور عمل صالح سے اپنے آپ کو کامل بنالیتے ہیں اور دوسروں کو کامل بنانے کے لیے آپس میں ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی نصیحت کرتے رہتے ہیں وہ البتہ گھاٹے میں نہیں ہیں۔ان کا استثناء کردیا گیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ تکاثر

(مؤرخہ ۹؍ربیع الاول ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۷ نومبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۝

اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ۝۲ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۝۳ ثُمَّ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۝۴ كَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡيَقِيۡنِ ۝۵ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيۡمَ ۝۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيۡنَ الۡيَقِيۡنِ ۝۷ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيۡمِ ۝۸

یہ سورۂ تکاثر ہے، مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

شانِ نزول:

اس کے شانِ نزول کے سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے تفسیر فتح

العزیز میں لکھا ہے کہ قریش کے دو بڑے قبیلے تھے: بنوعبد مناف اور بنوسہم۔ بنوعبد مناف سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق ہے، عبد مناف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبد المطلب کے دادا ہوتے ہیں۔ عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔ عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ اور دوسرا قبیلہ بنوسہم جس کا سردار عاص بن وائل سہمی تھا۔ ان دونوں خاندانوں میں ایک مرتبہ اپنی بڑائی، برتری اور اپنے فائق ہونے کے معاملے میں بحث ہوگئی۔ ہر ایک اپنی دولت اور ثروت کو بیان کر رہا ہے کہ ہمارے پاس اتنا مال ہے، اپنے کارناموں کو بیان کر رہا ہے، ہم نے اتنی شادیاں کیں، ہم نے ایسی مہمان نوازیاں کیں، اور ہم نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے۔ یہاں تک کہ آخر میں خاندان کے افراد کتنے ہیں؟ اس پر بات آئی۔ جب افراد شمار کیے گئے تو اس میں بنوعبد مناف کے افراد بنوسہم کے مقابلہ میں کچھ زیادہ تھے۔ تو بنوسہم نے یوں کہا کہ ہم چوں کہ بہادر لوگ ہیں، جنگوں میں ہمارے آدمی زیادہ مارے گئے، تو جو زندہ ہیں صرف ان کی گنتی نہیں؛ بلکہ جو جاچکے ہیں ان کی بھی گنتی ہونی چاہیے۔ چناں چہ قبرستان گئے، اِس کو گنو، اُس کو گنو، قبریں گنی جا رہی ہیں۔ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کی اس جہالت کو بیان کرنے اور ان کی اس غفلت کی مذمت کرنے کے لیے یہ سورت نازل کی گئی۔[1]

فضیلت:

اس کی فضیلت کے سلسلے میں مستدرک حاکم کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی کیا اس کی قدرت نہیں رکھتا کہ قرآن پاک کی ایک ہزار آیتوں کی تلاوت کر لے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا

---

(۱) تفسیر عزیزی ص: ۶۲۹، کتب خانۂ فیضِ ابرار، انکلیشور، گجرات۔

کہ اے اللہ کے رسول! اس کی تو کون قدرت رکھے گا کہ روزانہ ایک ہزار آیتیں تلاوت کرے!!! نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی آدمی سورۂ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ نہیں پڑھ سکتا؟ گویا جو اس کو پڑھے گا وہ قرآن پاک کی ایک ہزار آیتیں پڑھنے کے برابر سمجھا جائے گا۔[۱]

تکاثر کیا ہے؟:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ، حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ

تکاثر مال و دولت اور عیش و عشرت اور راحت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کو کہتے ہیں۔ آج کل دنیا میں ہر ایک کی کوشش یہی ہے کہ میں مال و دولت میں فلاں سے آگے نکل جاؤں، اس سے زیادہ مال حاصل کروں، اس سے زیادہ عیش و عشرت کے سامان مہیا کروں، اس سے زیادہ راحت کے اسباب جمع کروں۔ گویا دولت و ثروت، عیش و عشرت اور راحت کے اسباب حاصل کرنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ فلاں کا بنگلہ اتنا بڑا ہے میرا اس سے بڑا ہونا چاہیے۔ فلاں کی فیکٹری اتنی بڑی ہے میری فیکٹری اس سے بڑی ہونی چاہیے۔ فلاں کے پاس اتنی کاریں ہیں میرے پاس اس سے زیادہ کاریں ہونی چاہیے۔ فلاں کا بینک بیلینس اتنا بولتا ہے، یہ میلینر شمار ہوتا ہے، تو میں ٹریلینر بن جاؤں۔ وہ کروڑ پتی ہے تو میں ارب پتی بن جاؤں۔ یہی مقابلہ ہے اور پوری دنیا میں یہی چکر چل رہا ہے۔ اور اسی نے سارے انسانوں کو اپنی زندگی کے اصل مقصد سے غافل کر دیا ہے، ہٹا دیا ہے۔

---

(۱) المستدرک علی الصحیحین: ۲۰۸۱ وقال الحاکم رواۃ ھذا الحدیث کلھم ثقاۃ (ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت).

موت کا کوئی انکار نہ کر سکا:

دنیا کا نظام کئی صدیوں سے چل رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انسان پیدا ہوتا ہے، بچہ ہوتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے، پھر ادھیڑ عمر کو پہنچتا ہے، پھر بوڑھا ہوتا ہے، پھر مر کر قبر میں پہنچ جاتا ہے۔ بہت سے وہ بھی ہیں جو بڑھاپے کی عمر آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں؛ لیکن کیا آج تک کوئی ایک آدمی بھی ایسا نظر آیا جو یہاں آیا ہو اور ہمیشہ رہا ہو؟ موت نے اس کو اپنا شکار نہ بنایا ہو؟ ایسا کوئی آدمی ہے؟ نہیں ہے۔ سالہا سال ہو گئے، صدیاں بیت گئیں، دنیا کا ایک نظام چل رہا ہے؛ لیکن آج تک ایک آدمی بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا، جس کو دیکھ کر آپ یہ کہیں کہ یہ پانچ صدیوں سے، دس صدیوں سے دنیا میں ہے، پانچ ہزار سال ہو گئے یہ ابھی زندہ ہے، ایسا کوئی ہے؟ کوئی ایک آدمی بھی نہیں ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ . جو بھی اس دنیا میں آیا اس کو جانا ہے۔

اس قانون سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لوگوں نے بڑے بڑے حقائق کا انکار کیا۔ اللہ کے وجود کا انکار کیا، انبیاءؑ کی نبوت اور رسالت کا انکار کیا، قیامت کا انکار کیا، جنت و دوزخ کا انکار کیا؛ لیکن موت کا آج تک کوئی انکار نہیں کر سکا۔ سب کو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا کہ موت تو بہر حال آئے گی، کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہو۔ سبھی پر موت آنے والی ہے۔

بڑھ رہا ہے قافلہ جانب قضا کے ہر قدم:

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا سائنس دان اور بڑے سے بڑا انجومی کسی کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی موت کب آئے گی؟ آئے گی یہ

حقیقت ہے؛ لیکن کب آئے گی یہ معلوم نہیں ہے۔ ابھی آ سکتی ہے، کل آ سکتی ہے، ایک مہینے کے بعد آ سکتی ہے، ایک سال کے بعد آ سکتی ہے۔ آج تک سائنس دانوں نے کوئی ایسی تدبیر نہیں پائی جس کے ذریعہ سے کون کب تک زندہ رہنے والا ہے؛ یہ معلوم کر سکیں۔ کسی کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ہاں! یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ جو آیا ہے اس کو جانا ہے۔ معلوم ہوا یہ دنیا ہمیشہ رہنے کا گھر نہیں ہے۔ یہ منزل نہیں ہے، یہ سفر ہے۔ اگر منزل ہوتی تو دنیا میں ہمیں کچھ لوگ ایسے نظر آتے جو مستقل یہاں رہتے ہوں کہ یہ لوگ جب سے آئے ہیں گئے نہیں ہیں یہ دنیا ہی میں رہتے ہیں، معلوم یہ ہوا کہ دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔

ایک سفر کا سلسلہ ہے۔ دنیا میں کوئی آدمی سفر کرتا ہے، اگر وہ عقلمند اور صاحب ہوش و حواس ہو، تو اس کے سفر کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے کہ آپ سفر کر رہے ہیں تو کیوں کر رہے ہیں؟ تجارت کے لیے، اپنے اعزہ و اقارب کی ملاقات کے لیے، علم حاصل کرنے کے لیے، حج و عمرہ کرنے کے لیے، سیر و تفریح کرنے کے لیے۔ کوئی ایسا ہے جو سفر میں جا رہا ہو، اس کو پوچھا کہ تم سفر میں کیوں جا رہے ہو؟ کیا مقصد ہے؟ اور وہ یہ کہے کہ مجھے معلوم نہیں میرے سفر کا مقصد کیا ہے؟ اس کو لوگ بے وقوف کہیں گے؛ لیکن یہاں دنیا کا سفر جس کو ہم کر رہے ہیں ہمیں پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا مقصد کیا ہے؟ تو ہم اپنے مقصد سے غافل ہیں۔

اصل مقصد:

جس ذات نے ہمیں پیدا کیا، اور اس نے ہم کو اس دنیا کے سفر پر بھیجا، اس نے ہمیں کھول کھول کر بتلا دیا کہ تم کو دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ. (الذّٰریٰت:۵۶) بندگی کرنے کے لیے، یعنی تم اپنی زندگی ہماری مرضی کے مطابق

گزارو۔ تمہاری خواہشات کو، تمہاری سوچ کو، تمہاری مرضی کو اس زندگی میں دخل نہیں ہے۔ تمھیں زندگی ہماری مرضی کے مطابق گزارنی ہے، ہم جس طرح کہیں اس طرح کرو، جن چیزوں سے بچنے کا حکم کریں اس سے بچو۔ یہ باری تعالیٰ نے کھول کھول کر بتلا دیا ہے۔ گویا دنیا کے اس سفر کا مقصد بھی اس سفر پر بھیجنے والے نے بالکل صاف اور واضح کر دیا؛ لیکن جب اس دنیا میں آئے ہیں تو قدرت کی طرف سے ہی ہماری کچھ طبعی ضرورتیں ہمارے ساتھ لگا دی گئی ہیں۔ کھانا، پینا، راحت، آرام۔ اور ان ضرورتوں کو پورا کیے بغیر آدمی سکون نہیں پا سکتا ہے۔ کھانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے کچھ کام کاج، کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی؛ لیکن وہ بقدرِ ضرورت۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اللہ کے حکم کے مطابق اس کی بندگی میں گزاریں، اس کے بندے بن کر رہیں، اس کی مرضی کے مطابق چلیں۔ جن کاموں کا حکم دیا ہے ان کو کریں، جن سے بچنے کو کہا ہے ان سے بچیں۔ اصل تو یہی ہے۔

اِن کو مرنے پہ ہی جینے کا پتہ چلتا ہے:

لیکن اس دنیا کی طلب میں لوگ ایسے کھو گئے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے مقصد کو بھلا دیا، یہاں کیوں آئے ہیں؟ اپنے سفر کے اس مقصد کی طرف سے بالکل غافل ہو گئے۔ اور ایسے غافل، اور دنیا کی طلب میں ایسے مشغول ہو جاتے ہیں، کہ دنیا سے جانے کا وقت آ جاتا ہے، موت آ جاتی ہے وہاں تک یہ غفلت دور نہیں ہوتی۔ مرے، قبرستان پہنچے، اب اگر خیال آتا بھی ہے تو کیا؟ مقصدِ زندگی کو پورا کرنے میں جو غفلت اور کوتاہی ہوئی ہے، اس کی تلافی کا اب وقت نہیں رہا ہے۔ اسی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت میں بتلایا ہے۔

ترجمہ اور وضاحت:

اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ. (ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دنیا کا عیش حاصل کرنے کی ہوس نے تم کو غفلت میں ڈال دیا)۔ یعنی اس کو حاصل کرنے میں تم ایسے مشغول ہو گئے کہ دنیا میں کیوں آئے ہو؟ تمہیں دنیا میں کیا کرنا ہے؟ تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے؟ اس کی طرف سے تم غافل ہو گئے۔ آدمی نے اپنے مقصد زندگی کو بھلا دیا۔

حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ. (یہاں تک کہ تم قبرستان تک پہنچ جاتے ہو) یعنی یہ غفلت بھی ایسی کہ موت تک ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ مرنے کے بعد قبرستان پہنچ گئے۔ اب اگر غفلت دور ہو تو بھی کیا فائدہ؟

كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ. (ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے، تمہیں عنقریب پتہ چل جائے گا) یعنی ایسی غفلت میں پڑنا نہیں چاہیے۔ اپنی زندگی کے مقصد کو بھلانا نہیں چاہیے۔ یعنی جب موت آئے گی اور قبر میں پہنچو گے تب تم کو پتہ چل جائے گا۔

ثُمَّ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ (پھر سن لو! یعنی ہرگز تم کو ایسا کرنا نہیں چاہیے، تمہیں عن قریب پتہ چل جائے گا)۔ جب میدان حشر میں پہنچو گے تب پتہ چل جائے گا۔ قبر میں جانا ہے، میدان حشر میں پہنچنا ہے یہ دور نہیں ہے۔ یہ قریب ہے۔ كل ما هو آت قريب. (جو آنے والی چیز ہے وہ قریب ہی ہے)[1] ابھی ہمیں دور نظر آتی ہے؛ لیکن حقیقت میں دور نہیں ہوتی، وقت گزر جاتا ہے۔

كَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡيَقِيۡنِ. (ہرگز نہیں! اگر تم یقینی علم کے ساتھ یہ بات جانتے)

---

(۱) روى البيهقي في الأسماء والصفات عن ابن شهاب مرسلاً: ٣٢٦، ط: مكتبة السوادي، جدة.

تمہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ ہمیں آخرت میں جانا ہے تو کبھی بھی ایسی غفلت سے کام نہ لیتے، ان چیزوں میں مشغول نہ ہوتے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ. (ضرور بالضرور تم دوزخ کو دیکھو گے) یعنی موت کے بعد جب میدانِ حشر میں پہنچیں گے، تو باقاعدہ دوزخ لائی جائے گی، اور سب لوگ دوزخ کی زیارت کریں گے، اس کو دیکھیں گے۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ. (اور پھر یقین جانو! کہ تم اسے بالکل یقین کے ساتھ دیکھ لوگے)۔

عین الیقین اور حق الیقین:

عین الیقین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے متعلق کوئی معتبر آدمی خبر دے تو اس کا علم اور جانکاری یقینی ہوتی ہے، پھر اگر اسی چیز کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، تو اس کو عین الیقین کہتے ہیں۔ اور اس کا تجربہ بھی ہوجائے تو اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی ہمیں یوں کہے کہ آگ جلاتی ہے۔ کہنے والا ہمارے نزدیک معتبر ہے، وہ جب یوں کہے گا کہ آگ جلاتی ہے تو اس کے کہنے سے ہمیں ایک علم حاصل ہوا۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ آگ نے ہمارے سامنے کسی کو باقاعدہ جلا بھی دیا، تو جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ عین الیقین کہلائے گا۔ اس کے بعد پھر کسی نے ہماری انگلی آگ میں ڈال دی، یا ہم پر کسی نے آگ ڈال دی اور اس کی وجہ سے ہم کو جلنے کا احساس ہوا، تو اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تم باقاعدہ اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو تمہیں اس کا عین الیقین حاصل ہوجائے گا۔ کہ تم جہنم کو دیکھو گے، یعنی صرف علم اور جانکاری نہیں؛ بلکہ تم اس کی

حقیقت کو دیکھو گے۔

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ.(پھر تم اس دن نعمتوں کے بارے میں سوال کیے جاؤ گے) یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اللہ کی نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ تم نے اللہ کی جو نعمتیں استعمال کی ہیں اللہ تعالیٰ کو اس کا باقاعدہ حساب دینا پڑے گا۔

تیرا مال تو وہی ہے……:

حضرت عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو میں نے سنا کہ نبی کریم ﷺ سورۂ تکاثر کی تلاوت فرما رہے ہیں، جب تلاوت پوری کر چکے، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: يقول ابن أدم: مالي مالي (انسان کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال) تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے کھا کر کے ختم کر دیا، یا پہن کر کے پرانا کر دیا، یا اللہ کے راستے میں خرچ کر کے اپنے لیے آخرت میں جمع کرا دیا۔ باقی سب کچھ دوسروں کا ہے، وہ ختم ہونے والا ہے۔[۱] آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میرا مال؛ لیکن جب موت آتی ہے تب یہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے، وہ دوسروں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ پوری زندگی سب کو یہ کہتا رہا کہ میرا مال، اس کا کچھ نہیں تھا، وہ تو صرف اس کا چوکیدار تھا، مال تو دوسرے کے پاس گیا، یہ تو اس کی حفاظت کرتا رہا۔ اپنا تو وہی ہے جو خود کھا کر ختم کرے، یا پہن کر پرانا کر لے یا اللہ کے راستے میں خرچ کر کے اپنے لیے آخرت میں جمع کر لے۔

اس کا منہ قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے:

اسی طرح بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: نبی کریم ﷺ کا ارشاد

(۱) المستدرک علی الصحیحین: ۳۹۲۹، (ط: دار الکتب العلمیة، بیروت).

ہے: آدمی دنیا حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، انسان کو اگر ایک وادی (وادی) (دو پہاڑیوں کے درمیان کی ہموار زمین) سونے سے بھری ہوئی مل جائے تو أحب أن يكون له واديان. ایک پر اس کو صبر نہیں ہوتا، وہ چاہتا ہے ایسی دو وادیاں مل جائیں۔ حالاں کہ یہ ایک وادی جو سونے سے بھری ہوئی ہے اس کی کئی نسلوں تک کام دے سکتی ہے؛ لیکن آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ اس وقت میرے پاس جو مال ہے میری کئی پیڑھیاں اس سے اپنی ضرورتیں پوری کر سکتی ہیں، پھر مجھے اب دوسرا مال حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن نہیں! اس کی حرص کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ولن يملأ فاه إلا التراب. (اور آدمی کا منہ تو قبر کی مٹی ہی بھرتی ہے) دوسرا کوئی نہیں بھرتا۔ ويتوب الله على من تاب، ہاں آدمی توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتے ہیں۔ گویا آدمی کے حرص کی کوئی انتہا نہیں۔[1]

حرص کی انتہا نہیں:

ایک آدمی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تو بہت کم سے پوری ہو جاتی ہے۔ ایک آدمی پیاسا ہے، پیاس کو ختم کرنے کے لیے ایک گلاس پانی کافی ہے، سیراب ہو جائے گا۔ بھوکا ہے، اس کی بھوک کو دور کرنے کے لیے دو یا تین روٹیاں کافی ہیں، شکم سیر ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہوس اور حرص ہے، جیسے لوگوں کو مال اور دولت کی حرص پیدا ہو جاتی ہے اس کی تو کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ جتنا آتا ہے وہ کم ہے۔ یہی نعرہ لگاتا ہے کہ هل من مزيد؟ مجھے اور مل جائے۔ اور اس کی یہ حرص ختم ہی نہیں ہوتی ہے۔

---

(۱) صحیح البخاري: ۶۴۳۹.

غفلت کو دور کرنے کی ضرورت ہے:

مال اور جاہ دونوں کا یہی حال ہے۔یعنی رتبہ حاصل کرنے کی ہوس ۔اسمبلی کا ممبر (ધારાસભ્ય) بن گیا،تو پھر آگے یوں تمنا کرے گا کہ وزیر (પ્રધાન) بن جاؤں۔وزارت مل گئی،تو پھر یوں سوچے گا کہ میں وزیر اعلیٰ (મુખ્ય પ્રધાન) بن جاؤں۔اور جب وزیر اعلیٰ (મુખ્ય પ્રધાન) بن گیا،تو پھر یوں سوچے گا کہ میں وزیر اعظم (વડા પ્રધાન) بن جاؤں۔ گویا اس کی حرص اور طمع کی کوئی انتہا نہیں ہوگی،وہ سلسلہ آگے چلتا ہی رہتا ہے۔اور اسی حرص اور طمع کو حاصل کرنے میں زندگی ختم ہوجاتی ہے،قبر میں پہنچ جاتا ہے اور اس کو خیال بھی نہیں رہتا۔پوری زندگی یہی غفلت طاری رہتی ہے۔اسی کو اللہ تعالیٰ دور کرنا چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر عیش وعشرت اور راحت،دولت وثروت حاصل کرنے نے تم کو آخرت کی طرف سے غفلت میں ڈال دیا ہے،اپنی اس غفلت کو دور کرنے کی ضرورت ہے، اسی پر تنبیہ کی گئی کہ تم کو قبر میں جانا ہے،حشر میں جانا ہے،جب وہاں پہنچ جاؤ گے تو پتہ چلے گا: لیکن وہاں پہنچنے کے بعد تمہارے لیے اس کی تلافی کا کوئی موقع نہیں رہے گا کہ اب کچھ کر سکیں۔کر سکنے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

تندرستی،ہزار نعمت:

اور پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں نعمتوں کے متعلق سوال ہوگا۔ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے،حضور ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز سب سے پہلے بندے سے جس چیز کا حساب ہوگا وہ اس کی تندرستی ہے۔باری تعالیٰ کی طرف سے سوال ہوگا کہ کیا

ہم نے تم کو تندرستی نہیں دی تھی؟ کیا ہم نے تم کو ٹھنڈا پانی نہیں پلایا تھا؟[۱] اور تندرستی صرف ایک نعمت نہیں ہے، ہزاروں نعمتیں ہیں۔ ہمارے جسم میں تنے اعضا ہیں؟ آنکھ ہماری ٹھیک ہے، کان ہمارے ٹھیک ہیں، زبان ہماری ٹھیک ہے، ناک ہماری ٹھیک ہے، ہاتھ ہمارے ٹھیک ہیں، ہمارا دل کام کررہا ہے، دماغ صحیح ہے، کڈنی کام کررہی ہے، پیر چل رہے ہیں، ہاتھ اپنا کام کررہے ہیں۔ جسم کے بے شمار اعضا ہیں، ہر ہر عضو اپنی ڈیوٹی پوری کررہا ہے، یہ سب کیا ہے؟ تندرستی ہی تو ہے!!! تندرستی کہنے کو تو ایک نعمت ہے؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو بے شمار نعمتیں ہیں۔ اس میں سے ذرا آگے پیچھے ہو جائے، جیسے کسی کی کڈنی خراب ہوگئی پھر دیکھو کیا ہوتا ہے؟ دل کا دورہ پڑ گیا، دیکھو کیا ہوتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری تندرستیاں عطا فرمائی ہیں، وہ کہنے کو تو ایک نعمت ہے؛ لیکن سوچو گے اور گنو گے تو ہزاروں نعمتیں ہیں۔ اسی لیے گجراتی میں ایک کہاوت ہے: ایک تندرستی، ہزار نعمت۔ واقعہ یہی ہے کہ دکھنے میں تو ایک ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں۔

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں:

شمائل میں واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر سے دوپہر میں ایسے وقت پر نکلے جو عام طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر سے نکلنے کا وقت نہیں تھا، اور کوئی آدمی ملاقات کے لیے بھی اس وقت نہیں جاتا تھا، جب باہر تشریف لائے تو حضرت ابوبکرؓ کی ملاقات ہوگئی کہ کیا بات ہے؟ تو کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کے دیدار اور آپ کی ملاقات۔ اصل میں ان کو فاقہ تھا، اور بھوک سے بے چین ہو کر نکلے تھے؛ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور کو دیکھ کر وہ اپنی بھوک بھول گئے اور یہ کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کی

---

(۱) سنن الترمذي: ۳۳۵۸.

زیارت اور آپ کی ملاقات۔ پھر حضرت عمرؓ پہنچ گئے، حضرت عمرؓ کو حضور ﷺ نے پوچھا: اے عمر! کیا بات ہے؟ تو کہا: اے اللہ کے رسول! بھوک کا احساس ہے۔ شدت سے بھوک لگی ہوئی ہے، کھانے کو کچھ نہیں تھا، بے چین ہو کر گھر سے باہر نکلا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں بھی کچھ بھوک محسوس کر رہا ہوں۔ کہا کہ چلو! ابوالہیثم بن التیہان، ایک انصاری صحابی ہیں جو بیعت عقبہ میں شریک ہوئے، اور جن لوگوں کو نبی کریم ﷺ نے نقیب بنایا تھا، یہ ان میں سے ہیں۔ باغات والے آدمی تھے، حضور اکرم ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے۔ ان کی بیوی سے پوچھا کہ کہاں ہیں؟ تو کہا کہ وہ ٹھنڈا پانی لینے گئے ہیں۔ ابھی تو بات ہو رہی تھی اتنے میں وہ پہنچ گئے، دیکھا کہ حضور ﷺ میرے گھر؟ بس کیا کہنا تھا!!! وہ مشکیزہ نیچے رکھا اور لپٹ گئے۔ اور کہنے لگے اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان! میری قسمت ایسی کہاں کہ میرے گھر آپ؟ پھر حضور ﷺ کو اپنے باغ میں لے گئے اور چادر بچھا کر ان تینوں حضرات کو وہاں بٹھایا۔ اور جلدی سے کھجور کا ایک بڑا خوشہ توڑ کر لائے، اور ان کے سامنے رکھ دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: پورا خوشہ کیوں توڑ کر لائے؟ خوشے میں تو پکی کھجوریں بھی ہوتی ہیں، ادھ پکی ہوئی بھی ہوتی ہیں، کچی بھی ہوتی ہیں۔ تو پکی پکی توڑ کر لاتے!!! انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں اس لیے پورا خوشہ توڑ کر لایا کہ لوگوں کی چاہت اور ذوق مختلف ہوتا ہے، کسی کو پکی اچھی لگتی ہیں، کسی کو ادھ پکی اچھی لگتی ہیں، کسی کو کچی کھانے میں لطف آتا ہے، تو میں پورا خوشہ اسی لیے توڑ کر لایا تا کہ آپ کو جیسی پسند ہو وہ کھائیں۔ حضور ﷺ نے ان کی اس سوچ کی تعریف فرمائی، دعا دی، پھر وہ پانی لائے۔

جب ان حضرات نے کھجوریں کھائیں اور پانی پیا تو نبی کریم ﷺ نے فوراً فرمایا:

هذا والذي نفسي بيده من النعيم التي تسئلون عنه يوم القيامة (اللہ کی قسم! یہ ان نعمتوں میں سے ہے جس کے متعلق قیامت کے روز سوال ہوگا) ظل بارد و رطب طیب و ماء بارد (ٹھنڈی چھاؤں اور تازہ، عمدہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی)[1] حالاں کہ یہ چیزیں کئی روز کی بھوک کے بعد ملی تھیں، پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گویا متوجہ کر رہے ہیں کہ اللہ کی ان نعمتوں کا سوال ہوگا۔

پانچ سوالات:

ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے: لا تزول قدم ابن أدم يوم القيامة من عند ربه حتى يسئل عن خمس (قیامت کے روز انسان کے قدم اللہ کے حضور سے ہٹ نہیں پائیں گے یہاں تک کہ پانچ چیزوں کے متعلق سوال ہوگا)۔

عن عمره فيم أفناه (تم نے اپنی زندگی کہاں ختم کی؟)

وعن شبابه فيم أبلاه (جوانی کے ان ایام کو کہاں پرانا کیا؟)

وماله من أين اكتسبه وفيم أنفقه (مال کے متعلق سوال ہوگا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟)

مال کے متعلق دو سوال ہوں گے۔ کن طریقوں سے کمایا؟ ناجائز طریقوں سے تو نہیں کمایا؟ پھر اگر جائز طریقے سے کمایا ہے تو کہاں خرچ کیا؟ جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کی اجازت اور حکم دیا ہے وہاں یا دوسری جگہ؟ بعض لوگ حلال طریقے سے کما کر بھی فضول خرچی کرتے ہیں اور ان کو تنبیہ کی جاتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ میں نے حلال طریقے سے کمایا ہے، میرا مال ہے جس طرح چاہوں استعمال کروں۔ نہیں! اللہ تعالیٰ نے جہاں خرچ

---

(۱) صحيح مسلم: ۲۰۳۸ و الشمائل المحمدية للترمذي: ۳۶۱.

کرنے کا حکم دیا ہے وہیں خرچ کر سکتے ہیں، دوسری جگہ نہیں۔ اور ضرورت سے زائد بھی نہیں فضول خرچی کی اجازت ہی نہیں ہے۔

پیپر آؤٹ ہو گیا ہے:

وماذا عمل فیما علم؟ اور جو علم حاصل ہوا، دین کی جو جانکاری ملی اس پر تم نے کتنا عمل کیا؟[۱] یہ دین کی باتیں جو ہم سنتے ہیں ان کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ اس کے سننے کے بعد آپ نے اس پر کتنا عمل کیا؟ گویا سوال پیپر آؤٹ ہو گیا ہے۔ دنیا کے امتحان میں اگر ذمہ داروں کو پتہ چلے کہ سوال پیپر آؤٹ ہوا تھا تو دوسرا امتحان دلواتے ہیں۔ یہاں تو اللہ تعالیٰ نے سوال پیپر پہلے سے آؤٹ کر دیا ہے، جواب وہاں دینا ہے۔ یہاں اگر اس پر عمل کرو گے تو جواب دے سکو گے۔

تین دفتر:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز جب انسان کو اللہ کے حضور حساب کتاب کے لیے پیش کیا جائے گا تو ساتھ میں تین دفتر (રોજનામચા) بھی فرشتے پیش کریں گے۔ (۱) ایک دفتر میں اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا تذکرہ ہوگا جو اس نے زندگی بھر استعمال کی ہوں گی۔ ہم پیدا ہوئے تب سے لے کر مرنے تک کتنے گلاس پانی پیا؟ ہمیں تو حساب بھی معلوم نہیں ہے۔ کتنی سانس لی؟ ہوا کے ذریعے ہم نے سانس لی تھی، اور اپنی زندگی باقی رکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی ہوا کو سانس میں لینے میں کتنا استعمال کیا؟ سورج کی کتنی روشنی استعمال کی؟ پیدا ہونے سے لے کر موت تک اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی

---

(۱) أخرجه الترمذي: ۲۴۱۶.

نعمتیں بندہ استعمال کرتا ہے وہ سب اس دفتر میں درج ہوں گی۔ چھوٹی چھوٹی نعمتیں بھی ہوں گی۔ (۲) دوسرے دفتر میں اس کے نیک اعمال کا تذکرہ ہوگا۔ اس نے پوری زندگی کتنی نمازیں پڑھیں؟ کتنے روزے رکھے؟ کتنے حج اور عمرے کیے؟ کتنے قرآن ختم کیے؟ کتنی تسبیحات پڑھیں؟ زندگی بھر کے سارے نیک کام اس دفتر میں درج ہوں گے۔ (۳) تیسرے دفتر میں اس کے گناہوں کا تذکرہ ہوگا۔ یہ تین دفتر ہوں گے۔ اور انسان کو فرشتے اللہ کے سامنے پیش کردیں گے کہ اس کا حساب لے لو۔

......ابھی میری قیمت وصول نہیں ہوئی:

اس وقت نعمتوں کے دفتر میں اللہ کی سب سے چھوٹی اور سب سے کم درجے کی جو نعمت ہوگی، اس نعمت سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کے نیک اعمال میں سے تو اپنی قیمت وصول کرلے۔ چناں چہ وہ نعمت آگے بڑھے گی اور اس کے سارے نیک اعمال کو لے کر ایک طرف کھڑی ہوجائے گی۔ اور کہے گی: اے میرے رب! تیری عزت کی قسم! اس کے تمام نیک اعمال میں نے لے لیے، پھر بھی ابھی میری قیمت وصول نہیں ہوئی، اور ابھی تو گناہ بھی باقی ہیں اور نعمتیں بھی۔ پس جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر رحم کرنے کا ارادہ کریں گے، تو کہیں گے: اے میرے بندے! میں نے تیری نیکیوں کو دوگنا کردیا، اور تیری خطاؤں سے درگذر کیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرا گمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ فرمائیں گے) میں نے اپنی نعمتیں تجھے (بغیر کسی عملِ صالح کے) ہبہ کردیں۔[۱] اللہ کی ایک ایک نعمت ایسی ہے

(۱) الآثار لأبي يوسف: ۱/۲۰۴ [۹۱۵] (ط: دار الكتب العلمية) و مسند البزار: ۱۳/۹۹ [۲۴۲۲] (ط: مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة) و المجالسة وجواهر العلم للدينوري المالكي: ۱/۲۹۱ [۵] (ط: جمعية التربية، بحرين و دار ابن حزم، بيروت) و مسند أبي حنيفة رواية أبي نعيم: ۱/۲۰۲ (ط: مكتبة الكوثر، الرياض) و الترغيب والترهيب للمنذري: ۵۴۴۹ (ت. إبراهيم شمس الدين).

کہ ہماری پوری زندگی کی عبادتیں اس نعمت کی قیمت ادا نہیں کرسکتیں۔

میرے فضل سے جنت میں جا:

حضرت قاری محمد طیب صاحب ؒ کے خطبات میں یہ قصہ ہے، اور حضرت کی زبانی میں نے خود بھی سنا ہے (حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ابھی میرے خلیل حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے پاس سے تشریف لے گئے اور کہا کہ اے محمد! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق لے کر مبعوث کیا) کہ بنو اسرائیل میں ایک آدمی تھا، اس نے پانچ سو (۵۰۰) سال سمندر میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر اللہ کی عبادت کی...... وہاں اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے پانی کا ایک چشمہ جاری کر دیا، اور انار کا ایک درخت اگا دیا۔ چناں چہ وہ اس سے اپنی بھوک و پیاس پوری کرتا تھا، پھر اس نے تمنا کی کہ میری موت اس حالت میں آئے کہ میں سجدے میں ہوؤں؛ تاکہ اسی حالت میں رہوں۔ چناں چہ اسی حالت میں موت بھی آئی۔ مرنے کے بعد جب اسے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہیں گے کہ میرے فضل سے اس کو جنت میں لے جاؤ۔ تو وہ کہے گا: میرے رب! میرے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل کیجیے، چناں چہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور اس کے اعمال میں تقابل کا حکم دیں گے، تو صرف بصارت کی نعمت ہی پانچ سو سال کی عبادت کا احاطہ کرلے گی۔ جب کہ ابھی مکمل جسمانی نعمت کا کوئی حساب نہیں ہوا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے بندے کو جہنم میں داخل کرو، چناں چہ اسے جہنم کی جانب کھینچا جائے گا، تو وہ کہے گا: اپنی رحمت سے جنت میں داخل کیجیے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اس کو میرے سامنے حاضر کرو، چناں چہ اسے اللہ کے حضور پیش کیا

جائے گا، اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تجھے کس نے پیدا کیا؟ جب کہ تیرا وجود نہیں تھا، تو وہ کہے گا: میرے رب! تو نے ہی پیدا کیا، پھر اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تجھے پانچ سو سال عبادت کی قوت کس نے دی؟ وہ کہے گا: تو نے ہی اے میرے رب! تجھے سمندر میں پہاڑ پر کس نے ٹھکانہ دیا؟ اور کس نے تیرے لیے شور پانی سے خوش گوار پانی کا انتظام کیا؟ اور کس نے ہر رات تیرے لیے انار کا انتظام کیا؟ حالاں کہ انار درحقیقت سال میں ایک ہی مرتبہ اگتا ہے، پھر تجھے سجدے کی حالت میں موت کس نے دی؟ وہ کہے گا: تو نے ہی اے میرے رب! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: یہ سب میری رحمت کا کرشمہ ہے اور میری رحمت سے میں تجھے جنت میں داخل کرتا ہوں، پھر اللہ تعالیٰ حکم دیں گے کہ میرے بندے کو جنت میں داخل کرو (اور فرمائیں گے) تو بہت اچھا بندہ تھا، پس اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) اسے جنت میں داخل کریں گے۔[1]

تو یہاں بھی ان تین دفتروں میں سے نعمت والے دفتر کی چھوٹی نعمت سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو اپنی قیمت وصول کر لے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ نعمت اس کی زندگی کی ساری عبادتوں کو لے لے گی، اور ایک طرف کھڑی ہو جائے گی۔ باری تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ کیا بات ہے؟ تو وہ کہے گی کہ میں نے اس کی ساری عبادتیں لے لی ہیں، پھر بھی میری قیمت وصول نہیں ہوئی ہے۔ وہ آدمی سوچے گا کہ مَرے۔ ابھی تو ایک چھوٹی سے چھوٹی نعمت کی قیمت ادا نہیں ہوئی۔ زندگی بھر باقی ساری نعمتیں استعمال کیں ان کا کیا ہوگا؟ اور اب عبادتیں تو ختم ہو گئیں!!! اب تو گناہ رہ گئے!!! اب تو جہنم میں جانے کا موقع آئے گا!! باری تعالیٰ اپنے جس بندے پر اپنا فضل کرنا چاہیں گے، اس سے فرمائیں گے کہ جا! میں

---

(۱) رواہ الحاکم فی المستدرک فی کتاب التوبۃ والإنابۃ: ۷۶۳۷ (ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت).

نے تیری نیکیاں ڈبل کر دیں، اور میں تجھ سے اپنی نعمتوں کا حساب نہیں لیتا، اور میں نے تیرے گناہ معاف کر دیے۔ اس کا بیڑا پار ہو جائے گا۔

خلاصۂ کلام:

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے روز ان نعمتوں کا سوال ہوگا۔ ہم ان نعمتوں کو بے دردی کے ساتھ اور غفلت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ کبھی بھول سے بھی خیال نہیں آتا کہ ہمیں کل کو ان کا جواب دینا پڑے گا۔

اس سورت میں باری تعالیٰ نے ہم جو دنیا کی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اس کا علاج بتلایا ہے۔ علاج میں دو چیزیں ہیں: (۱) جہنم کا خوف (۲) اللہ کی نعمتوں کے حساب کا یقین۔ اگر آدمی دل میں اس بات کا یقین رکھتا ہو کہ مجھے اللہ کی ان نعمتوں کا کل اللہ کو جواب دینا ہے، اور جہنم پر پیش ہونا ہے تو کبھی بھی وہ غفلت میں نہیں رہے گا۔ ہمیں اپنی زندگی کی غفلت کو دور کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں اس کا استحضار ہو۔ ہم دنیا کی زیادتی حاصل کرنے کے لیے دوڑ لگا رہے ہیں؛ حالاں کہ ہماری ضرورتیں تو اس سے کم میں پوری ہو جاتی ہیں۔ لٰہذا ضرورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس سے بچائیں۔ یہی اس سورت کا سبق ہے۔

اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۂ قارعۃ

(قسط-۱)

(مؤرخہ ۷ ربیع الآخر ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۵ دسمبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۝

اَلۡقَارِعَةُ ۝۱ مَا الۡقَارِعَةُ ۝۲ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ۝۳ يَوۡمَ يَكُوۡنُ النَّاسُ كَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ۝۴ وَ تَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَ اَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا هِيَهۡ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱

وجہ تسمیہ:

یہ سورۂ القارعة ہے، اس کا پہلا ہی کلمہ القارعة ہے، اس لیے اس کو القارعة سے موسوم کیا گیا۔

قرآن پاک کے آخری دو پاروں (۲۹/اور ۳۰) کی اکثر سورتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قیامت کے خوفناک حالات کا تذکرہ کیا ہے، قیامت آئے گی اور وہ کس طرح آئے گی؟ پھر جنت کا اور وہاں کی راحتوں کا، جہنم کا اور وہاں کے عذاب کا بڑا تفصیلی تذکرہ فرمایا ہے۔

جرائم ومظالم سے روکنے والی:

آخرت کا فکر ہی ایک ایسی چیز ہے جو دنیا میں آدمی کو اللہ کے حکم کے مطابق چلنے پر آمادہ کرنے والا ہے۔ اگر دل ودماغ پر یہ فکر چھا جائے کہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کا جواب دینا ہے، تو اس کی زندگی شریعت کے مطابق گزرتی ہے۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ آدمی کے دل ودماغ پر آخرت کا فکر غالب ہو۔ یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو جرائم اور مظالم سے روکنے والی ہے۔

غفلت؛ جرائم ومظالم کا اصل محرک:

دنیا میں جرائم اور مظالم کا سلسلہ کیوں ہے؟ لوگوں نے اس کے اسباب کے متعلق بڑی فلسفیانہ باتیں پیش کی ہیں۔ بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان جرائم کی اصل وجہ جہالت ہے۔ اگر تعلیم کو عام کیا جائے تو جرائم کا سلسلہ بند ہوسکتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے وہ ممالک جہاں صد فی صد تعلیم ہے، وہاں بھی اسی طرح جرائم ہو رہے ہیں جیسے دوسرے ممالک میں۔ اگر ان جرائم کی وجہ جہالت اور تعلیم کا فقدان ہوتا، تو وہاں سے جرائم کا خاتمہ ہوجانا چاہیے تھا؛ لیکن ایسا نہیں ہے۔

بعض حضرات جرائم کی وجہ ''غربت'' کہتے ہیں۔ غربت کی وجہ سے آدمی مال حاصل

کرنے کے لیے نئے نئے طریقے اپناتا ہے، جرائم کا ارتکاب کرتا ہے، مظالم کا شکار ہوتا ہے۔ اگر غربت کو ختم کر دیا جائے تو جرائم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جن ممالک کی انفرادی آمدنی فی صد کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہے، وہاں اِن جرائم میں کوئی کمی نہیں؛ بلکہ دوسرے ممالک کے مقابلے میں وہاں جرائم کی مقدار زیادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ غربت بھی جرائم کا اصل سبب نہیں ہے۔

اصل سبب آدمی کا آخرت کو بھلا دینا ہے۔ آدمی کی طبیعت پر آخرت کی جانب سے جو غفلت غالب آجاتی ہے اس کے نتیجے میں وہ ان ساری برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر کسی کے دل میں آخرت کا خوف ہو، آخرت کا فکر ہو، دل ودماغ پر یہی چیز غالب ہو کہ مجھے مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، اپنے کرتوت اور اعمال کا جواب دینا ہے، تو وہ چیز آدمی پر بندش لگاتی ہے اور پہرہ بٹھاتی ہے۔ اور اس طرح یہ فکر آدمی کو غلط کام کرنے جرائم ومظالم، بدعنوانیوں وبداخلاقیوں کے ارتکاب سے بچا لیتی ہے۔ اگر آدمی زیادہ پڑھا ہوا نہیں ہے، ان پڑھ ہے؛ لیکن اس کے دل میں آخرت کا فکر ہے، تو یہی چیز اس کو تنہائیوں میں بھی گناہ اور ظلم کا ارتکاب کرنے سے روکے گی۔

فأين الله . . . فأين الله:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ کی جانب سفر کر رہے تھے، راستے میں ایک جگہ آپ نے شب باشی کی، وہاں ایک چرواہا پہاڑ سے آپ کے پاس آیا، آپ نے اس سے پوچھا کہ تیرے پاس بکریاں ہیں؟ اس نے کہا: جی! آپ نے فرمایا: ایک بکری مجھے بیچ دے، وہ کہنے لگا: میں غلام ہوں (یہ بکریاں میرے آقا کی ہیں) آپ نے فرمایا: آقا سے

کہہ دینا کہ بھیڑیا بکری کھا گیا، تو وہ غلام چرواہا کہنے لگا: فأين الله؟؟؟ (کیا یہ بات اللہ سے مخفی رہ سکتی ہے) حضرت عبداللہ بن عمرؓ یہ جملہ دہراتے رہتے تھے: فأين الله...... فأين الله...... اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ فأين الله تو مجھے کہنا چاہیے تھا، پھر جب آپ مدینہ منورہ لوٹے، تو آپ نے اس کے آقا کو کہلا بھیجا اور غلام خرید لیا، اور بکریاں بھی خرید لیں۔ پھر غلام کو آزاد کر کے ساری بکریاں اسے ہبہ کر دیں۔[۱] جب آدمی کے دل میں یہ فکر پیدا ہو جائے، تو چاہے کوئی نگرانی کرنے والا نہ ہو، یہ فکر ہی بہت بڑا پہرہ ہے جو اس کو ہر قسم کے گناہوں اور بداخلاقیوں سے، مظالم سے، جرائم سے روک سکتا ہے۔ وہاں کسی دوسری تعلیم کی ضرورت نہیں کہ جس کا اس کے پاس سرٹیفکیٹ ہو۔ اور غربت کی حالت میں بھی یہ فکر ہی روکے گی۔ اس چرواہے کے پاس کون سا مال تھا؟ غربت کی حالت میں بھی وہ آدمی اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچاتا ہے۔

منہ دل بر...... ناپائیدار:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں آخری دونوں پاروں کی اکثر سورتوں میں قیامت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا کہ اللہ نے ہمیں جو دنیا کی زندگی عطا فرمائی ہے وہ دائمی نہیں ہے، بلکہ دنیا میں آخرت کی تیاری کے لیے چند دنوں کے واسطے بھیجا ہے، آزمائش کے لیے بھیجا ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۨ الَّذِيْ خَلَقَ

---

(۱) الزهد لأبي داود: ۱/۲۶۲ [۲۹۳] (ط: دار المشكاة، حلوان) وقصر الأمل لابن أبي الدنيا: ۱/۱۲۸ (ط: دار ابن حزم، بيروت) والمعجم الكبير للطبراني: ۱۲/۲۶۳ [۱۳۰۵۴] (ط: مكتبة ابن تيمية، القاهرة) والشعب الإيمان للبيهقي: ۷/۲۲۳ [۴۹۰۸].

نوٹ: امام بیہقیؒ کی شعب الایمان میں یہ واقعہ بالتفصیل قدرے فرق کے ساتھ مذکور ہے۔

الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ (الملك: ۱،۲) موت اور زندگی اللہ نے اس لیے پیدا کی کہ اللہ آزمانا چاہتے ہیں کہ تم میں کون اچھے اعمال کرنے والا ہے؟ یہ دنیا کی زندگی اسی آزمائش کے لیے ہمیں دی گئی ہے، یہ ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ چیز ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہیے کہ اللہ نے ہمیں یہاں زندگی گزارنے کے اسباب بھی دیے، راحت وآرام کی شکلیں بھی دیں؛ لیکن یہ چیزیں ہمیشہ کی نہیں ہیں۔ آدمی یہاں آکر آخرت سے غافل ہوکر اس بات کی کوشش میں رہتا ہے کہ میں کسی طرح زیادہ سے زیادہ راحت وآرام کے اسباب مہیا کرلوں، اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھالوں۔ اور وہ آخرت کی طرف سے غافل ہوجاتا ہے۔ حالاں کہ یہ پتا نہیں کہ دنیا کی زندگی کب تک ہے؟ جو لوگ دنیا سمیٹنے میں پڑے ہوئے ہیں ان کو بھی معلوم نہیں ہے کہ کب موت آجائے گی؟ اس سے پہلے سورۂ تکاثر گذری اس میں زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنے کی ہوس نے غافل کردیا؛ اس کا تذکرہ آچکا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو غفلت میں ڈالتی ہے۔ تو اس غفلت کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں آخرت کا فکر پیدا ہو۔

ان دونوں پاروں کی سورتیں مکی دور میں نازل ہوئیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ابتدائی وحی نازل فرمائی، لوگوں کو ایمان واسلام کی دعوت دی گئی، ابھی شریعت کے دوسرے تفصیلی احکام نہیں آئے تھے، حلال وحرام کے احکام بھی نہیں آئے تھے لوگوں کے دلوں میں صرف آخرت کے یقین کو مضبوط کیا جارہا تھا، اس وقت یہ سورتیں نازل ہوئیں۔ یقین ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو ہر قسم کے جرائم سے بچاتا ہے۔ اسی لیے ان سورتوں میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور آخرت وقیامت اور جنت کے حالات، اس کی نعمتوں کی تفصیلات، جہنم کے حالات، اس کے عذاب کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

......تو انسان و جانور میں فرق نہیں:

اگر آخرت کا فکر نہ ہو تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ جیسے جانور کھاتے پیتے ہیں، انسان بھی کھاتے پیتے ہیں، جانور بھی پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، انسان بھی پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، گویا زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ ہوگا۔ جانوروں کے لیے آخرت کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے، ان کے لیے زندگی کا کائی خاص مقصد نہیں ہے؛ لیکن انسان کو تو اللہ تعالیٰ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ آخرت کے لیے اعمال کرے۔ اور اگر آخرت کا فکر نہ ہو تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ تو اس فکر کو اپنی طبیعت اور اپنے دل و دماغ کے اوپر غالب کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

اور ہر کام یہ سوچ کر کیا جائے کہ کل مجھے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے، اور اس کام کے متعلق جواب دینا ہے۔ کیا میں اللہ کی جانب سے اس کام کے متعلق کیے جانے والے سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں؟ یہ سوچ کر کوئی کام کرے گا تو کبھی بھی جرم اور ظلم کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ تو گویا سارے جرائم کی بنیاد آخرت سے غفلت ہے۔

ترجمہ:

اَلْقَارِعَةُ (کھڑکھڑانے والی)

مَا الْقَارِعَةُ (کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی) کھٹکھٹانے والی، دل کو دہلانے والی؟

وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ (اور تم کو کیا معلوم کہ وہ دل دہلانے والی کیا ہے؟)

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (یہ واقعہ اس دن پیش آئے گا جس دن لوگ پروانوں کی طرح پھیلے ہوئے ہوں گے)

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (اور پہاڑ دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح ہوں گے)

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (جس کی ترازوئیں وزنی ہوں گی، یعنی جس کے نیک اعمال زیادہ ہوں گے)

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (تو وہ من پسند زندگی میں ہوگا)

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے)

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (تو اس کا ٹھکانا هاوية (ایک گہرا گڑھا) ہوگا)

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ (تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہے؟)

نَارٌ حَامِيَةٌ (وہ دہکتی ہوئی آگ ہے) یعنی جہنم ہے۔

تفسیر:

قرع-يقرع کے معنی کھٹکھٹانے کے ہیں، کھڑکھڑانا۔

عربی زبان کا ایک خاص انداز ہے، ہم اردو میں کما حقہ اس کی تعبیر نہیں کرسکتے۔ جب قیامت آئے گی تو صور پھونکے جانے کی ایک خوفناک آواز پیدا ہوگی، وہ ایسی خطرناک آواز ہوگی کہ اس سے لوگوں کے کلیجے پھٹ جائیں گے۔ اس کو القارعة سے تعبیر کیا جاتا ہے، دل دہلانے والی۔ یعنی جس کی آواز سن کر دل خوف میں مبتلا ہو جائیں گے، ڈر جائیں گے۔ تو القارعة: یعنی یاد کرو قیامت کو جو دل دہلا دینے والا اور کھڑکھڑانے والا ایک واقعہ ہے۔

آگے اس کی تفصیل بیان کر رہے ہیں:

کوئی اِدھر کوئی اُدھر:

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ

بارش کے زمانے میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ روشنی میں پروانے بڑی تعداد میں نکل آتے ہیں۔اوران کا حال یہ ہوتا ہے کہ کوئی اوپر جارہا ہے، کوئی نیچے جارہا ہے، کوئی دائیں، کوئی بائیں، کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔قیامت کے روز جب انسانوں کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا تو ان کا یہی حال ہوگا کہ کوئی ترتیب نہیں ہوگی۔دائیں، بائیں، اوپر، نیچے ہر طرف کا رخ کیے ہوئے ہوں گے۔گویا ان میں بے چینی اور خوف کی سی شکل ہوگی۔

وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ.

یعنی اللہ تعالیٰ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کردیں گے۔حالاں کہ پہاڑ اپنی سختی میں مشہور ہیں۔کسی آدمی کی سختی میں مثال دینی ہو تو پہاڑ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔مثلاً: کوئی آدمی مشکلات برداشت کرنے میں بڑا صبر اور تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے، تو لوگ کہتے ہیں کہ اس میں پہاڑ کی طرح استقامت ہے۔لیکن ان ہی پہاڑوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بالکل دھنی ہوئی اون کی طرح بنادیں گے۔اس کے ذرات ہوا میں اڑ رہے ہوں گے۔

خطرناک واقعہ:

ایک جگہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ.(النمل:۸۸) جیسے بدلیاں فضا میں ادھر سے اُدھر چلتی ہیں، اس طرح پہاڑ بھی چل رہے ہوں گے، فضا میں اڑ رہے ہوں گے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا۔ (طه:۱۰۵) (یہ لوگ پہاڑ کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہیے: میرا رب ان کو پیس کر کے رکھ دے گا) یہ سارے پہاڑ قیامت میں پیسی ہوئی ریت کی طرح ہو جائیں گے، اور دھنے ہوئے اون کی طرح اڑتے ہوں گے، گویا زمین بالکل سپاٹ ہو جائے گی۔اسی کو آگے کہا گیا: فَيَذَرُهَا قَاعًا

صَفۡصَفًا(طٰہٰ:۱۰۷)اب زمین سپاٹ ہو جائے گی۔ جب پہاڑوں کا یہ حال ہوگا تو اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیسا خطرناک واقعہ پیش آئے گا؟ اس موقع پر کیا ہوگا؟

فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُهٗ. موازین، میزان کی جمع ہے، بمعنیٰ ترازو۔ یعنی جس کی ترازوئیں بھاری اور وزنی ہوں گی وہ من پسند زندگی میں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک مختصر جملے عِیۡشَةٍ رَّاضِیَةٍ میں سب کچھ بیان کر دیا۔ اس دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا حکمران ہو، بڑے سے بڑا مالدار ہو، صنعت کار ہو، کسی بڑے سے بڑے ملک کا سربراہ ہو؛ لیکن کوئی بھی آدمی دنیا میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ سب کچھ اس کے دل کی خواہش کے مطابق ہو رہا ہے۔ بلکہ بہت سی باتیں وہ ہیں جو اس کے دل کی مرضی کے خلاف ہیں۔ وہ چاہتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے؟ دنیا ہے ہی ایسی جگہ کہ وہاں آدمی کی پسند کے مطابق سب کچھ ہوتا نہیں ہے۔ بہت سی باتیں اس کی پسند کے خلاف ہوتی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن کی ترازوئیں، جن کے نیک اعمال غالب ہوں گے، وہ قیامت کے روز من پسند زندگی میں ہوں گے۔ یعنی ان کو اللہ تعالیٰ جنت میں بھیجیں گے۔

جنت کا حال:

حدیث شریف میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے جنت میں ایسی نعمتیں ہیں: ما لا عین رأت ولا أذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر (ایسی نعمتیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا)[۱] اور قرآن میں باری تعالیٰ فرماتے

(۱)مسند الحمیدي:۷۷۹، ۱۱۶۷ (ط: دار السقاء، دمشق، سوریا) ومسند أحمد: ۹۶۴۹، ۲۲۸۲۶ (ط: مؤسسة الرسالة) و صحیح البخاري: ۳۲۴۴، ۴۷۷۹، ۴۷۸۰ (ت. محمد فؤاد عبد الباقي) و صحیح مسلم: ۲[۱۸۹]۳۱۲، ۴، ۲، ۵[۲۸۲۴] (ت. محمد فؤاد عبد الباقي) وسنن الترمذي: ۳۱۹۷، ۳۲۹۲ (ط: مکتبة الحلبي، مصر).

ہیں: وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ. (حم السجدۃ:۳۱) (تمہارا جی جو چاہے گا ایسی من پسند چیزیں وہاں ملیں گی) دنیا میں کوئی آدمی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو اس کا من چاہتا ہے وہ مل جاتا ہے۔ جنت میں جو مانگو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب دیا جائے گا۔

دنیا کی زندگی ایسی ہے کہ یہاں کی راحت کے ساتھ تکلیف لگی ہوئی ہے، یہاں کی خوشی کے ساتھ غم کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بناوٹ ہی ایسی رکھی ہے۔ دیکھیے! آپ کھانے بیٹھے ہیں، دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں؛ لیکن آپ کو کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں زیادہ مقدار میں کھانا پیٹ میں پہنچ گیا تو بد ہضمی ہو جائے گی۔ اس چیز کے کھانے کی وجہ سے کہیں کوئی نقصان اور بیماری نہ ہو جائے۔ اسی طرح ہر نعمت کے ساتھ کوئی نہ کوئی غم اور فکر لگا ہوا ہے۔ اور جنت کا حال یہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس:۶۲) (جنتیوں پر نہ تو کوئی خوف ہوگا، نہ ان کو کوئی غم) نہ آئندہ کا کوئی فکر، نہ ماضی کا کوئی غم، وہ ان سب چیزوں سے بے فکر ہوں گے۔ جبکہ دنیا میں آدمی پر یہ ساری چیزیں غالب ہوا کرتی ہیں۔ گویا تم اگر ایسی من پسند زندگی چاہتے ہو تو تم کو جنت میں ملے گی۔ اس کے لیے آپ کو دنیا میں نیک اعمال کا اہتمام کرنا ہے۔ ایسے نیک اعمال جن کی وجہ سے تمہاری ترازوئیں وزنی ہو جائیں۔

من پسند زندگی گزارنے کی جگہ:

دیکھو! دنیا کی تکلیف خالص تکلیف نہیں ہے، اور دائمی تکلیف بھی نہیں ہے۔ جیسے راحت خالص اور دائمی نہیں ہے؛ بلکہ راحت کے ساتھ تکلیف کا بھی کانٹا لگا ہوا ہے۔ اسی طرح تکلیف بھی خالص تکلیف نہیں ہے۔ جیسے کوئی بیماری آ گئی تو اس کا علاج کرنے والا

طبیب موجود ہے، دوائیں موجود ہیں، آپ کی عیادت کرنے والے آپ کے دوست و احباب موجود ہیں، خدمت کرنے والے آپ کے رشتہ دار موجود ہیں۔ اور جہنم میں کوئی پوچھنے والا ہے؟ جہنم میں جو تکلیف ہوگی تو اس تکلیف کا نہ کوئی علاج ہے، نہ اس کی کوئی دوا ہے، نہ وہاں آپ کو کوئی تسلی دینے والا ہے، نہ کوئی آپ کی خبر لینے والا ہے۔ دنیا میں تو اللہ تعالیٰ نے ان تکلیفوں میں بھی راحت کے سامان مہیا کیے ہیں۔ گویا جہنم کی تکلیف خالص تکلیف ہے۔ اس میں راحت کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔ اور جنت کی راحت، خالص راحت ہے، اس میں تکلیف کی ملاوٹ نہیں ہے۔ جبکہ دنیا میں دونوں باتیں ہیں: دنیا کی تکلیف نہ خالص تکلیف ہے، اس کے ساتھ راحت کے اسباب ہیں۔ اور دنیا کی راحت نہ خالص راحت ہے؛ بلکہ اس میں تکلیف کی ملاوٹ ہے۔

بہر حال! کوئی آدمی من پسند زندگی دنیا میں تو گزار ہی نہیں سکتا، وہ تو آخرت میں، جنت ہی میں مل سکتی ہے۔ لہٰذا اس کو چاہیے کہ اس کی ترازو وزنی اور بوجھل ہوں اس کا اہتمام کرے۔ کیسے بوجھل ہوں گی؟ وہ آگے ان شاء اللہ بتائیں گے کہ کن اعمال سے ترازو بوجھل بنیں گی؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ قارعۃ

(قسط-۲)

(مؤرخہ ۲۹ ربیع الآخر ۱۴۴۰ھ مطابق: ۵ جنوری ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أمابعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

اَلۡقَارِعَةُ ۝۱ مَا الۡقَارِعَةُ ۝۲ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ۝۳ يَوۡمَ يَكُوۡنُ النَّاسُ كَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ۝۴ وَ تَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَ اَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا هِيَهۡ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱

ترجمہ:

سورۂ القارعۃ چل رہی تھی، پھر سے ایک مرتبہ اس کا ترجمہ کر دیتے ہیں۔

اَلۡقَارِعَةُ (کھڑکھڑانے والی)

القارعۃ یہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جو بھیانک آواز نکلے گی، سب کے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گی، جس کی وجہ سے دل دہل جائیں گے، اسی کو کھڑکھڑانے والی فرمارہے ہیں۔

مَا الْقَارِعَةُ (کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی؟)

وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ (اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے؟)

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (جس دن (اس کی ہیبت کی وجہ سے) تمام لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوجائیں گے)

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے)۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ، فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ. (پس! جس شخص کے پلڑے وزنی ہوں گے، وہ من پسند زندگی میں ہوگا)۔

وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے، تو اس کا ٹھکانا ایک گہرا گڑھا ہے)۔

وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ (اور تم کو کیا معلوم کہ وہ گہرا گڑھا کیا ہے؟)

نَارٌ حَامِيَةٌ (دہکتی ہوئی آگ ہے)۔

گذشتہ سے پیوستہ:

بتلایا گیا تھا کہ جن لوگوں کے پلڑے وزنی ہوں گے، وہ اپنی من پسند زندگی میں ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز اعمال کا وزن ہوگا۔ علماء فرماتے ہیں

کہ اعمال کی گنتی نہیں ہوگی کہ کتنے اعمال کیے؟ بلکہ اعمال کا وزن ہوگا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۠(الانبیاء:۴۷) (ہم قیامت کے روز انصاف کی ترازوئیں قائم کریں گے) جس میں انسانوں کے اعمال کو تولا جائے گا۔ہم جو عمل کرتے ہیں وہ بہ ظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی عمل کیا اور ختم ہوگیا، مٹ مٹا گیا؛ نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ آدمی جو بھی عمل کرتا ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے وہاں محفوظ رہتا ہے، اور کل قیامت کے روز باقاعدہ تولا جائے گا۔ ہر عمل کو اللہ نے ایک وزن عطا فرمایا ہے۔ بہت سے اعمال وزنی ہیں، بعض اعمال بغیر وزن کے ہیں۔ یہاں بتلایا جارہا ہے کہ جن کے اعمال وزنی ہوں گے وہ اپنی من پسند زندگی میں ہوں گے۔

......اب اشکال ختم ہوگیا:

اب اعمال کو کیسے تولا جائے گا؟ قدیم زمانے میں تو یہ ایک اشکال کی چیز تھی، لوگ سوال کرتے تھے کہ اعمال کا اپنا کوئی جسم نہیں ہے، پھر ان کو ترازو کے پلڑے میں رکھ کر کیسے تولا جائے گا؟ یہ اُس زمانے کی بات ہے۔ اب تو سائنس کی ترقیوں کے نتیجے میں ایسی ایسی چیزیں ناپی اور تولی جاتی ہیں جن کا کوئی جسم نہیں ہے۔ اُس زمانے میں لوگ یوں سمجھتے تھے کہ جسم والی چیز ہی کو تولا اور ناپا جا سکتا ہے، بغیر جسم والی چیز میں یہ صورت ممکن نہیں ہے۔ لیکن اب تو حرارت و برودت کو ناپا جاتا ہے۔ گرمی اور سردی کو ناپا جاتا ہے۔ آدمی کے بخار کو بھی ناپا جاتا ہے، آواز کو ناپا جاتا ہے۔ خون کا دباؤ (پریشر)، خون کا شوگر، خون کا کالیسٹرول ناپا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز ناپی جاتی ہے جس کا کوئی جسم نہیں ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اپنی محدود عقل اور محدود طاقت وقدرت کے ذریعے ایسے آلات بنا سکتا

ہے، جن سے ان چیزوں کو ناپا اور تولا جا سکتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تو پوری کائنات کو پیدا کیا، انسانوں کو پیدا کیا اور انسان کے اعمال کو بھی پیدا کیا۔ کیا وہ اس بات کی قدرت نہیں رکھتا کہ وہ انسانوں کے اعمال کو تولے؟ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز باقاعدہ ترازو قائم کریں گے، اور لوگوں کے سامنے یہ سلسلہ ہوگا، اور ان ترازوؤں کے ذریعے فیصلہ ہوگا۔

ترازو کیوں قائم کریں گے......؟؟؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو قدیم زمانے میں بعض گمراہ فرقوں نے قائم کیا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو سب جانتے ہیں، تو پھر اللہ کو ترازوئیں لگا کر اعمال تولنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کو سب کچھ معلوم ہے کہ کس کے اعمال وزنی ہیں اور کس کے اعمال ہلکے ہیں؛ لیکن قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ میدان محشر میں جو فیصلے کریں گے، وہ اس انداز سے کریں گے کہ لوگوں کو انصاف ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ دیکھ کر ہر آدمی اپنے متعلق خود فیصلہ کر لے گا، اس کو کچھ کہنا نہیں پڑے گا، وہ اپنے مجرم ہونے کو خود ہی محسوس کر لے گا کہ میرے اعمال وزنی ہیں یا ہلکے ہیں؟ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے متعلق جو فیصلہ کیا جا رہا ہے اس کے متعلق وہاں کھل کر ایسی صورتیں پیدا کی جائیں گی کہ انسان کو خود اس فیصلے کا اقرار کرنا پڑے گا، گویا انصاف ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ یہ ترازوئیں قائم کریں گے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے طور پر فیصلہ کر لیں، وہ جانتے ہیں کس کے اعمال میں کتنا وزن ہے؟ کوئی اشکال کی چیز نہیں تھی؛ لیکن قیامت کے روز باقاعدہ گواہ پیش کیے جائیں گے، وہ گواہی دیں گے، اور فیصلہ ہوگا۔

عمل کا وزن دیکھیں:

جس طرح دنیا کی عدالتوں میں مجرم کے خلاف گواہ پیش کیے جاتے ہیں۔خود جج یا قاضی کوکسی آدمی کا مجرم ہونا معلوم ہوتب بھی باقاعدہ کیس اور مقدمے کی کارروائی ہوتی ہے، گواہ پیش ہوتے ہیں، گواہی دیتے ہیں، ان کی گواہی کے بعد اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے؛ تاکہ مجرم کوبھی اپنا مجرم ہونا معلوم ہو جائے۔تو قیامت کے روز گواہیاں بھی لی جائیں گی، اعمال کوتولا جائے گا، اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فیصلہ کیا جائے گا اس لیے اپنے اعمال میں وزن پیدا کرنے کا اہتمام کریں۔ہم یہ نہ دیکھیں کہ کتنا عمل کیا؟ گنتی نہ کریں۔بلکہ اس عمل میں وزن ہے یا نہیں؟ یہ ہمیں دیکھنا ہے۔

وزن کیسے پیدا ہو......؟؟؟:

اب وہ کون سی چیزیں ہیں جن سے عمل میں وزن پیدا ہوتا ہے؟ تو تین چیزیں ایسی ہیں جن سے عمل میں وزن پیدا ہوتا ہے: (۱) ایمان۔(۲) صدق: یعنی سنت وشریعت کے مطابق ہونا۔(۳) اخلاص۔

(۱) ایمان:

ایمان کی وجہ سے اعمال میں وزن پیدا ہوتا ہے۔دنیا میں کافر بھی بہت سے اچھے اچھے کام کرتے ہیں۔بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں، پیاسوں کو پانی پلاتے ہیں، ننگوں کو کپڑا پہناتے ہیں، بیماروں کے علاج کا انتظام کرتے ہیں، بڑے بڑے ہسپتال قائم کرتے ہیں وہاں مفت علاج ہوتا ہے، کسی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا جاتا۔کوئی قدرتی مصیبت، آفت آتی ہے تو بڑے بڑے رفاہی کام بھی کرتے ہیں۔یہ سارے اچھے اچھے اعمال ہیں؛ لیکن کفر کی

وجہ سے ان کے ان سارے اعمال میں قیامت کے روز کوئی وزن نہیں ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے ان اچھے اعمال کا بدلہ نیک نامی کی شکل میں، روزی میں زیادتی کی شکل میں اور دوسری شکلوں میں دنیا ہی میں عطا فرمائیں گے؛ لیکن آخرت میں ان کے عمل کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ چناں چہ قرآن پاک میں باری تعالیٰ نے اس چیز کو بتلایا ہے:

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (الفرقان:۲۳) (قیامت کے روز ہم کفار کے اعمال کی طرف ان کا فیصلہ کرنے کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کے اعمال کو ہم ہوا میں اڑتے ہوئے ذرات کی طرح بنادیں گے) یعنی ان میں کوئی وزن نہیں ہوگا، جیسے ہوا میں اڑنے والے ذرات کا کوئی وزن نہیں ہوتا ایسے ہی کافروں کے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ایمان نہیں تھا۔

ایمان کے بغیر وزن نہیں:

اسی طرح سورۂ کہف میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا۔ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا. (الکهف:۱۰۵) (اے نبی! آپ کہہ دیجیے! میں تم کو بتلاؤں وہ لوگ جو اپنے اعمال میں گھاٹے اور نقصان میں ہیں؟ جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں بے کار اور اکارت گئیں؛ اور وہ یوں سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی اچھا کام کر رہے ہیں۔ (وہ کون ہیں؟) جنھوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا، اس کی ملاقات کو بھی جھٹلایا۔ ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے) تو اعمال میں وزن کے لیے پہلی شرط ایمان ہے۔ ایمان کے بغیر اعمال میں

وزن پیدا نہیں ہوگا۔

(۲) صدق:

اعمال میں وزن پیدا کرنے کے لیے دوسری شرط صدق ہے۔صدق کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی عمل کیا جائے سنت اور شریعت کے مطابق ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کرنے کا جو طریقہ بتلایا ہے، اگر اس کے مطابق عمل کو انجام دیا جائے گا تب تو اس میں وزن ہوگا، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ قبولیت حاصل کرے گا۔ ورنہ ظاہری اعتبار سے کوئی کتنا ہی اچھا کام کر رہا ہو؛ لیکن وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے مطابق نہیں ہے تو اس کے عمل میں وزن نہیں ہوگا۔

اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے- نماز کتنا اچھا عمل ہے!!! نماز کو حدیث شریف میں دین کا ستون قرار دیا گیا، اور دین میں نماز کی بہت اہمیت بیان کی گئی- اللہ ہی کے لیے نماز پڑھ رہا ہے؛ لیکن نماز کا جو طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا اس کے مطابق نماز نہیں پڑھتا۔ فجر کی نماز دو کے بہ جائے چار رکعت پڑھی کہ ڈبل پڑھوں، ارے بھائی! تو ڈبل پڑھے گا تو وہ دو رکعت پر جو ثواب ملتا ہے وہ بھی نہیں ملے گا۔ تو ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہر عمل کرنا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہؓ کو طریقہ بتلا کر باقاعدہ ہدایت فرمائی: صلوا کما رأیتموني أصلي (مجھے جس طرح نماز پڑھتا ہوا دیکھو، اس کے مطابق نماز پڑھو)[۱] اگر ہماری نماز اس طریقے کے مطابق نہیں ہے تو ہماری نماز میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔

---

(۱) مسند الشافعي: ۲۹۴ (ط: شركة غراس، الكويت) و صحيح ابن حبان: ۱۶۵۸ (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت) و سنن الدار قطني: ۱۰۶۹ (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت) والسنن الكبرىٰ للبيهقي: ۳۸۵۵ و ۳۸۵۶ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

ایک دیہاتی کا قصہ:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف فرما ہیں، ایک دیہاتی صحابیؓ آئے اور دو رکعت ادا کی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وعليك السلام ارجع فصل فإنك لم تصل (واپس جاؤ! نماز پڑھو، اس لیے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی) پھر گئے، نماز پڑھی، پھر آ کر سلام کیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی طرح فرمایا۔ تیسری مرتبہ بھی ایسا ہوا تو آخر میں ان صحابیؓ نے عرض کیا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے آپ بتلائیے کہ میں کس طرح نماز پڑھوں؟ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا: پہلے تکبیر کہہ کر نماز شروع کرو، اور قیام اطمینان اور سکون کے ساتھ کرو، قراءت کرو۔ پھر رکوع میں جاؤ، اطمینان اور سکون کے ساتھ رکوع کرو۔ پھر رکوع سے اٹھو، اطمینان اور سکون سے قومہ کرو، اس کے بعد سجدہ میں جاؤ، سجدہ بھی اطمینان اور سکون کے ساتھ کرو۔ پھر اٹھو، اور جلسہ- دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا -بھی اطمینان سے کرو، پھر دوسرا سجدہ کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورا طریقہ بتلایا۔[1] جس کو فقہا تعدیل ارکان سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی نماز کے ہر رکن کو قیام، رکوع، قومہ، جلسہ سجدہ ہر ایک کو اطمینان اور سکون کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اگر اس طرح ادا نہیں کیا جائے گا تو یہ نماز درست نہیں ہوگی۔

بدعت وزن سے خالی:

اسی طرح بہت سے اعمال ظاہر میں اچھے معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

(۱) مسند أحمد: ۹۶۳۵ و ۱۸۹۹۷ وصحيح البخاري: ۷۵۷ و ۷۹۳ و ۶۲۵۱ و ۶۶۶۷ وسنن أبي داود: ۸۵۶ وسنن الترمذي: ۳۰۳ و ۲۶۹۲ وغيرها.

نے یا قرآن نے اس کا حکم نہیں دیا، جس کو بدعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت سے ایسے اعمال رواج پاگئے ہیں، جیسے کسی کی موت کے بعد تیسرے دن باقاعدہ دعوت کی جاتی ہے، لوگ جمع ہوتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، ایصالِ ثواب کرتے ہیں، کھانا کھلایا جاتا ہے۔ دیکھنے میں تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اپنے لیے انہوں نے جن چیزوں کو لازم قرار دے دیا یعنی وقت مقرر کر دیا وغیرہ، یہ ساری چیزیں شریعت کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: من أحدث في أمرناهذا ماليس فيه فهو ردٌّ (ہمارے اس دین میں جنہوں نے کسی نئی بات کو ایجاد کیا وہ اس پر واپس کر دی جائے گی)[۱] مردود ہے، لوٹا دی جائے گی۔ كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة و كل ضلالة في النار (ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں جائے گی)[۲] تو بہت سے اعمال جو ہمارے معاشرے میں ہوتے ہیں جیسے: تیجہ، دسواں، چالیسواں اس طرح کے اعمال بظاہر دیکھنے میں اچھے معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن چوں کہ نبی کریم ﷺ کے طریقے سے ہٹ کر ہیں، ان میں صدق والی صفت نہیں پائی جاتی، اس لیے ان پر کوئی ثواب نہیں ملے گا اور ان اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ بدعت وزن سے خالی ہے۔

کھانا تو ہمیں بھیجنا چاہیے:

دیکھو! اس موقع پر کھانا کھلاتے ہیں۔ جب کہ میت ہوئی ہے اور وہ لوگ کھانا

---

(۱) مسند أحمد: ۲۶۰۳۳، ۲۶۳۲۹ و صحيح البخاري: ۲۶۹۷ و صحيح مسلم: ۱۷[۱۷۱۸] و سنن أبي داود: ۴۶۰۶ و سنن ابن ماجه: ۱۴.

(۲) مسند أحمد: ۱۷۱۴۴، ۱۷۱۴۵ وسنن أبي داود: ۴۶۰۷، ۴۶۰۸ و البدع لابن وضاح القرطبي: ۵۶، ۵۷ و السنة لابن أبي عاصم: ۲۵.

کھلاتے ہیں۔ حالاں کہ غزوۂ موتہ کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ کے پاس حضرت جعفرؓ کی موت کی خبر آئی تو حضور ﷺ نے ہدایت کی کہ ان کے گھر والوں کے لیے کھانا بناؤ، کیوں کہ وہ غم میں مشغول ہیں۔[۱] تو کھانا تو ہمیں بھیجنا چاہیے، اس کے بہ جائے لوگ میت کے گھر جا کر کھانا کھاتے ہیں!!!

سنت و بدعت، عالمِ امثال میں:

ہمارے بزرگوں میں ایک بزرگ حضرت شاہ یاسین صاحب نگینویؒ گزرے ہیں- جو حضرت گنگوہیؒ کے خلفا میں سے ہیں۔ حضرت شیخؒ نے فضائل اعمال کے مقدمے میں ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان کے ایک خلیفہ تھے شاہ عبدالعزیز صاحب دعاجو۔ حضرت شیخؒ نے فضائل دُرود کے مقدمے میں ان کا تذکرہ کیا ہے- انہوں نے فضائل کی کتابوں کی تالیف کے سلسلے میں حضرت شیخؒ سے فرمایا تھا، حکایات صحابہؓ کو حضرت شیخؒ نے ان ہی کی تاکید پر تالیف فرمایا تھا۔ انھوں نے درود کے متعلق بھی تاکید فرمائی تھی؛ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی تھی، تو اپنے خلیفہ شاہ عبدالعزیز صاحب دعاجوؒ کو وصیت کی تھی کہ حضرت شیخؒ سے بار بار کہیں۔ چناں چہ حضرت شیخؒ نے فضائل درود کے مقدمے میں تذکرہ کیا ہے کہ انہوں نے یاد دہانی کروائی، پھر حضرت شیخؒ نے فضائل درود تالیف فرمائی۔ تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دعاجوؒ کے متعلق مفتی محمد تقی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ دعوت و تبلیغ کے بزرگوں میں سے تھے ایک مرتبہ کراچی میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ حضرت میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ حضرت نے پوچھا کہ کیا خواب دیکھا؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ ایک

---

(۱) مسند أحمد: ۱۷۵۱ وسنن أبي داود: ۳۱۳۲ وسنن ابن ماجه: ۱۶۱۰ و سنن الدار قطني: ۱۸۵۰، ۱۸۴۹ والمستدرک للحاکم: ۱۳۷۷.

تختۂ سیاہ (بلیک بورڈ) ہے، آپ کھڑے ہیں، پہلے آپ نے اس پر ایک کا عدد (۱) لکھا، پھر اس کی دائیں طرف صفر لگایا (۱۰)، پھر پوچھا: یہ کیا ہے؟ کہنے لگے: یہ دس ہے۔ پھر دوسرا لگایا (۱۰۰)، پھر کہا: یہ کیا ہے؟ سب نے کہا: یہ سو (۱۰۰) ہے۔ پھر تیسرا لگایا (۱۰۰۰)، کہا: یہ کیا ہے؟ تو سب نے کہا: یہ ہزار (۱۰۰۰) ہے۔ چوتھا لگایا کہ یہ دس ہزار (۱۰۰۰۰) ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جتنے بھی صفر بڑھاتے جائیں گے اتنی ہی اس کی قیمت میں دس دس گنا اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس کے بعد اس کو مٹا کر پھر ایک (۱) لکھا، اور اس کی بائیں طرف صفر (۰۱) لگایا، اور پوچھا: یہ کیا ہے؟ کہا کہ یہ صفر اعشاریہ ایک یعنی یہ دسواں حصہ ہے۔ پھر دوسرا صفر لگایا (۰۰۱)، اور کہا یہ صفر صفر اعشاریہ ایک ہے یعنی یہ سوواں حصہ ہے۔ پھر تیسرا صفر (۰۰۰۱) لگایا کہ یہ کیا ہے؟ کہا کہ صفر صفر صفر اعشاریہ ایک یعنی ہزار (۱۰۰۰) واں حصہ ہے۔ تو بائیں طرف جتنے بھی صفر لگاتے جاؤ گے، قیمت اتنی ہی کم ہوتی جائے گی۔ دائیں طرف جتنے لگاتے جاؤ گے اتنی قیمت بڑھتی جائے گی۔ فرمایا سنت کی مثال ایسی ہے جیسے دائیں طرف صفر لگ رہے ہیں، اور بدعت کی مثال ایسی ہے جیسے بائیں طرف صفر لگ رہے ہیں۔ مفتی محمد تقی صاحب اپنے بہت سے مواعظ میں اس کو بدعت کی مثال میں پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بدعت والا عمل ظاہری اور دیکھنے کے اعتبار سے کتنا ہی اچھا عمل کیوں نہ ہو؛ لیکن اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب نہیں ہے، اس میں وزن نہیں ہوتا۔ وزن تو سنت و شریعت کی ہدایت کے مطابق عمل کرنے پر ہوتا ہے۔ تو اعمال میں وزن پیدا کرنے کے لیے دوسری شرط صدق یعنی اس عمل کا سنت و شریعت کے مطابق ہونا ہے۔

(۳) اخلاص:

اعمال میں وزن پیدا ہونے کے لیے تیسری شرط اخلاص ہے۔ یعنی وہ عمل اللہ کے

واسطے اور اس کو راضی کرنے کے لیے کیا جائے۔ لوگوں کو دکھلانے کے لیے کہ ہماری بڑائی ہوگی، لوگ ہمیں اچھا سمجھیں گے اور شہرت وریاکاری کے لیے نہ ہو؛ بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہو تو اس عمل میں وزن ہوگا۔ مان لو کہ ایک آدمی نوافل نہیں پڑھتا، فرائض، واجبات اور سنن مؤکدہ پر اکتفا کرتا ہے؛ لیکن وہ سب خالص اللہ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے، تو چاہے اس نے نوافل کا اہتمام نہ کیا ہو، اس کے اعمال میں وزن ہوگا۔ اور اس کے برخلاف کوئی دوسرا آدمی، جو خوب نوافل پڑھتا ہے؛ لیکن دل میں یہ ہے کہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں، شہرت اور نام آوری کے لیے کر رہا ہے، تو اس کے اعمال میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔ الغرض جو عمل خالص اللہ کو راضی کرنے کے لیے اور اخلاص کے ساتھ کیا جائے، چاہے چھوٹا عمل ہو تب بھی اس میں وزن ہوگا۔

کتے کو پانی پلانے پر مغفرت:

بخاری شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی جنگل سے گزر رہا تھا، اس کو پیاس لگی، اس نے وہاں ایک کنواں دیکھا؛ لیکن وہاں رسی ڈول نہیں تھی، کچا کنواں تھا، اس کی دیواروں میں خانے بنے ہوئے تھے، وہ نیچے اترا، اور پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی۔ پھر جب باہر آیا تو دیکھا کہ وہاں ایک کتا گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ میں پیاس کی شدت بھگت چکا ہوں اور کتا بھی اسی شدت سے دوچار ہے، اس نے سوچا کہ میں اس کو پانی پلاؤں۔ ڈول رسی تو تھی نہیں، البتہ اس کے پاؤں میں چمڑے کے موزے تھے، اس نے وہ نکالے اور پھر کنویں میں جا کر موزے میں پانی بھرا، اور موزوں کو دانتوں سے دبایا۔ کیوں کہ ہاتھ اور پاؤں تو اوپر چڑھنے کے لیے استعمال کرنے تھے۔ خیر! اس نے باہر آکر کتے کو پانی پلایا۔ تو حدیث شریف میں ہے: فشکر اللہ لہ وغفر لہ (اللہ تعالیٰ نے اس آدمی

کے اس عمل کی قدر فرمائی، اور اس کی مغفرت کا فیصلہ فرما دیا)[۱] یہ دیکھنے کے اعتبار سے تو بہت چھوٹا عمل ہے کہ پانی پلایا، وہ بھی جانور کو، اور وہ جانور بھی ایک کتا، جس کو لوگ دھتکارتے ہیں، اپنے پاس نہیں آنے دیتے؛ لیکن اس نے نیک عمل خالص اللہ کے واسطے کیا تھا، تو اللہ کے ہاں اس کی قدر یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمائی، اور اس کے لیے جنت کا فیصلہ کر دیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہاں اخلاص تھا، کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہاں کے جو حالات تھے وہ اس بات کے متقاضی تھے کہ اس نے یہ عمل خالص اللہ کے لیے کیا ہے۔ تو جو عمل اللہ کے لیے ہو، چاہے چھوٹے سے چھوٹا عمل ہو، لیکن اللہ کے ہاں اس کی بڑی قدر ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: لاتحقرنّ من المعروف شیئاً (نیکی کے کسی بھی کام کو حقیر مت سمجھو)[۲] بس! خالص اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

الإيمان بضع و سبعون شعبةً أفضلها لا إله إلا الله و أدناها إماطة الأذى عن الطريق.

(ایمان کی ستر (۷۰) سے زیادہ شاخیں ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ شاخ کلمۂ لا إله إلا الله ہے، اور سب سے ادنیٰ راستے سے کسی تکلیف دینے والی چیز کو ہٹانا ہے)[۳] راستے میں کانٹا، پتھر، کیلے کا چھلکا وغیرہ چیزیں پڑی ہیں، آپ نے دیکھا کہ کسی کا پاؤں اوپر پڑے گا تو پھسل کر گر جائے گا، آپ نے چپکے سے اس کو کنارے کر دیا۔ تو عمل چھوٹا سا ہے؛ لیکن اگر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی بڑی قدر ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري: ۱۷۳، ۶۵۲، ۲۳۶۳، ۲۴۶۶، ۲۴۷۲، ۲۰۰۹.

(۲) مسند ابن الجعد: ۳۱۰۰ و مسند أحمد: ۱۵۹۵۵، ۲۰۶۳۳، ۲۰۶۳۵، ۲۱۵۱۹ و صحيح مسلم: ۱۴۴ [۲۶۲۶] مسند البزار: ۳۹۶۲ والمعجم الكبير للطبراني: ۶۳۸۳، ۶۳۸۵، ۶۳۸۸.

(۳) مسند أبي داود الطيالسي: ۲۵۲۴ و الأدب المفرد: ۵۹۸ وسنن الترمذي: ۲۶۱۴ و سنن ابن ماجه: ۵۷ و تعظيم قدر الصلاة للمروزي: ۴۹۸ ومكارم الأخلاق للخرائطي: ۳۰۳ وصحيح ابن حبان: ۱۹۰، ۱۹۱ وغيرها.

ٹہنی ہٹانے پر جنت کا فیصلہ:

بخاری شریف میں ایک اور قصہ ہے کہ ایک آدمی گزر رہا تھا، راستے میں ایک خاردار ٹہنی تھی، جو گزرنے والوں کے لیے رکاوٹ کا سبب تھی، اس نے وہاں سے وہ ٹہنی ہٹا دی، تاکہ اللہ کے بندوں کو تکلیف نہ ہو۔ اس بات پر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت کا فیصلہ فرمادیا۔[۱]

نیکی نیکی کو کھینچتی ہے:

تو نیکی کا عمل دیکھنے میں چاہے چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو، خالص اللہ کے لیے ہو تو بڑا وزنی ہے۔ اور یہی نیکی دوسری نیکی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ نیکی کی خاصیت ہے کہ آپ نے اگر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی عمل انجام دیا ہے تو اس کی برکت یہ ہوگی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ دوسری نیکی کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

وارِدِ روحانی کی کرو قدردانی:

جب دل میں نیک کام کرنے کا ارادہ اور خیال آئے، تو اس کو حضرات صوفیاء فرماتے ہیں کہ یہ وارِدِ روحانی ہے۔ یعنی نیک کام کرنے کا خیال اللہ نے دل میں ڈالا ہے، تو اب آپ اس کی قدر کر لیجیے، یہ اللہ کا بھیجا ہوا مہمان ہے۔ یہ خیال آنے پر فوراً وہ کام کر لو اگر آپ اس کی طرف توجہ نہیں کریں گے...... تو جیسے کوئی شریف آدمی آپ کے گھر مہمان آیا، دروازہ کھٹکھٹایا، گھنٹی بجائی؛ لیکن آپ نے دیکھنے کے باوجود دروازہ نہیں کھولا، تو واپس

---

(۱) صحيح البخاري: ۶۵۲، ۲۴۷۲.

چلا جائے گا۔شریف آدمی غیرت مند ہوتا ہے۔اسی طرح نیک کام کرنے کا دل میں خیال پیدا ہونا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک مہمان ہے،اس کی قدر یہ ہے کہ فوراً اس پر عمل کیا جائے۔عمل کریں گے تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ دیگر نیک اعمال کی توفیق دیں گے۔

ہمیں بھی کرنا چاہیے:

حاصل یہ ہے کہ عمل میں وزن تین چیزوں سے آتا ہے: ایمان، صدق (یعنی سنت و شریعت کے مطابق ہونا) اور اخلاص۔ہمیں بھی اپنے اعمال کو وزنی بنانے کے لیے ان تین چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔نفس اور شیطان ہمارے اعمال کو خراب کرنے کے لیے اسی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔عموماً شہرت وریاکاری کا خیال آتا ہے،اور آدمی اپنے عمل کے ثواب سے محروم ہوجاتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ عادیات

(قسط-۱)

(مؤرخہ ۵/جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۲/جنوری ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم۝

وَ الۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا ۝۱ فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا ۝۲ فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا ۝۳ فَاَثَرۡنَ بِہٖ نَقۡعًا ۝۴ فَوَسَطۡنَ بِہٖ جَمۡعًا ۝۵ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوۡدٌ ۝۶ وَ اِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیۡدٌ ۝۷ وَ اِنَّہٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ ۝۸ اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ۝۹ وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ ۝۱۰ اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ ۝۱۱

وجہ تسمیہ:

یہ سورۂ عادیات ہے۔ چوں کہ اس کا پہلا کلمہ العادیات ہے، تو اسی مناسبت سے

اس کا نام سورۂ عادیات رکھا گیا۔

قسم کیوں کھائی......؟؟؟

اس سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے گھوڑوں کی قسم کھائی ہے، جن کو اہل عرب جنگ میں لڑائی کے وقت دشمنوں کے مقابلے میں استعمال کرتے تھے، ان پر سواری کرتے تھے۔ تو ان گھوڑوں کی کچھ خوبیاں اور صفات بیان کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کا بڑا ناشکرا ہے۔ سورۂ عصر کی تفسیر کے موقع پر بتلایا تھا کہ سورۂ عصر میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھائی ہے، تو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں جو قسمیں کھاتے ہیں اس کا مقصد کسی کو اپنی بات کا یقین دلانا نہیں ہوتا؛ کیوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو سب سے سچے ہیں وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا۔ (النساء:۱۲۲) بلکہ قرآن پاک میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں، وہ دراصل بعد والے مضمون کی صداقت کے لیے کھائی جاتی ہیں۔ لہٰذا جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے ان پر غور کریں گے اور ان کے حالات کو سوچیں گے تو اس کے بعد جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس کی صداقت کا آپ کو یقین ہو جائے گا۔ تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کلام کو مؤکد کرنے کے لیے قسمیں کھا رہے ہیں۔

انسان ناشکرا ہے:

یہاں گھوڑوں کی قسمیں کھائی ہیں۔ دراصل انسان اللہ کا ناشکرا ہے، وہ ناشکرا کیسے ہے؟ تو جب گھوڑوں کے حالات میں غور کریں گے تو آپ کو انسان کے ناشکرا ہونے کا پتا چلے گا۔ ایک طرف آپ گھوڑوں کے حالات کو دیکھو، اور دوسری طرف انسان کے حالات پر غور کرو کہ یہ گھوڑا اپنے مالک کا کیسا وفادار ہے؟ اور دوسری طرف انسان اپنے اللہ کا کیسا

ناشکرا ہے؟ تو آپ کو خود اس مضمون کی صداقت کا پتا چل جائے گا۔اس سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک تو انسان کے ناشکرا ہونے کو بتلایا ہے اور اس کے لیے گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے۔

گھوڑا اور اہل عرب:

گھوڑا ایک جانور ہے، اہل عرب کو اس کے ساتھ بڑی مناسبت تھی، اور وہ گھوڑوں کو بڑے اہتمام اور بڑی توجہ کے ساتھ پالا کرتے تھے۔ اور جیسے وہ اپنے نسب ناموں کو دور دور تک محفوظ رکھتے تھے ایسے گھوڑوں کے نسب بھی ان کے یہاں محفوظ رکھے جاتے تھے۔ اور گھوڑوں کے ساتھ ان کا ایک خصوصی ربط اور تعلق تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی زندگی قبائلی تھی، اور قبائلی زندگی میں عام طور پر آپس میں عداوتیں، دشمنیاں ہوا کرتی ہیں، اور ہر ایک موقع بہ موقع اپنے دشمن پر حملہ بھی کر دیتا ہے، اور اس سے انتقام لیتا ہے، اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔گھوڑا ایک ایسا جانور ہے کہ وہ جنگ کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے تو اسی لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کی ان خوبیوں کو بیان کیا ہے جس کو وہ اپنے کام میں لاتے ہوئے استعمال کرتے تھے۔

گھوڑا طاقت کی علامت:

اور دوسری بات یہ ہے کہ گھوڑا طاقت کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے گھوڑا ایک ایسا قد آور اور عظیم الجثہ جانور بنایا ہے جس کی ہیئت بھی اونچی ہے، اور اس میں طاقت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ چناں چہ اِس زمانے میں بھی اگر کسی انجن کی طاقت کو بتلانا ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہ انجن اتنے ہورس پاور (HORSE POWER) کا ہے، تو اس سے

گھوڑے کی طاقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گھوڑا گویا طاقت کی ایک علامت قرار دیا گیا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان ہی گھوڑوں کے حالات کو اس سورت میں بیان کیا ہے۔

بغیر معاوضے کے فائدہ:

ایک تو اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنا احسان بتلایا ہے کہ دیکھو! ایسے طاقتور، قوی الہیکل ،قوی الجثۃ جانور کو ہم نے آپ کے تابع اور غلام بنادیا،آپ کے لیے مسخر کردیا۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے کائنات کی تمام چیزوں کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے، یعنی انسان اپنے مفاد کے لیے اس کو جس طرح چاہے استعمال کرے: اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً (لقمان:۲۰) (آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو تمہارے لیے مسخر کردیا،اس کو تمہارے تابع کردیا) مسخر کا مطلب یہ ہے کہ تم جس طرح چاہو ان سے فائدہ اٹھاؤ، خدمت لو، آپ کو اس کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کرنا ہے۔اس کو اردو میں بے گاری کہا جاتا ہے۔

پہلے زمانے میں ظالم قسم کے حکمران کو جب کوئی کام کروانا ہوتا، جیسے کوئی تعمیری کام ہورہا ہے، تو کسی جانے والے مزدور سے کہتے: چل اس کام میں لگ جا۔شام تک کام لیا، پھر کہتا کہ چل! چلا جا یہاں سے! نہ پیسہ دینا ہے، نہ کھانا دینا ہے، کچھ نہیں۔اس سے فائدہ اٹھایا اور کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا، مفت میں کام لیا، اس کو بے گاری کہا جاتا ہے۔

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کائنات کی تمام چیزوں کو انسان کا ایسا تابع بنادیا ہے کہ انسان گویا بغیر کسی معاوضے کے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ہم سورج کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہیں، زمین سے فائدہ اٹھاتے ہیں، پانی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔اس کا کوئی معاوضہ

ادا نہیں کرنا پڑتا۔ اگر ہمیں سورج کی روشنی سے فائدہ اٹھانے کا معاوضہ ادا کرنا پڑے، لائٹ کا بل تو ہم سے بھرا نہیں جاتا!!! سورج کا بل ہم کہاں بھریں گے؟

تسخیر کا اثر:

اور سواری کے لیے جتنے جانور پیدا کیے ہیں جیسے: گھوڑا، گدھا، اونٹ وغیرہ۔ ان جانوروں کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے تابع بنا دیا ہے۔ اسی لیے انسان کو سواری کے وقت کی دعا سکھلائی گئی ہے: سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَ مَا کُنَّا لَہٗ مُقۡرِنِیۡنَ وَ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ ۔(الزخرف:۱۳،۱۴) (پاک ہے وہ ذات جس نے اس جانور کو ہمارے تابع بنا دیا؛ ورنہ ہم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ ہم اس کو قابو میں کر سکتے، اور ہم اپنے رب کی طرف ہی لوٹ کر جانے والے ہیں)۔

اللہ نے اس کی طبیعت میں انسان کی اطاعت اور فرماں برداری کا ایسا مزاج بھر دیا کہ وہ انسان کی پورے پوری فرماں برداری کرتا ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ بھی اس کے منہ میں لگام ڈال کر سوار ہو کر جہاں لے جانا چاہے لے جا سکتا ہے۔ گھوڑا مڑ کر کبھی یہ سوال نہیں کرتا کہ میں تو تجھ سے بڑا طاقتور ہوں، قوی ہیکل ہوں، میں بھلا تیری کیا خدمت کروں؟ تو میری خدمت کر!!! لیکن آج تک کبھی گھوڑے نے یا کسی اور جانور نے جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی سواری کے لیے پیدا فرمایا ہے انسان سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ یہ اسی تسخیر اور تابع بنانے کا اثر ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان میں انسان کے تابع ہونے کا رکھا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ کا یہ اتنا بڑا احسان کہ ایسے قد آور، قوی الجثہ اور طاقتور جانوروں کو انسان کے تابع بنایا۔ ورنہ گھوڑے کے سامنے انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اگر وہ مقابلے پر آ جائے تو

انسان اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا؛ بلکہ وہ انسان کو چٹکیوں میں ختم کر سکتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے ان سارے جانوروں کو زیر کر دیا ہے۔

ہاتھی جیسا قوی الجثہ جانور؛ لیکن آپ فیل بان (મહાવત) دیکھیں گے کہ وہ اس کو ایسا بنائے ہوئے ہے کہ وہ جس طرف چاہے اس کو لے جاتا ہے؛ ورنہ اس ہاتھی کے سامنے انسان کی کیا حیثیت؟ مگر دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تسخیر کی گئی ہے اسی کا اثر ہے۔ ایک تو اللہ نے اتنا بڑا انعام دیا۔

گھوڑے کی وفاداری:

اور دوسرا یہ ہے کہ گھوڑے کو اتنا مسخر کرنے کے بعد اس کو انسان کا اتنا وفادار بنایا کہ آدمی سوچ نہیں سکتا۔ جب یہ گھوڑا لڑائی کے میدان میں جاتا ہے تو وہ اپنے سوار کا پورا مطیع وفرماں بردار ہو جاتا ہے۔ سوار کے لیے اپنی جان بھی دینے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ بڑے بڑے لشکر جو اپنے ہاتھ میں تلواریں اور اپنے کاندھوں پر نیزے لیے ہوئے ہیں، اور لشکروں کا بڑا بڑا مجمع ہے تو بھی یہ گھوڑا اپنے مالک کو لے کر اس میں گھس جاتا ہے۔ اور ان لشکر والوں کے ساتھ دشمنی مول لیتا ہے؛ حالاں کہ فریقِ مخالف کے ساتھ گھوڑے کو تو کیا دشمنی ہے؟ وہ گھوڑے کے دشمن نہیں ہیں؛ بلکہ اس کے مالک کے دشمن ہیں، تاہم وہ مالک کے دشمن کے ساتھ اپنے دشمن جیسا سلوک اور برتاؤ کرتا ہے۔ اور اس کے لیے ہر جگہ اپنے مالک کی وفاداری کرتا ہے، اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالتا ہے۔ حالاں کہ مالک نے اس کے لیے کیا کیا ہے؟ بس! وقت پر اس کو چارہ دیتا ہے، اور پانی دیتا ہے۔ اور تو کیا کیا؟ اس چارے کو تو مالک نے پیدا نہیں کیا، اس پانی کو مالک نے تو پیدا نہیں کیا۔ بس وہ تو اس کی کچھ

ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے اس کو وفاداری کا اتنا بڑا وصف عطا فرمایا کہ وہ وقت آنے پر مالک کے لیے جان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے، اور اپنی جان قربان بھی کر دیتا ہے۔ یہ گھوڑے کی ایک خصوصیت ہے۔

انسان کی بے وفائی:

اس کے مقابلے میں انسان کو اللہ تعالیٰ نے ساری نعمتوں سے ڈھانپ دیا، روزی اللہ دیتے ہیں، اور ساری نعمتیں اللہ نے دیں، وہ اللہ کی ساری نعمتوں کو استعمال کرتا ہے۔ لیکن ایک گھوڑا اپنے مالک کے ساتھ جس طرح وفاداری سے پیش آتا ہے، اس کے لیے اپنی جان تک کو جوکھوں میں ڈالتا ہے، قربان کر دیتا ہے۔اور انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیسا بے وفائی کا معاملہ کرتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ قسم کھا کر کہا کہ انسان اللہ کا بڑا ناشکرا ہے۔ گویا ایک انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اور گھوڑے کے حالات کو سوچے اور موازنہ کرے کہ گھوڑا ایک جانور ہے، جو غیر ذوی العقول ہے۔اس کے باوجود اس کا مالک ذرا سی اس کی ضروریات کا انتظام کرتا ہے، تو وہ اس کا کتنا وفادار ہو جاتا ہے!!! اور اس کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔

اور ایک انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ذوی العقول اور اشرف المخلوقات بنایا، تمام جانداروں میں باعزت بنایا اور ساری نعمتوں سے نوازا، ساری کائنات کو اس کے لیے مسخر کیا، اور اللہ تعالیٰ اس کی ساری ضرورتیں پوری کر رہے ہیں، اور وہ اللہ کی ساری نعمتوں کو استعمال کرتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، عیش و آرام کرتا ہے؛ لیکن کبھی بھولے سے یہ یاد نہیں آتا کہ میں اپنے مالک، پیدا کرنے والے اللہ کا اتنا بھی حق ادا کرتا ہوں جتنا یہ گھوڑا میرا حق

ادا کرتا ہے؟ اور کیا میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتنا وفاداری سے پیش آتا ہوں جتنا یہ گھوڑا میرے ساتھ وفاداری سے پیش آتا ہے؟ کیا میں اللہ کے لیے اتنی بھی قربانی دیتا ہوں جتنی یہ گھوڑا میرے لیے دیتا ہے؟ دشمنوں کے جمگھٹے میں گھس جاتا ہے، اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کے ان حالات کو بیان کرکے، ان کی قسم کھا کر کے آگے فرمایا: اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے)۔ تو گویا جو مضمون اللہ تعالیٰ آگے بیان فرما رہے ہیں اس کی صداقت کا آپ کو یقین ہو جائے گا؛ اگر آپ گھوڑوں کے ان حالات میں غور کریں گے تو آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

ترجمہ:

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا (قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپ ہانپ کر دوڑتے ہیں)

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا (پھر وہ گھوڑے جو اپنی ٹاپوں سے چنگاریاں اڑاتے ہیں)

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا (جو صبح کے وقت یلغار کرتے ہیں)

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (پھر اس موقع پر غبار اڑاتے ہیں)

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (پھر اسی وقت دشمن کے لشکر کے کسی جمگھٹے کے بیچوں بیچ جا گھستے ہیں)

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ (بے شک انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے)

تفسیر:

گھوڑا جب دوڑتا ہے تو اس کے اندر سے ہانپنے کی آواز آتی ہے۔ اور انسان اس کو جتنا تیز دوڑانا چاہے وہ اتنا تیز دوڑتا ہے، کبھی وہ انکار نہیں کرتا۔ چاہے کتنا وقت گذر گیا ہو؛ لیکن اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ مشقت اٹھا کر اپنے مالک کا حکم بجالاتا ہے، پورا

کرتا ہے۔

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا عربی میں اوریٰ-یوری: پتھر کو پتھر سے رگڑ کر آگ نکالنے کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ گھوڑے جب پتھریلی زمین پر دوڑتے ہیں تو ان کے پاؤں جب پتھریلی زمین پر پڑتے ہیں، اور ان کے پاؤں میں نعل لگا ہوا ہوتا ہے تو اس کے ٹکرانے کی وجہ سے پتھر میں سے چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں، اسی کو کہتے ہیں کہ پھر جو اپنی ٹاپوں سے چنگاریاں اڑاتے ہیں۔

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا عرب لوگ چوں کہ عام طور پر صبح کے وقت - جو غفلت کا وقت ہوتا تھا - اپنے دشمن پر حملہ کرتے تھے، تو اسی کو کہا: فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا، دشمن پر چڑھ بیٹھتے ہیں، حملہ کرتے ہیں۔ یہ بھی اپنے آقا ہی کے حکم سے ہے، اس میں اس گھوڑے کا اپنا تو کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے، آقا کہتا ہے تو آقا کا حکم مان کر اس کے ساتھ وفاداری کرتے ہوئے یہ دشمنوں کے مقابلے پر آجاتا ہے اور ان پر حملہ کرتا ہے۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا۔ یعنی صبح کے وقت جب وہ دوڑتے ہیں تو غبار اڑاتے ہیں۔ حالاں کہ صبح کے وقت رات کی ٹھنڈک کی وجہ سے غبار بیٹھا ہوا ہوتا ہے؛ لیکن یہ گھوڑے اتنی قوت کے ساتھ دوڑتے ہیں کہ اس سے غبار اڑتا ہے، اور جب ساتھ دوڑتے ہیں تو فضا ایسی اندھیری ہوجاتی ہے کہ دن میں بھی رات کا سماں ہوجاتا ہے۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا۔ اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتے۔ حالاں کہ دیکھ رہے ہیں کہ دشمن کے ہاتھ میں تلوار ہے، نیزے ہیں، وہ ان تلواروں اور نیزوں سے ہمیں ختم کرے گا؛ لیکن اس کو اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے، اپنے مالک کی وفاداری میں، اس کی حفاظت میں، اس کی خدمت میں، اس کے حکم کو ماننے میں، اس کی اطاعت میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے

لیے تیار ہوجاتا ہے۔گھوڑوں کی یہ ساری خوبیاں بیان کرکے اللہ تعالیٰ آگے اس بات کو پیش کرتے ہیں:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ. یعنی آپ ایک طرف گھوڑوں کے حالات پرغور کیجیے، اور دوسری طرف انسان کے حالات کا مطالعہ کرکے غور کریں، دونوں کا موازنہ اور مقابلہ کریں، ایک دوسرے کی (تلنا) کریں تو آپ کو پتا چلے گا کہ گھوڑا باوجود ایک جانور اور بغیر عقل کا ہونے کے اپنے مالک کے ساتھ جو اطاعت اور فرماں برداری کا معاملہ کرتا ہے، وہ انسان اپنے رب کے ساتھ نہیں کرتا۔ حالاں کہ مالک نے گھوڑے کو صرف چارہ دیا تھا، اور پانی کا انتظام کیا تھا اور کچھ نہیں کیا۔ اور انسان کو تو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہے، پیدا کیا اور اس پر ساری نعمتیں بارش کی طرح برسائیں، اور وہ اللہ کی ساری نعمتوں کو بے دریغ استعمال کرتا ہے اس کے باوجود وہ اتنی بھی وفاداری کا معاملہ نہیں کرتا جتنی گھوڑا اپنے آقا اور مالک کے ساتھ کرتا ہے۔

یہ جو کہا گیا کہ انسان ناشکرا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ انسانیت کے اکثر افراد ناشکرے ہیں۔ اکثر کے اعتبار سے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ فرمایا گیا ہے۔ ورنہ ان ہی انسانوں میں بعض اللہ کے بندے انبیاء، اولیاء اور اللہ کے مقبول بندے اللہ کے ایسے شکر گزار ہیں کہ جس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ لیکن ایسے شکر گزاروں کے مقابلے میں وہ لوگ جو ناشکری کرتے ہیں زیادہ ہیں۔ تو گویا مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو انسان اللہ تعالیٰ کا ناشکرا ہے۔

اب انسان اللہ کا ناشکرا کیسے ہے؟ تو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس کی تین شکلیں بتلائی ہیں، اس کو آئندہ بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ عادیات

(قسط-۲)

(مؤرخہ ۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۹/ جنوری ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً.

أمابعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم○ بسم الله الرحمٰن الرحيم○

وَالۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا ۙ﴿۲﴾ فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرۡنَ بِہٖ نَقۡعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطۡنَ بِہٖ جَمۡعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوۡدٌ ۚ﴿۶﴾ وَ اِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیۡدٌ ۚ﴿۷﴾ وَ اِنَّہٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ ؕ﴿۸﴾ اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ۙ﴿۹﴾ وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾

گذشتہ سے پیوستہ:

سورۂ عادیات کی تشریح کا سلسلہ چل رہا تھا، جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے گھوڑوں

کی قسم کھائی ہے۔

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا (قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپ ہانپ کر دوڑتے ہیں)

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا (پھر وہ گھوڑے جو اپنی ٹاپوں سے چنگاریاں اڑاتے ہیں)

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا (جو صبح کے وقت یلغار کرتے ہیں)

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (پھر اس موقع پر غبار اڑاتے ہیں)

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (پھر اسی وقت دشمن کے لشکر کے کسی جمگھٹے کے بیچوں بیچ جا گھستے ہیں)

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (بے شک انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے)

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (اور وہ خود اس بات کا گواہ ہے)

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (اور بے شک وہ مال کی محبت میں بہت پکا ہے)

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِى الْقُبُوْرِ (بھلا، کیا اس کو وہ وقت معلوم نہیں کہ قبروں میں جو کچھ ہے وہ باہر بکھیر دیا جائے گا)

وَحُصِّلَ مَا فِى الصُّدُوْرِ (اور سینوں میں جو کچھ ہے اسے ظاہر کر دیا جائے گا)

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ (یقیناً ان کا پروردگار اس دن ان کی حالت سے پوری طرح واقف ہے)

خلاصۂ مضمون:

اس سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے گھوڑوں کی قسم کھا کر دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں: (۱) اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (بے شک انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے)۔ (۲) وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (اور بے شک وہ مال کی محبت میں بہت پکا ہے)۔ اخیر میں

اس کو نصیحت فرمائی کہ انسان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قبر میں جتنے بھی مردے ہیں وہ ایک دن باہر نکال کر پھینک دیے جائیں گے، ان کو اللہ تعالیٰ زندہ کریں گے۔ اور لوگوں کے دلوں میں جو راز چھپے ہوئے ہیں وہ باہر آجائیں گے۔ آج کل تو حال یہ ہے کہ آدمی چوبیس گھنٹے ساتھ رہتا ہے؛ لیکن اپنے ساتھی کے دل میں کیا راز ہے؟ وہ اس کو معلوم نہیں۔ لیکن اُس وقت لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کی ایک ایک بات سے پوری طرح واقف تھے۔ یعنی اُس وقت لوگ اس بات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہ سورت کے اس مضمون کا خلاصہ ہے۔

تم کتنی فرماں برداری کرتے ہو......؟؟؟

گذشتہ مجلس میں بتلایا تھا کہ گھوڑے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کا وفادار ہے۔ مالک اس کی تھوڑی سی خدمت کرتا ہے، اس کے، دانا، چارہ، پانی کا انتظام کرتا ہے، اور محض اتنی بات پر وہ مالک کا وفادار بن جاتا ہے، حالاں کہ مالک نے اس کو پیدا کیا، نہ اس کو اعضاء دیے، اور دانا پانی بھی اللہ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں اسی سے حاصل کر کے اس گھوڑے کے لیے انتظام کرتا ہے؛ لیکن گھوڑا اپنے مالک کے اس احسان کا بدلہ ایسی وفاداری کی شکل میں دیتا ہے کہ وہ دشمنوں کے جمگھٹے میں، دشمنوں کے لشکر میں- جو اپنے ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے ہیں، کندھوں پر نیزہ لگائے ہوئے ہیں- گھس جاتا ہے، اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتا، اپنے مالک کے لیے اپنی جان تک کو وہ جوکھوں میں ڈال دیتا ہے، اور قربان کر دیتا ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے گھوڑوں کی وفاداری کو ان قسموں کی شکل میں بیان کیا ہے کہ یہ گھوڑے جن کو تم اپنے دشمنوں کے مقابلے میں استعمال کرتے ہو، ذرا دیکھو تو

سہی! اللہ تعالیٰ نے ان کو بنا کر تمہارے تابع کیا ہے، تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے، وہ تمہاری اتنی وفاداری کے ساتھ خدمت کرتے ہیں، اس کے مقابلے میں تم اپنا حال بھی دیکھو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان نعمتوں کے بدلے میں تم اللہ تعالیٰ کی کتنی اطاعت وفرماں برداری کرتے ہو؟

روانت دادو طبع وعقل وادراک:

انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا، جسم عطا فرمایا، جسم کے قویٰ عطا فرمائے، دیکھنے کے لیے آنکھیں دیں، سننے کے لیے کان دیے، بولنے کے لیے زبان عطا فرمائی، اور اپنے کاموں کو انجام دینے کے لیے ہاتھ دیے، چلنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پاؤں عطا فرمائے، سوچنے کے لیے دل ودماغ عطا فرمایا، اور وہ ہر وقت اللہ کی بے شمار نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہے، اللہ کی ان نعمتوں کو ہر وقت برابر استعمال کرتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود انسان کا کیا حال ہے؟ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ۔ (انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے)۔

شرک؛ بڑی ناشکری:

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ نے ناشکری کی تین شکلیں بیان کی ہیں۔[۱]

ان میں سب سے بڑی ناشکری وہ ہے جو مشرکین کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ناشکری ہے۔ کیسے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری نعمتیں عطا فرمائیں، پیدا کرنے والا، اللہ۔ جسم دینے والا، اللہ۔ سارے قویٰ عطا کرنے والا، اللہ۔ اور ہر وقت، ہر گھڑی اپنی ضرورتوں کے لیے

---

(۱) تفسیر عزیزی ص: ۶۲۱-۶۲۲ (ط: کتب خانۂ فیضِ ابرار، انکلیشور، گجرات)۔

آدمی جن چیزوں کو استعمال کر رہا ہے وہ ساری نعمتیں دینے والا، اللہ۔ اور اس کے باوجود اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں کو انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اللہ کے علاوہ دوسروں کی طرف نسبت کرتا ہے۔ مشرکین عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین وآسمان، سورج وچاند کو تو پیدا کیا ہے؛ لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ-نعوذ باللہ-اب معطل ہو کر بیٹھ گئے ہیں، دوسرے کام جیسے اولاد دینا، روزی دینا، بیماری سے تندرستی دینا اور انسانوں کی حاجت روائی، مشکل کشائی وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری چیزوں کے حوالے کر دی ہے۔ جن بتوں کی وہ پوجا کیا کرتے تھے، (لات، عزیٰ، منات) جو انہوں نے اپنے دل سے، دماغ سے گھڑے ہیں اور ان کی جو حاجتیں پوری ہو رہی ہیں، ان کو ان ہی بتوں کی طرف منسوب کر رہے ہیں کہ وہ اولاد وہ دیتے ہیں، روزی وہ دیتے ہیں، بیماری سے تندرستی دیتے ہیں، مشکل کشائی کرتے ہیں۔ تو یہ شرک ایک بہت بڑی ناشکری ہے، جس کا مشرکین ارتکاب کر رہے ہیں۔

کفر بمعنیٰ ناشکری:

قرآن کریم میں اُن کے اِسی شرکیہ عمل کو کفر سے تعبیر کیا گیا۔ اس لیے کہ کفر عربی زبان کا لفظ ہے، اس کا ترجمہ "ناشکری" ہوتا ہے۔ اور یہ شرک ایسی بڑی ناشکری ہے کہ جس کی اللہ کے ہاں معافی نہیں ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء:۴۸) تو عربی زبان میں ناشکری کے لیے کفر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کافر یعنی اللہ کی ناشکری کرنے والا۔ یہ مشرکین اللہ تعالیٰ کی ان تمام نعمتوں کی جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو عطا فرمائی ہیں اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف نسبت کر کے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی ناشکری کا

ارتکاب کررہے تھے، اس لیے ان کو قرآن میں کافر کہا گیا۔ایک اور جگہ قرآن میں کفر کا لفظ ناشکری کے معنی میں آیا ہے: لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ (ابراھیم:۷) (اگر تم شکر کروگے تو میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میری پکڑ، میری گرفت، میرا عذاب بڑا سخت ہے) دیکھو! یہاں کفرتم کا معنی ناشکری کا ہے۔

حدیث پاک میں بھی کفر کا لفظ ناشکری کے معنی میں آیا ہے۔ بخاری شریف میں روایت ہے نبی کریم ﷺ نے عورتوں کے متعلق ارشاد فرمایا: أُريت النار فإذا أكثر أهلها النساء يكفرن ، قيل:أيكفرن بالله ؟قال: يكفرن العشيرويكفرن الإحسان لو أحسنت إلى إحداهن الدهر ثم رأت منك شيئاً قالت : مارأيت منك خيراً قطّ. (مجھے جہنم کا نظارہ کرایا گیا تو اس میں بڑی تعداد عورتوں کی تھی۔ وہ کفر کرتی ہیں۔تو صحابہؓ نے پوچھا: یکفرن باللہ؟ اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے شوہر کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان کی ناشکری کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ اگر تم زندگی بھر احسان کرو، اور جب کبھی کوئی ناگوار بات پیش آئے گی تو وہ یہی کہے گی کہ میں نے تجھ سے کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی)[1] تو دیکھو! حدیث پاک میں بھی نبی کریم ﷺ نے اسی ناشکری کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔

......پھر بغاوت پر اتر آتے ہیں:

تو کافر سب سے بڑی ناشکری کا مرتکب ہے اسی لیے قرآن پاک میں اس کو یہ لقب دیا گیا۔ یہ مشرکین اللہ کی ان نعمتوں کو استعمال کرکے ان کی نسبت اللہ کی طرف کرنے

(۱) موطأ مالک: ۱۹۹/۲۴۰ و مصنف عبدالرزاق: ۴۹۲۵ ومسند أحمد: ۲۷۱۱، ۳۳۷۴ و صحيح البخاري: ۲۹، ۱۰۵۲، ۵۱۹۷ وصحيح مسلم: ۱۷[۹۰۷] وسنن النسائي: ۱۴۹۳ وغيرها.

کے بہ جائے دوسروں کی طرف کرتے ہیں، دوسروں کو نعمت دینے والا، مشکل کشا اور داتا مانتے ہیں، اس لیے ان کو کافر سے تعبیر کیا گیا۔ بلکہ ان کا حال تو یہ ہے کہ جب ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس وقت اللہ کو پکارتے ہیں۔ جب وہ کشتی میں سفر کرتے ہیں، اور وہ کشتی طوفان میں پھنس جاتی ہے، آگے پیچھے پہاڑوں جیسی موجیں کشتی سے ٹکراتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی اب ڈوبی، تب ڈوبی تو اس موقع پر وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو یاد نہیں کرتے۔ بلکہ اس وقت اللہ تعالیٰ سے یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ہم بچ گئے تو آئندہ تیری ہی عبادت کریں گے۔ قرآن پاک میں سورۂ یونس میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ (یونس:۲۲) (اللہ ہی کی ذات ہے جو تم کو سیر کراتی ہے خشکی میں بھی اور سمندر میں بھی، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو، اور وہ کشتی تمہیں لے کر چلتی ہے، بہت عمدہ ہوا میں، اطمینان کے ساتھ، مرضی کے مطابق۔ اور تم بھی اپنے اس سفر کی وجہ سے خوش وخرم ہوتے ہو۔ اور اچانک تیز وتند ہوا آجاتی ہے، اور سمندر کی موجیں کشتی کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہیں، ان کو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اب تو ہم مارے گئے، موت آگئی، تو دین کو خالص کرتے ہوئے یعنی کسی اور کی شرکت کیے بغیر اللہ ہی سے دعا کرتے ہیں، اللہ کو پکارتے ہیں، اور اللہ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اے اللہ! اگر آپ نے ہم کو اس مصیبت سے نجات دی تو ہم شکر گزار بندوں میں سے ہوجائیں گے)

باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ (یونس:۲۳) (جب اللہ تعالیٰ ان کو اس

مصیبت سے نجات دیتے ہیں، اور وہ صحیح سلامت کنارے پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر بغاوت پر اتر آتے ہیں) گویا ان کا مزاج بن گیا کہ مصیبت آتی ہے تو اللہ کو پکارتے ہیں، وعدہ بھی کرتے ہیں۔

عکرمہ بن ابوجہل کا واقعہ:

سیرت میں واقعہ ہے، فتح مکہ کے موقع پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں داخل ہو رہے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کے لیے عام امن وامان کا اعلان فرمایا تھا۔ البتہ کچھ مجرم ایسے تھے کہ جن کے لیے معافی اور امان نہیں تھا۔ ان میں ابوجہل کے بیٹے حضرت عکرمہ بھی تھے۔ چوں کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح سخت دشمن تھے۔ ان کے لیے بھی یہی اعلان کیا گیا تھا کہ ان کو امان نہیں ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاتحانہ داخل ہو چکے تو انہوں نے دیکھا کہ اب تو ہمارے لیے قتل کے علاوہ کوئی فیصلہ نہیں ہے تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یمن چلے گئے اور یمن سے کشتی میں بیٹھ کر حبشہ جانے کا ارادہ کیا۔ چناں چہ کشتی میں سوار ہوئے، کشتی ابھی تو کنارے سے تھوڑی ہی دور پہنچی تھی کہ موجوں نے آ کر گھیر لیا، کشتی طوفان میں پھنس گئی۔ وہ لات اور عزیٰ کو پکارنے لگے تو کشتی والوں نے کہا کہ یہاں لات وعزیٰ تمہاری مدد نہیں کریں گے، ایک اللہ کو پکارو۔ انہوں نے کہا کہ ایک اللہ یہاں نجات دے سکتا ہے تو خشکی میں بھی وہی نجات دینے والا ہے۔ تو دعا کی کہ یا اللہ! اگر مجھے یہاں سے صحیح سلامت نکال دیا تو میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دوں گا اور ان کو بڑا شریف اور معاف کرنے والا پاؤں گا۔

چناں چہ جب طوفان ختم ہوا اور دوبارہ صحیح سلامت کنارے پر پہنچے تو ادھر ان کی

بیوی ام حکیم بنت حارث بن ہشام- یہ ان کی چچا زاد بہن ہی ہوتی ہیں، حارث بن ہشام ابوجہل کے بھائی ہیں، اور وہ فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے- نے نبی کریم ﷺ کے پاس جا کر اپنے شوہر کے لیے امان حاصل کرلیا۔ اور وہ ان کی تلاش میں یہاں پہنچیں، ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ میں نے آپ کے لیے امان حاصل کرلیا ہے اس لیے تم حضور ﷺ کی خدمت میں چلو۔ ان سے زیادہ شفیق اور مہربان کسی اور کو نہیں پاؤ گے۔ چناں چہ وہ ان کے ساتھ پہنچے، جب حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچنے والے تھے تو حضور ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ عکرمہ مطیع وفرماں بردار ہوکر آرہے ہیں، ان کے باپ ابوجہل کو برا بھلا مت کہنا؛ کیوں کہ مُردوں کو برا بھلا کہنے سے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ اخلاق ہم لوگوں کو سکھائے۔ ابوجہل آپ ﷺ کا سخت جانی دشمن تھا، جس کو اس امت کا فرعون کہا گیا ہے؛ لیکن آپ ﷺ اس کو بھی برا بھلا کہنے سے اس لیے روک رہے ہیں تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔ آج ہمیں اپنے اندر وہ اخلاق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

بہرحال! جب وہاں پہنچے تو ان کی بیوی پردے، برقع میں تھیں، انہوں نے جا کر نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اس نے مجھے بتلایا ہے کہ آپ ﷺ نے مجھے امان دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس نے سچ کہا، تمہیں امن ہے، چناں چہ آپ اسی وقت ایمان لے آئے۔[۱] تو میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مشرکین عرب کا ایک عام مزاج تھا کہ کشتی میں پھنستے تھے تو اللہ کو پکارتے تھے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شرک ہی میں مبتلا ہیں، جن کو ایمان

---

(۱) مغازي الواقدي: ۲/ ۸۵۱ (ط: دار الأعلمي، بيروت) ومصنف ابن أبي شيبة: ۳/ ۳۶۹ (ط: مكتبة الرشد، الرياض) وسنن أبي داود: ۲۶۸۳ والسنن الكبرىٰ للنسائي: ۳۵۱۶ (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت) وتاريخ دمشق لابن عساكر: ۴۱/ ۵۹ [۸۲۰۵] وتهذيب الأسماء واللغات للنووي: ۱/ ۳۳۹ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

کی سعادت حاصل نہیں ہوئی وہ اس وقت تو اللہ تعالیٰ سے یہی وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنا حال درست کرلیں گے؛ لیکن جب نجات مل جاتی ہے تو بغاوت پر اتر آتے ہیں۔

......کبھی اس نے ہم کو پکارا ہی نہیں:

ایک اور موقع پر اسی سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا (یونس:۱۲) (انسان کو جب تکلیف اور مصیبت پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے لیٹے لیٹے بھی، بیٹھے بیٹھے بھی، کھڑے کھڑے بھی) فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ (یونس:۱۲) (پھر جب ہم اس کی تکلیف کو دور کرتے ہیں تو وہ ایسا نکل جاتا ہے کہ کبھی اس نے ہم کو پکارا ہی نہیں) یہ انسان کا مزاج ہے۔ تو بہر حال مشرکین عرب کا حال بھی یہی تھا کہ ساری نعمتوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کے بہ جائے بتوں کی طرف کیا کرتے تھے، اور اس کے بعد جہاں عبادت کا مرحلہ آتا تو عبادت بھی ان ہی بتوں کی کرتے تھے۔ حالاں کہ منعمِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہے، اسی نے یہ نعمتیں عطا فرمائیں، اس کی نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ ہم اسی کی اطاعت وفرماں برداری کریں، اسی کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شرک نہ ٹھہرائیں۔

بہر حال! یہ مشرکین جو سب سے بڑی ناشکری کے مرتکب تھے وہ یہی شرک تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ شرک کی سب سے بڑی ناشکری ہے۔[1] اور اسی کے نتیجے میں وہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ بہر حال! انسان کو جو ناشکرا کہا اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ نعمتوں کی نسبت دوسروں کی طرف کرتا ہے، اور ان نعمتوں کی وجہ سے اللہ کی

---

(۱) تفسیر عزیزی ص:۶۲۱ (ط: کتب خانۂ فیضِ ابرار، انکلیشور، گجرات)۔

اطاعت وفرماں برداری کے بہ جائے بتوں کی عبادت کرتا ہے اوران کے سامنے سجدہ کرتا ہے۔ یہ تومشرکین کا حال بیان کیا گیا۔

مشرک مسلمان:

لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آج کا مسلمان جواپنے آپ کومسلمان کہتا ہے،جس نے لا إله إلا الله پڑھا، اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا، اس کے باوجود وہ محبت اورعقیدت کے نام پر اُن تمام چیزوں کی نسبت اللہ کے بندوں کی طرف کرتے ہیں ۔ ویسے اللہ کے نیک بندوں، اہل اللہ و اولیاء اللہ اور انبیاء سے محبت وعقیدت رکھنا تو ایمان کا جز ہے،لیکن اسی عقیدت ومحبت کے نام پر وہ تمام چیزیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں ان کی نسبت اللہ کے ان بندوں کی طرف کرنا درست نہیں ہے۔ جوکام مشرکین مکہ کرتے تھے آج کا مسلمان اہل اللہ کی عقیدت ومحبت کے نام پر ان ہی چیزوں کی نسبت ان کی طرف کرتا ہے،تو جوکام مشرکین نے کیا اورسب سے بڑی ناشکری کے مرتکب ہوئے وہی آج ہورہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے ساتھ عقیدت ومحبت ہونی چاہیے؛لیکن اس عقیدت و محبت میں آدمی اتنا آگے نہ بڑھ جائے کہ جو چیزیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی خصوصیت ہیں وہ ان نیک بندوں کے لیے ثابت کرنے لگے،حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو بہت اہتمام کے ساتھ امت کواس سے منع فرمایا ہے اورامت کواس سے آگاہ کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے:

لاتطروني كما أطرت النصارى عيسى بن مريم فإنما أنا عبد فقولوا: عبدالله و رسوله (تم تعظیم وتعریف میں اتنا مبالغہ مت کروجونصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی تعظیم وتکریم میں کیا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کواللہ کا بیٹا بنادیا، اللہ کا ایک حصہ دار بنادیا۔ اور میں تو اللہ کا بندہ اور

اس کا رسول ہوں)۔[۱] حضور ﷺ نے اپنے متعلق یہ فرمایا تو دوسروں کا حال تو کیا ہوگا؟

سجدہ اللہ ہی کا حق ہے:

بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی اُس بیماری میں جس میں آپ ﷺ کا انتقال ہوا، حضور ﷺ جب چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے، کبھی ذرا دم گھٹتا تو چہرہ کھول دیتے تھے، اس موقع پر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے: لعن الله اليهود والنصارىٰ اتخذوا قبور أنبيائهم مساجد يحذر ما صنعوا (اللہ کی لعنت ہو یہود ونصاریٰ پر کہ انہوں نے حضرات انبیاءؑ کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا نبی کریم ﷺ امت کو گویا ڈرا رہے ہیں کہ ایسا مت کرنا)[۲] ان لوگوں نے جو حرکت کی اس سے نبی کریم ﷺ ہمیں بچا رہے ہیں۔ وہ لوگ لعنت کے حقدار اسی لیے ہوئے کہ انہوں نے ان کی قبروں کو سجدہ کیا۔ حضور ﷺ امت کو گویا متوجہ کررہے ہیں کہ سجدہ تو اللہ ہی کا حق ہے۔

عقیدت ومحبت کے نام پر:

ایک مرتبہ آپ ﷺ تشریف فرما تھے کہ ایک اونٹ نے آکر سجدہ کیا، پھر آپ ﷺ نے اپنا کان اس کے منہ کے قریب کیا تو اس نے اپنے مالک کی فریاد کی، حضور ﷺ نے اس

---

(۱) جامع معمر: ۲۰۵۲۴ (ط: المجلس العلمي، باكستان) ومسند أبي داود الطيالسي: ۲۴ (ط: دارهجر، مصر) ومسند الحميدي: ۲۷ (ط: دارالسقا، دمشق) ومسند أحمد: ۱۵۴، ۱۶۴، ۳۳۱، ۳۹۱ وصحيح البخاري: ۳۴۴۵، ۶۸۳۰ وغيرها.

(۲) مسند أبي داود الطيالسي: ۲۲۹ ومسند أحمد: ۱۸۸۴، ۸۷۸۸، ۱۰۷۱۶، ۲۱۶۰۴، ۲۱۶۲۵، ۲۴۰۶۰، ۲۴۵۱۳، ۲۴۸۹۵، ۲۶۱۷۸ وصحيح البخاري: ۱۳۳۰، ۱۳۹۰، ۴۴۴۱ وصحيح مسلم: ۱۹ [۵۲۹، ۵۳۰] ومسند البزار: ۱۲۷۸، ۲۶۰۹، ۷۷۰۴، ۹۳۸۴ (ط: مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة) وسنن النسائي: ۲۰۴۷.

کے مالک کو بلوایا اور کہا کہ یہ اونٹ تمہاری شکایت کرتا ہے کہ تم اس سے کام تو لیتے ہو؛ لیکن اس کو دانا پانی، چارہ جیسا دینا چاہیے ویسا نہیں دیتے۔ خیر! مالک کو کہا کہ تم اس کو لے جاؤ، اس کا حق ادا کرو۔ بعد میں صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! اس اونٹ نے جانور ہو کر آپ ﷺ کو سجدہ کیا، کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کریں؟ حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: نہیں۔ بلکہ روایت میں یہاں تک ہے کہ کیا تم میری قبر سے گزرو گے تو مجھے سجدہ کرو گے؟ تو صحابہؓ نے کہا: نہیں۔ صحابہؓ نے کہا کہ جب اونٹ کر رہا ہے تو ہم تو زیادہ حقدار ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! سجدے کا حق تو اللہ ہی کا ہے، اللہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے یہ پیشانی جھک نہیں سکتی ہے۔ اگر انسان کے لیے کسی کے سامنے سجدہ کرنا جائز ہوتا، تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔[۱] حقیقت یہ ہے کہ وہ چیزیں، وہ کام، عبادت کے وہ طریقے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ خاص تھے آج اس امت کا فرد اپنے آپ کو مؤمن اور مسلمان کہتے ہوئے اور لا إله إلا الله کا اقرار کرتے ہوئے وہ ساری چیزیں جو مشرکین مکہ اپنے بتوں کے لیے کرتے تھے عقیدت ومحبت کے نام پر ہم اہل اللہ کے لیے کر رہے ہیں۔ تو وہ ناشکری جس کا اس میں ذکر کیا گیا وہی آج ہمارے اندر بھی پائی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم ایسی ناشکری سے اپنے آپ کو بچانے کا خاص اہتمام کریں۔

آپ ﷺ کی باریک بینی:

نبی اکرم ﷺ تو اس معاملے میں اتنے زیادہ محتاط تھے کہ ایک مرتبہ مال غنیمت حاصل ہوا، آپ ﷺ نے تقسیم فرمایا۔ اور تقسیم کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) مسند أحمد: ۱۲۶۱۴.

إنما أنا قاسم و الله يعطي (میں تو تقسیم کرنے والا ہوں، اور دینے والی ذات تو اللہ کی ہے)[1] حالاں کہ آپ ﷺ بانٹ رہے ہیں؛ لیکن آپ ﷺ لوگوں کو بتلا رہے ہیں کہ تمھیں اگر چہ میرے ہاتھ سے مل رہا ہے؛ لیکن دینے والا میں نہیں ہوں، تم کو چاہیے کہ دینے والا اللہ ہی کو سمجھو۔ آپ ﷺ اس معاملے میں لوگوں کی اتنی زیادہ تربیت فرماتے تھے کہ مال غنیمت کی تقسیم کے موقع پر بھی آپ ﷺ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ میں تو تقسیم کرنے والا ہوں، دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ یعنی اس وقت اگر چہ تم کو میرے ہاتھ سے مل رہا ہے؛ لیکن تم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ میں نے نہیں دیا، بلکہ اللہ نے دیا ہے۔ میرے ہاتھ سے اللہ نے تقسیم کروایا۔ جب ظاہری چیزوں میں آپ ﷺ اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے، تو آج اللہ کے ان نیک بندوں کی قبروں پر جا کر ان کو داتا کہا جا رہا ہے، اور وہاں جا کر اولاد مانگی جا رہی ہے، روزی مانگی جا رہی ہے، شفاء و تندرستی مانگی جا رہی ہے، ان کے نام کی منتیں اور نذریں مانی جا رہی ہیں، تو یہ وہی کام ہیں جو مشرکین کیا کرتے تھے، اور جن کے متعلق اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (بے شک انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے) کہا گیا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ......:

تو سب سے بڑی ناشکری شرک ہے۔ نعمتیں اللہ نے دیں، اور نسبت کر رہے ہیں دوسروں کی طرف۔ دینے والی ذات اللہ کی، اور کہہ رہے ہیں فلاں نے دی۔ اور ان نعمتوں کا دینے والا حقیقی منعم اللہ ہے، اس کا حق یہ تھا کہ اس کی عبادت کی جاتی، اس کے سامنے پیشانی

---

(۱) مسند أحمد: ۷۱۹۳ (ت. شاكر) و صحيح البخاري: ۴/ ۸۴ (ط: دار طوق النجاة) و معجم أبي يعلى الموصلي: ۲ و مسند أبي يعلى الموصلي: ۵۸۵۵ و المعجم الكبير للطبراني: ۷۵۵.

ٹیکی جاتی، اس کے سامنے سجدہ کیا جاتا؛ اس کے بجائے دوسروں کے سامنے سجدے کیے جا رہے ہیں۔

تو ناشکری کا اعلیٰ درجہ شرک ہے۔ اس کے علاوہ دو اور درجے ہیں، جو حضرت شاہ صاحبؒ نے بیان کیے ہیں، ان کو آئندہ مجلس میں بیان کریں گے۔ ہمیں اپنے آپ کو ناشکری کی ان شکلوں سے بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ عادیات

(قسط-۳)

(مؤرخہ ۲۷/جمادی الاولیٰ، ۱۴۴۰ھ مطابق ۲/فروری ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۝

وَ الۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا ۙ﴿۲﴾ فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرۡنَ بِہٖ نَقۡعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطۡنَ بِہٖ جَمۡعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوۡدٌ ۚ﴿۶﴾ وَ اِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیۡدٌ ۚ﴿۷﴾ وَ اِنَّہٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ ؕ﴿۸﴾ اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ۙ﴿۹﴾ وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ ۙ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾

اعلیٰ ترین ناشکری:

یہ سورۂ عادیات ہے۔ پچھلی مجالس سے اس کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اس سورت میں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے گھوڑوں کی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کا بڑا ناشکرا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا جیسا شکر ادا کرنا چاہیے ویسا ادا نہیں کرتا۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کو ناشکری والا یہ طریقہ چھوڑ کر شکر گزاری والا انداز اختیار کرنا چاہیے۔

گذشتہ مجلس میں بتلایا تھا کہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ نے فرمایا کہ ناشکری تین قسم کی ہے۔ سب سے بڑی ناشکری وہ ہے کہ نعمت دینے والی ذات اللہ تبارک وتعالیٰ کی، جس نے ساری نعمتیں عطا فرمائیں، اب انسان ان نعمتوں (اولاد، تندرستی، روزی وغیرہ) کے دینے کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف کرنے کے بہ جائے ان بتوں کی طرف کرتا ہے جن کو اس نے اپنے ہاتھ سے گھڑ لیا ہے۔ گویا نعمتیں دیں تو اللہ نے، اور کہتا ہے کہ لات نے، عزیٰ نے، منات نے یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ اور پھر اس منعم کی ان نعمتوں کی وجہ سے اطاعت وفرماں برداری اور عبادت کرنے کے بہ جائے دوسری چیزوں کی عبادت کرتا ہے، تو گویا یہ بہت بڑی، اعلیٰ درجہ کی ناشکری ہے۔ یہ پہلی قسم ہے۔

ناشکری کی دوسری قسم:

دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جتنی بھی نعمتیں دی ہیں وہ انسان کی مصلحتوں اور ضرورتوں کے پیشِ نظر دی ہیں، انسان اُن نعمتوں کو اللہ کی نافرمانی میں استعمال نہ کرے۔ جیسے: اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک جسم عطا فرمایا، اس میں آنکھیں، زبان، کان، ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ وغیرہ چیزیں دیں۔ اور اس پانچ فٹ کے جسم میں نہ معلوم اللہ تبارک و تعالیٰ نے کیسے کیسے قویٰ فِٹ کر دیے؟ اور یہ سب اللہ نے ہماری ضرورتوں اور مصلحتوں کے

پیش نظر عطا فرمایا ہے، چوں کہ کائنات کی ان تمام چیزوں کو اللہ نے انسان کے لیے پیدا فرمایا اور انسان کے لیے کائنات کی ان چیزوں سے فائدہ اٹھانا اسی وقت ممکن ہے جب اللہ کی دی ہوئی یہ ساری نعمتیں (آنکھیں، زبان، کان، ہاتھ، پاؤں، دل اور دماغ) اس میں موجود ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ان تمام قویٰ ہی کے ذریعے سے انسان کائنات کی ان چیزوں سے کماحقہٗ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ گویا یہ انسان کی ضرورت بھی ہے اور مصلحت بھی۔ یعنی ان قویٰ کو ایسے کاموں میں استعمال کرے جن میں آئندہ چل کر اس کا فائدہ ہے۔ گویا یہ ساری نعمتیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی مقصد کے پیش نظر عطا فرمائیں۔

کچھ پابندیاں بھی……:

چناں چہ آدمی ان نعمتوں کو ضرورتوں اور مصلحتوں میں استعمال کرنے کے بہ جائے اللہ تبارک وتعالیٰ کی منع کردہ چیزوں میں استعمال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کے ساتھ ساتھ کچھ پابندیاں بھی لگا دیں، آنکھیں دیں، تو فرمادیا کہ ان آنکھوں کے ذریعے نامحرم عورتوں کو، اسی طرح جن چیزوں کو دیکھنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ناپسند چیزوں کو نہیں دیکھنا ہے۔ زبان دی، تو فرمادیا کہ اپنی زبان سے ایسی باتیں نہ نکالیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں اور جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ الغرض ان اعضاء اور نعمتوں کے استعمال کے دوران کچھ پابندیاں بھی عائد کی گئی ہیں۔

منعم کے خلاف بغاوت:

لیکن انسان ان پابندیوں کا لحاظ نہ کر کے انہی غلط کاموں میں اِن نعمتوں کو استعمال کرتا ہے۔ مثلاً: کسی آدمی نے آپ کو کوئی سواری دی، گاڑی (car) دی، یا موٹر سائیکل دی

کہ آپ اس کو اپنی ضرورتوں میں استعمال کریں۔آپ ملازمت کے لیے جاتے ہیں، ملازمت کی جگہ کافی دور ہے، وہاں پہنچنے میں بہت مشقت لاحق ہوتی تھی ،بس میں ،ٹرین میں بیٹھ کر جاتے تھے،اس میں کافی وقت ضائع ہوتا تھا،توکسی نے موٹر سائیکل یا گاڑی لے کر دے دی، تاکہ آپ اطمینان سے اپنی ملازمت پر جاسکیں ، اوراسی طرح اپنی دوسری ضروریات میں استعمال کرسکیں۔لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ دیکھو!اس گاڑی کو فلاں فلاں کام (میرے خلاف ، مجھے نقصان پہنچانے) میں استعمال مت کرنا۔اب آپ نے اس کی اس ہدایت پر عمل کرنے کے بجائے اس گاڑی کو نقصان پہنچانے میں استعمال کرنا شروع کردیا۔تو یہ اس کی بہت بڑی ناشکری ہوگی کہ جس نے نعمت دی اس نعمت کو اس کے خلاف بغاوت اور نافرمانی میں استعمال کرے۔

آنکھوں کی ناشکری:

آنکھیں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں،ہمیں ان آنکھوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اپنی ضروریات میں استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے،اس لیے کہ اگر آنکھیں نہ ہوتی تو ہمارے بہت سارے کام رکے رہتے؛لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے فائدے کے لیے اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آنکھیں عطا فرمائیں،ساتھ ہی ساتھ کچھ پابندی بھی عائد کردی۔اب کوئی آدمی آنکھوں کو اُن کاموں میں استعمال کرتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے تو اس پابندی کی خلاف ورزی کرنا یہ آنکھ جیسی اس نعمت کی ناشکری ہے۔

نامحرم کومت دیکھنا.......:

جو لوگ بینائی سے محروم ہیں، ان سے پوچھو کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے؟ یا جن کو اللہ

تبارک وتعالیٰ نے بینائی تو دی تھی؛ لیکن کسی بیماری کی وجہ سے ان کی بینائی چھن گئی ہے، اب وہ اس نعمت سے محروم ہیں، اپنی آنکھوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، ان کے دل سے پوچھو کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے؟ وہ بڑی سے بڑی دولت خرچ کر کے، بڑی سے بڑی قربانی دے کر اس نعمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے؛ لیکن محروم ہیں۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ آنکھ کی شکل میں بہت بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔ ہم کمانے کے لیے، اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آنکھوں کو استعمال کرتے ہیں۔ آپ تجارت یا سروس کریں گے یا کھیتی باڑی کریں گے تو وہاں آنکھوں کی وجہ سے اپنے کاروبار میں بہت زیادہ ترقی کر سکتے ہیں، فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان آنکھوں کو اپنی ضرورتوں میں استعمال کرنے کی اجازت کے ساتھ یہ پابندی بھی عائد کی گئی ہے کہ ان آنکھوں سے نامحرم کو مت دیکھنا۔

میاں بیوی کی محبت، اللہ کی رحمت:

بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے دیکھنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ انعام دیا جاتا ہے۔ جیسے روایتوں میں آتا ہے کہ شوہر جب گھر میں داخل ہو اور گھر میں داخل ہوتے وقت اپنی بیوی کو محبت کی نظر سے دیکھے اور بیوی اپنے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھے، تو اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جب شوہر بیوی کی ہتھیلی کو پکڑتا ہے، تو دونوں کے گناہ اُن کی انگلیوں کے درمیان سے جھڑ جاتے ہیں، یعنی بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔[۱] دیکھیے!

---

(۱) أخرجه الرافعي في التدوين من طريق ميسرة بن علي في مشيخته: ۴۷/۲ و الرافعي في تاريخه عن أبي سعيد (فيض القدير: ۳۳۷۱)

اس روایت کی سند میں اسماعیل بن یحییٰ تیمی ہیں، جو واضعِ احادیث ہیں۔ اس لیے بعض حضرات نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔

شریعت نے بیوی کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنے کی اجازت دی۔ اگر انسان یہی شہوت بھری نگاہ دوسری جگہ ڈالے، جہاں دیکھنے سے اس کو منع کیا گیا تھا تو یہ آنکھ جیسی نعمت کی ناشکری ہوگی۔

دن بھر میں سو حج کا ثواب:

حدیث شریف میں آتا ہے: ما من ولد بارّ ينظر إلى والديه نظرة رحمة إلا كتب الله بكل نظرة حجة مبرورة (جو بیٹا اپنے ماں باپ کا مطیع وفرماں بردار اور ان کو راحت پہنچانے والا ہو، وہ اگر اپنے والدین کو مہربانی کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہر نظر پر اس کو حج مبرور کا ثواب عطا فرماتے ہیں) یہ سن کر حضرات صحابہؓ نے عرض کیا: يا رسول الله! وإن نظر كل يوم مأة مرة؟ (اگر وہ آدمی ایک دن میں سو مرتبہ اپنے ماں باپ کو اس طرح مہربانی کی نگاہ سے دیکھے، تو اس صورت میں بھی ہر ہر نگاہ پر یہ ثواب ملے گا؟) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نعم! الله أكبر وأطيب (جی ہاں! اللہ تعالیٰ کی شان تو بہت اونچی اور بڑی پاکیزہ ہے)[1] اس کے خزانے میں کہاں کمی ہے؟ اگر وہ ایک نظر پر بھی سو حج مبرور کا ثواب دے تب بھی کوئی کمی آنے والی نہیں ہے۔ تو دیکھو! آنکھ کا ایک استعمال یہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ بندے سے راضی ہوتے ہیں۔ آدمی ایسا استعمال کرے تو اس کے نامۂ اعمال میں ثواب کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو جائے گا۔

بدنظری؛ آنکھوں کا زنا:

اگر انسان نامحرموں پر نگاہ ڈالتا ہے تو قرآن کریم میں اس سے منع کیا گیا ہے: قُلْ

---

(۱) مکارم الأخلاق لابن أبی الدنیا: ۲۱۵ وشعب الإیمان للبیهقي: ۷۴۷۲، ۷۴۷۵. (اس روایت میں نہشل نامی ایک راوی ہیں، جو کذاب ہیں، بایں سبب یہ روایت اقرب الی الموضوع ہے۔ دیلمی نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔ اور علامہ ذہبیؒ نے ابوبکر احمد بن موسیٰ بن مردویہ الاصبہانی کے ترجمے میں ان کے طریق سے اس روایت کو ذکر کر کے اس کو منکر قرار دیا ہے)۔

لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور: ۳۰) (آپ ایمان والے مردوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں) وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ (النور: ۳۱) (اور ایمان والی عورتوں سے بھی کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں)۔ حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فالعينان زناهما النظر (آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں، اور ان کا زنا دیکھنا ہے)[۱] جیسے آدمی کسی پرائی عورت کے ساتھ بدفعلی کرے تو وہ زنا کہلاتا ہے، وہ تو شرم گاہ کا زنا ہوا۔ لیکن آنکھوں کا زنا یہ ہے کہ کسی پرائی عورت کو شہوت کی نگاہ سے دیکھے۔ اللہ نے منع فرمایا۔ اب ان آنکھوں سے وہ نامحرم عورتوں کو، پرائی عورتوں کو شہوت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے تو یہ آنکھ کی ایک ناشکری ہوئی، جس کو زنا قرار دیا گیا ہے۔

کڑوے گھونٹ کی حلاوت:

یہ بدنگاہی بڑی خطرناک ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باری تعالیٰ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں:

النظرة سهم من سهام إبليس مسمومة، فمن تركها من خوف الله أثابه جل وعز إيماناً يجد حلاوته في قلبه. (کسی پرائی عورت کو شہوت بھری نظر سے دیکھنا یہ شیطان کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے، باری تعالیٰ فرماتے ہیں جو میرے ڈر اور میرے خوف سے اس بدنگاہی کو چھوڑ دے گا تو اس کے بدلہ میں، میں اس کو ایک ایسی ایمانی کیفیت عطا فرماؤں گا جس کی مٹھاس وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا)۔[۲]

---

(۱) مسند أحمد: ۳۹۱۲، ۸۵۳۹، ۸۸۴۳، ۹۳۳۱، ۱۰۸۲۹، ۱۰۹۱۱ وصحيح مسلم: ۲۱ [۲۶۵۷] ومسند البزار: ۱۹۵۶، ۸۹۱۳، ۹۳۴۱ وغيرها.

(۲) المعجم الكبير للطبراني: ۱۰/۱۷۳ [۱۰۳۶۲] والمستدرك للحاكم: ۴/۳۴۹ [۷۸۷۵].

......تو کیا خیال کریں گے:

دوسروں کے ڈر سے تو آدمی بدنگاہی چھوڑ دیتا ہے، آدمی بدنگاہی کر رہا ہو اور اِس دوران اُس نے محسوس کیا کہ میرے ابّا میری اس حرکت کو دیکھ رہے ہیں، یا میرے استاذ مجھے دیکھ رہے ہیں، یا میرے شیخ مجھے دیکھ رہے ہیں، تو وہ اپنے آپ کو روک لے گا۔ یہ تو بڑوں کی بات ہے، بلکہ اگر چھوٹے دیکھ رہے ہوں، جیسے اگر آدمی بدنگاہی کر رہا ہو اور وہ یہ محسوس کرے کہ میرا بیٹا مجھے دیکھ رہا ہے، یا میرا شاگرد مجھے دیکھ رہا ہے تو وہ فوراً شرما کر اپنے آپ کو روک لے گا۔ اور سوچے گا کہ میرا بیٹا یا شاگرد کیا خیال کریں گے کہ ہمارا باپ یا استاذ کیسا کمینہ ہے؟ تو اپنے اس چھوٹے کے ڈر سے اپنے آپ کو بدنگاہی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

جذبات پر قابو پانے کا نسخہ:

بہت سے لوگ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہم اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی نگاہوں پر کنٹرول نہیں رکھ سکتے۔ ان سے کہو کہ اگر تم بدنگاہی کر رہے ہو اور اِن لوگوں (باپ استاذ، شیخ یا بیٹا، شاگرد) نے تم کو دیکھ لیا تو اپنے آپ کو فورا بچاؤ گے یا نہیں؟ تو کہیں گے: بچائیں گے نا۔ تو ان کے معلوم ہونے کے ڈر سے بچا رہے ہو، مگر اللہ تعالیٰ تو ہر وقت دیکھ رہے ہیں!!! اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى (العلق:۱۴) (کیا اس بندے کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے) يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (غافر:۱۹) (اللہ تبارک وتعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو جانتے ہیں اور ان باتوں کو بھی جو آدمی اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں) اللہ تعالیٰ تو ان ساری چیزوں سے واقف ہیں!!! تو بندوں کے اپنے حال سے واقف ہونے کو

محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ پر کنٹرول کر لیتے ہیں، تو کیا اللہ کی خاطر آپ اپنے آپ پر بدنگاہی سے کنٹرول نہیں کریں گے؟ جب کہ آپ بندوں کے لیے اپنے آپ کو روکیں گے تو کوئی انعام ملنے والا نہیں ہے۔ اللہ کے لیے اپنے آپ کو روکیں گے- يجد حلاوته في قلبه-تو انعام بھی ملے گا۔

۷رمیل کا فاصلہ:

اور یہ آنکھ ایسی عظیم نعمت ہے کہ سائنسداں کہتے ہیں کہ آنکھ جب اندھیرے میں جاتی ہے تو پھیلتی ہے اور اجالے میں آتی ہے تو سکڑتی ہے، وہ اگر اجالے میں آکر نہ سکڑے تو اس صورت میں آدمی دیکھ نہیں سکتا۔ اور اس پھیلنے اور سکڑنے کے دوران آنکھ کے پٹھے اور مسلسل سات (۷) میل کا فاصلہ طے کرتے ہیں۔ اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ قیمتی نعمت ہمیں عطا فرمائی ہے اور ہم اسے بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ اب اگر اللہ کی دی ہوئی ان آنکھوں کو کوئی آدمی اللہ کی نافرمانی میں استعمال کرے، جن چیزوں کو دیکھنے سے اللہ نے منع کیا ہے مثلاً: نامحرم عورتیں، ٹی وی یا موبائل میں نامحرم عورتوں کی تصاویر، ان ہی چیزوں کو دیکھ رہا ہے، تو اس صورت میں وہ اللہ کی دی ہوئی اتنی بڑی نعمت کی ناشکری کر رہا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ تربیت:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بدنگاہی سے بچنے کے لیے ایک عجیب وغریب چیز بتلائی ہے۔ ایک نوجوان نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں زنا کا عادی ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو زنا سے بچا نہیں سکتا۔ میں شریعت کے سارے کام کرنے کو تیار ہوں؛ لیکن زنا کی عادت ایسی ہے کہ وہ مجھ سے چھوٹ نہیں سکتی، آپ مجھے زنا کی

اجازت دے دیجیے۔ نبی کریم ﷺ کے علاوہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس پر ناراض ہو کر سخت سزا دیتا؛ لیکن قربان جائیے نبی کریم ﷺ کی شانِ تربیت پر، کہ آپ ﷺ نے ذرا برابر بھی غصے کا اظہار نہیں فرمایا۔ اپنے قریب بلایا اور محبت سے پوچھا: تم کسی نہ کسی عورت کے ساتھ ہی زنا کرو گے، تو بتلاؤ! اگر کوئی آدمی تمہاری ماں کے ساتھ یہ حرکت کرے تو تم اس کو گوارا کرو گے؟ کہا: ہرگز نہیں۔ تمہاری بیٹی کے ساتھ؟ کہا: ہرگز نہیں۔ تمہاری بہن کے ساتھ؟ کہا: ہرگز نہیں۔ تمہاری خالہ اور پھوپھی کے ساتھ؟ کہا: ہرگز نہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس کے ساتھ تم زنا کرو گے وہ بھی تو کسی کی ماں، کسی کی بیٹی، کسی کی بہن، کسی کی خالہ اور پھوپھی ہوگی۔ کیا وہ اس کو گوارا کرے گا؟ اس نے ہر مرتبہ کہا: نہیں اللہ کے رسول! میری جان آپ پر قربان ہو، پھر آپ ﷺ نے اپنا دستِ بابرکت اس پر رکھا، اور یہ دعا دی: اللهم اغفر ذنبه وطهر قلبه وحصن فرجه (اے اللہ! اس کا گناہ معاف کر دے، دل پاکیزہ بنا دے، اور اس کی شرم گاہ کی (حرام کام سے) حفاظت کر) اس کے بعد یہ جوان اس قسم کے کسی گناہ کی جانب التفات نہیں کرتا تھا۔[1] حضور ﷺ نے جو تعلیم دی وہ ہمارے لیے ہر میدان میں مشعلِ راہ ہے۔

جب ہمارا نفس ہمیں بدنگاہی پر آمادہ کر رہا ہو، تو کسی عورت کو غلط اور شہوانی نگاہ سے دیکھنے سے پہلے آدمی سوچ لے، کہ کیا کوئی آدمی میری ماں کو، میری بیوی کو، میری بیٹی کو اور میری بہن کو اس طرح دیکھے تو میں پسند کروں گا؟ تو جب میں اپنے لیے اس چیز کو پسند نہیں کر سکتا تو میں بھلا دوسروں کی ماں، بہن، بیٹی اور ان کی بیویوں کو کیوں شہوت بھری نگاہ سے دیکھوں؟ حضور ﷺ کی شان تربیت دیکھیے! کہ اس کو اس طریقے سے سمجھایا کہ یہی سوچ

---

(۱) مسند أحمد: ۲۲۲۱۱ و المعجم الكبير للطبراني: ۷۶۷۹، ۷۷۵۹.

آدمی اگر اپنے اندر پیدا کرلے تو ہر قسم کی بدنگاہی سے اپنے آپ کو آسانی سے بچاسکتا ہے۔

اللہ کو یہ گوارا نہیں......:

اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: أحب للناس ماتحب لنفسک... (لوگوں کے لیے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، لوگوں کے لیے وہ چیز ناپسند کرو جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو)[۱] ہم نے دو پیمانے بنا رکھے ہیں، جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو یہ چیز گوارا نہیں ہے۔ تمام بندیاں اللہ تعالیٰ کی ہیں، اللہ کے لیے سب برابر ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زنا کو حرام قرار دیا ہے۔

......تو کوئی بات نہیں:

ہاں! کوئی آدمی نکاح کا ذریعہ- جو شریعت کا بتلایا ہوا ہے- اختیار کرکے عورت کو اپنے لیے حلال کرسکتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ اس عورت سے صحبت کرتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ جیسے ایک باپ اپنی بیٹی کو اپنی رضامندی کے ساتھ کسی کے نکاح میں دیتا ہے، جب نکاح ہو گیا تو باپ کو کبھی ناگوار نہیں ہوگا کہ میرا داماد میری بیٹی کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں کرتا ہے؟ وہ یہ سوچتا بھی نہیں۔ بلکہ اگر ان حقوق کی ادائیگی میں اس کی طرف سے کوتاہی ہو تو شکایت پیدا ہوتی ہے۔ ساری بندیاں، اللہ کی بندیاں ہیں اللہ اس کو گوارا نہیں کرتے کہ اللہ کی کسی بندی کی طرف کوئی آدمی اس طرح شہوت بھری نگاہ سے دیکھے، جو اس کے لیے جائز نہ ہو۔

---

(۱) مسند أحمد: ۱۶۶۵۳، ۱۶۶۵۶ والمعجم الکبیر للطبراني: ۲۲۵.

حضرت سعدؓ کی غیرت:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ زنا کی بات آئی، تو حضرت سعد بن عبادہؓ جو قبیلۂ خزرج کے سردار تھے، انہوں نے یوں کہا کہ میں اگر اپنی بیوی کے ساتھ کسی اجنبی آدمی کو دیکھ لوں نا، تو میں تو تلوار سے اس کا سر اڑادوں گا۔ ان کا یہ جملہ سن کر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ غیرت کی بات ہے، تم کو حضرت سعد کی غیرت پر تعجب ہوتا ہے؟ میں ان سے زیادہ باغیرت ہوں، اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ باغیرت ہیں۔[۱] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زنا کو حرام قرار دیا۔ زنا کرنے والا ایک ناجائز اور غلط طریقے سے ایک عورت کو استعمال کر رہا ہے یہ اللہ کو گوارا نہیں ہے۔ اللہ اس کو سزا دیں گے۔ ہاں! اگر نکاح کے بعد استعمال کرتا تو کوئی اشکال کی چیز نہیں تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے آنکھ جیسی نعمت عطا فرمائی ہے، اس کو اپنی ضرورتوں اور اپنی مصلحتوں (ضرورت اس کو کہتے ہیں کہ جہاں استعمال نہ کریں تو ہمارا نقصان ہو، اور مصلحت وہ کہلاتی ہے جہاں استعمال کرنے میں ہمارا فائدہ ہوتا ہے) میں استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، اس کے خلاف جہاں اللہ نے منع کیا ہے اگر وہاں استعمال کریں گے تو یہ آنکھ جیسی نعمت کی ناشکری ہوجائے گی۔

زبان کی شان:

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں زبان عطا فرمائی، زبان اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے؟ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت کو بیان کیا ہے: اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ

---

(۱) مسند أحمد: ۱۸۱۶۸ وصحيح البخاري: ۶۸۴۶، ۷۴۱۶ وصحيح مسلم: ۱۷ [۱۴۹۹] وغيرها.

وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ (البلد:۹،۸) (کیا ہم نے انسان کے لیے دو آنکھیں، زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے؟) گویا اللہ اپنی اس نعمت کو بطور احسان ذکر فرما رہے ہیں۔ زبان اللہ تعالیٰ کی ایسی عجیب وغریب نعمت ہے کہ آدمی جب سے بولنا سیکھتا ہے، تب سے بولنے کا سلسلہ برابر موت تک جاری رہتا ہے، نہ اس میں کچھ تیل ڈالنا پڑتا ہے، نہ سروس کرانی پڑتی ہے، نہ اوور ہولنگ (over holing) کرانی پڑتی ہے، اور کمال کی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے دل ودماغ اور زبان کا آپس میں ایسا رابطہ قائم کر دیا ہے کہ جہاں آدمی نے ارادہ کیا فوراً زبان اپنا کام شروع کر دیتی ہے، بولنا شروع کر دیتی ہے۔ ایسا نہیں کہ تم سوئچ (switch) آن کرو پھر وہ بولنا شروع کرے گی، اس میں تو دیر ہو جائے گی!!! کیا عجیب وغریب نظام ہے؟ اِدھر دل میں ارادہ ہوا اور اُدھر زبان نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی عجیب وغریب نعمت ہمیں عطا فرمائی ہے۔

دروغ اے برادر مگوز ینہار:

لیکن ساتھ ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں تاکید فرمائی کہ اس کو فلاں فلاں کام میں استعمال مت کرنا۔ زبان کے ذریعے جھوٹ مت بولنا۔ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: إياكم و الكَذِب فإن الكذب يهدي إلى الفجور وإن الفجور يهدي إلى النار (تم اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ، اس لیے کہ جھوٹ آدمی کو گناہ کے راستے پر لے جاتا ہے، اور گناہ والا راستہ آدمی کو جہنم تک پہنچاتا ہے)۔[1]

حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: آدمی جب جھوٹ بولتا ہے تو رحمت کا فرشتہ ایک میل دور چلا جاتا ہے، اس کے منہ سے ایسی بدبو آتی ہے کہ اس بدبو کی وجہ سے

(۱) مصنف ابن أبي شيبة: ۲۵۵۹۹ ومسند أحمد: ۴۱۰۸،۱۶ وسنن أبي داود: ۴۹۸۹ وغيرها.

فرشتہ ایک میل دور چلا جاتا ہے۔[۱]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا مؤمن بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہوسکتا ہے۔ مؤمن بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہوسکتا ہے۔ جھوٹا ہوسکتا ہے؟ فرمایا: جھوٹا نہیں ہوسکتا۔[۲] تو جھوٹ سے اللہ اور رسول نے منع فرمایا۔ ہم اپنی گفتگو میں، اپنے معاملات میں بے دریغ جھوٹ کا ارتکاب کرتے ہیں، ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ میں اللہ کی نافرمانی کررہا ہوں، اللہ کی نعمت کی ناشکری کررہا ہوں۔

ہماری مجالس غیبتوں سے معمور:

اللہ نے غیبت سے منع کیا۔ قرآن میں باری تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ (الحجرات: ۱۲) (تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس کو تو تم ناپسند کرتے ہو) قرآن میں اللہ تعالیٰ نے غیبت کی ایک ایسی خطرناک مثال دی کہ مردار کا گوشت، وہ بھی انسان کا، اور انسان بھی کون؟ اپنا بھائی۔ جس طرح یہ خطرناک ہے، ویسے غیبت بھی ہے۔ اس کے باوجود ہماری مجلسوں میں، ہماری گفتگو میں غیبت کا ارتکاب ہوتا ہے۔ غیبت کرکے اللہ کی زبان جیسی اس عظیم نعمت کی ہم ناشکری کرتے ہیں۔

چغلی؛ زبان کا غلط استعمال:

ایسے ہی چغلی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا يدخل

---

(۱) سنن الترمذي: ۱۹۷۲ ومساوئ الأخلاق للخرائطي: ۱۵۰ و المعجم الأوسط للطبراني: ۷۳۹۸ والمعجم الصغير له: ۸۵۳.

(۲) موطأ مالک رواية الليثي: ۲/ ۹۹۰ [۱۹] (ط: مؤسسة الرسالة) و الجامع لابن وهب: ۵۲۱ (ط: دار ابن الجوزي، الرياض) وشعب الإيمان للبيهقي: ۴۴۷۲.

الجنة قتات (چغلی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا)[۱] اب اسی زبان سے ہم چغلی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ سب وشتم اور گالی گلوچ سے منع کیا، اسی زبان کو ہم گالی میں استعمال کرتے ہیں۔ تو اتنی بڑی نعمت جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہے، اس غلط استعمال کی وجہ سے اللہ کی اس نعمت کی ہم ناشکری کرتے ہیں، اللہ کو ناراض کر رہے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔ کبھی ہم نے نہیں سوچا کہ اس نعمت کو کس غلط جگہ استعمال کر کے ہم اللہ کو ناراض کر رہے ہیں۔

سستا سودا......!!!:

حالاں کہ یہ تو ایک ایسی عجیب وغریب چیز ہے کہ ہم جتنا اللہ کی یاد میں، ذکر میں استعمال کرتے اتنا ہمارے لیے اس میں فائدہ تھا۔

حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: التسبیح نصف المیزان و الحمد للہ یملأہ. (سبحان اللہ نامۂ اعمال تولنے کے ترازو کو آدھا بھر دیتا ہے اور الحمد للہ اس کو پورا بھر دیتا ہے)۔[۲]

بخاری شریف کی روایت میں یہ بھی ہے: کوئی آدمی ایک دن میں سو (۱۰۰) مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ پڑھے گا، تو اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے، چاہے وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔[۳]

اسی طرح حدیث شریف میں وارد ہے کہ کسی آدمی نے سو (۱۰۰) مرتبہ صبح اور سو

---

(۱) مسند أحمد: ۲۳۲۴۷، ۲۳۳۰۵، ۲۳۳۱۰... و مسند البزار: ۲۹۵۴ وغیرهما.

(۲) جامع معمر بن راشد: ۲۰۵۸۲ و مسند أحمد: ۱۸۲۸۷، ۲۳۰۷۳... وسنن الترمذي: ۳۵۱۸، ۳۵۱۹ وغيرها.

(۳) صحيح البخاري: ۶۴۰۵.

(۱۰۰) مرتبہ شام کو سبحان اللہ پڑھا، تو گویا اس نے سو (۱۰۰) حج کیے۔ اور جس نے سو (۱۰۰) مرتبہ صبح، اور سو (۱۰۰) مرتبہ شام کو الحمد للہ پڑھا، گویا اس نے اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے سو (۱۰۰) گھوڑے سواری کے لیے دیے۔ اور جس نے سو (۱۰۰) مرتبہ صبح اور سو (۱۰۰) مرتبہ شام کو لا إله إلا الله پڑھا، تو گویا حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے سو (۱۰۰) غلام آزاد کیے۔[۱] کتنا سستا سودا ہے!!!!! سو مرتبہ سبحان اللہ آپ دو منٹ میں پڑھ لیں گے۔ اور اس پر اتنا بڑا ثواب!!! لیکن ہمیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ ہم یہ فضیلت حاصل کریں۔

حدیث شریف میں آتا ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: لا حول ولا قوة إلا بالله ننانوے (۹۹) بیماریوں کا علاج اور دوا ہے۔[۲] جس میں سب سے کم درجہ غم ہے۔ اب غم ایسی چیز ہے جس کو ہم دور نہیں کر پاتے؛ لیکن لا حول ولا قوة إلا بالله سے ختم ہو جائے گا۔

جنت کی گارنٹی، نبی کی زبانی:

بہر حال! زبان کے صحیح استعمال پر نبی کریم ﷺ نے کیسی بشارتیں سنائی ہیں۔

بخاری شریف کی روایت ہے: من يضمن لي ما بين لحييه و ما بين رجليه اضمن له الجنة (جو آدمی اپنے اس عضو کی جو دو جبڑوں کے درمیان ہے اور اس عضو کی جو دو ٹانگوں کے درمیان ہے (زبان اور شرم گاہ) اس کی مجھے گارنٹی دے، یعنی ان اعضا کو غلط استعمال نہیں کرے گا، تو میں اس کو جنت کی گارنٹی دیتا ہوں)[۳] صرف بچنا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذي: ۳۴۷۱.

(۲) مسند اسحاق بن راهويه: ۱۵۴ والمعجم الأوسط للطبراني: ۵۰۲۸ والمستدرک للحاکم: ۱۹۹۰ والطب النبوي لأبي نعيم: ۲۳۱.

(۳) صحيح البخاري: ۶۴۷۴.

......نہ کرنے پر ثواب:

قدرت کا نظام تو دیکھو! دنیا میں کوئی چیز نہ کرنے پر کوئی معاوضہ نہیں ملتا کہ یہ نہیں کروگے تو ہم تم کو اتنی تنخواہ دیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں دیکھو! تم نہیں کروگے تو تم کو ثواب ملے گا۔ زنا سے بچوگے، بدنگاہی سے بچوگے، تو ثواب ملے گا۔ اپنی زبان کو غلط باتوں سے بچاؤگے، تو جنت کی گارنٹی۔ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کام کے نہ کرنے پر بھی اجر وثواب ملتا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا فضل وکرم ہے۔ لیکن ہم اس سے بھی فائدہ اٹھانے کو تیار نہیں ہیں۔ غلط استعمال کرکے اللہ کی ناراضگی مول لیتے ہیں۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ کوئی آدمی جب اللہ کی رضامندی والا کوئی کلمہ اپنی زبان سے بول رہا ہوتا ہے، اس کو کوئی پرواہ بھی نہیں، کوئی خیال اور دھیان بھی نہیں کہ میں اتنی اونچی بات اپنی زبان سے بول رہا ہوں؛ لیکن اس کے بولنے کی وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ جنت میں اس کے بہت سارے درجات بلند فرماتے ہیں۔ اور جب کوئی بندہ اللہ کی ناراضگی والا کوئی کلمہ اپنی زبان سے بول رہا ہوتا ہے، تب اس کو کوئی پرواہ بھی نہیں، کوئی خیال اور دھیان بھی نہیں ہوتا کہ میں اتنی خطرناک چیز اپنی زبان سے نکال رہا ہوں؛ لیکن اس کے بولنے کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو جہنم میں اتنا دور ڈال دیتے ہیں، جتنا مشرق و مغرب میں فاصلہ ہے۔[۱]

زبان کی کرامت:

دیکھیے! سو سال کا کافر کلمۂ شہادت پڑھ لے تو مسلمان ہوجائے گا، اب تک سو سال

---

(۱) صحیح البخاري: ۶۴۷۷، ۶۴۷۸.

کی بدعملیوں کی وجہ سے وہ جہنم کا حقدار تھا؛ لیکن ایک مرتبہ سچے دل سے کلمۂ شہادت پڑھ لیا تو مؤمن ہوگیا اور جنت کا حقدار بن گیا۔ یہ زبان کی کرامت دیکھو۔ اور اسی زبان سے کوئی مؤمن اگر کلمۂ کفر کہہ دیتا ہے تو سارے اعمال حبط ہو جائیں گے، اور وہ جہنم کا حقدار ہو جائے گا۔ تو زبان ایک ایسی نعمت ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

ہاتھ کی ناشکری:

تو اللہ تعالیٰ نے یہ ساری نعمتیں: زبان، آنکھ، کان، ہاتھ وغیرہ دیں۔ ہاتھ ہمیں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اور اللہ کے دوسرے بندوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے دیے اب اس کے ذریعہ ہم ظلم کریں، لوگوں کو ستائیں، تکلیف پہنچائیں، تو یہ ناشکری ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده (کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذاؤں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں) اب اگر کوئی آدمی اپنی زبان سے، اپنے ہاتھ سے دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہے تو وہ کامل مسلمان کہلائے جانے کا حقدار نہیں ہے۔

پاؤں کی ناشکری:

پاؤں ہمیں اپنی ضرورتوں میں استعمال کے لیے دیے گئے ہیں، یا ان پاؤں سے ایسے کام کریں جس سے اللہ راضی ہو، اللہ کے بندوں کو راحت پہنچے۔ اگر اس کے برخلاف گناہ کے کام میں استعمال کریں گے، ناجائز کاموں میں استعمال کریں گے تو بہت بڑی ناشکری ہوگی۔

مال کی ناشکری:

مال اللہ کی بڑی نعمت ہے۔جن لوگوں کے پاس مال ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے۔اور ہم لوگ اس نعمت کو اللہ کی نافرمانی میں، جہاں اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، وہاں استعمال کر کے اس کی ناشکری اور ناقدری کرتے ہیں۔ساری نعمتوں کا یہی حال ہے۔

تو یہ ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے) یہ ناشکری کی دوسری قسم ہے کہ اللہ کی وہ تمام نعمتیں جو اللہ نے انسان کو اپنی انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر عطا فرمائی ہیں، اور ان میں کچھ پابندیاں عائد کی ہیں، ان نعمتوں کو اللہ کی نافرمانی اور اللہ کی ناراضگی کے کاموں میں استعمال نہ کرے۔

تیسری قسم کی ناشکری کو آئندہ مجلس میں بیان کریں گے۔ان شاء اللہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ عادیات

(قسط-۴)

(مؤرخہ ۴؍جمادی الاخریٰ ۱۴۴۰ھ مطابق ۲؍فروری ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أمابعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

وَالۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا ﴿۱﴾ فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا ﴿۲﴾ فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا ﴿۳﴾ فَاَثَرۡنَ بِهٖ نَقۡعًا ﴿۴﴾ فَوَسَطۡنَ بِهٖ جَمۡعًا ﴿۵﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوۡدٌ ﴿۶﴾ وَ اِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِیۡدٌ ﴿۷﴾ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ ﴿۸﴾ اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ﴿۹﴾ وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّهُمۡ بِهِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾

غیر ذوی العقول کی وفاداری:

سورۂ عادیات کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے۔ جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان

گھوڑوں کی قسم کھائی ہے جن کو اہل عرب دشمنوں کے مقابلے میں استعمال کرتے تھے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے گویا گھوڑوں کی قسم کھا کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ گھوڑے جن کو تم اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ وجدال میں استعمال کرتے ہو، وہ اتنے وفادار ہوتے ہیں کہ وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بھی اپنے مالک کے ساتھ وفاداری کرتے ہیں۔ دشمن کی فوج میں گھس جاتے ہیں اور اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ قسم کھا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ایک طرف تو یہ گھوڑا انسان نہیں بلکہ جانور ہے، غیر ذوی العقول ہے، وہ اپنے مالک کے ساتھ اتنا وفادار ہے کہ مالک نے اس کے لیے چارہ، اور کھانے پینے کا انتظام کیا، اور اس کی ضرورتوں کا خیال کیا، صرف اسی بنیاد پر وہ اپنے مالک کے ساتھ اتنی وفاداری سے پیش آتا ہے کہ اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے، اور اپنے مالک کی حفاظت اور اس کے حکم کی بجا آوری کا اہتمام کرتا ہے۔

اس کے مقابلے میں انسان ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (بے شک انسان اپنے پروردگار کا بہت بڑا ناشکرا ہے) ناشکری کی تفصیل چل رہی تھی کہ ناشکری کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) نعمتوں کی نسبت دوسروں کی طرف:

(۱) سب سے اعلیٰ ناشکری یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ساری نعمتیں ہمیں عطا فرمائیں، ہم ان نعمتوں کو استعمال کر کے فائدہ اٹھا رہے ہیں؛ لیکن ان نعمتوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کے بہ جائے دوسروں کی طرف کرتے ہیں۔ اللہ نے نعمتیں دیں: آنکھ، کان، زبان، دل، دماغ، جسم، ہاتھ، پاؤں، رزق، اولاد، بیماری سے صحت وشفاء وغیرہ۔ اور

ہم دوسروں کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں۔ کہ مجھے تو فلاں داتا کی طرف سے روزی ملی ہے، ان کی طرف سے بیماری سے شفاء ملی ہے، بتوں کی طرف ان کی نسبت کرتے ہیں۔ اور اسی بنیاد پر ان کی عبادت بھی کرتے ہیں۔ حالاں کہ عبادت اللہ کی کرنی چاہیے۔ یہ ناشکری کی پہلی صورت ہے جو سب سے اعلیٰ درجہ کی ناشکری ہے۔

(۲) نعمتوں کے ذریعے منعم کا مقابلہ:

(۲) ناشکری کی دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے ہمیں ہماری ضرورتوں اور مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہوئے بہت ساری نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان نعمتوں کو ہم اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں میں بوقت ضرورت استعمال کرتے ہیں؛ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان ہی نعمتوں کو اللہ کی نافرمانی میں استعمال کرتے ہیں۔ گویا ان نعمتوں کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ جو آنکھیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری ضرورت پوری کرنے کے لیے دی تھیں، نیک کام کرنے کے لیے دی تھیں، ان آنکھوں کو ہم اللہ کی منع کردہ چیزوں میں استعمال کر کے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہی حال تمام نعمتوں کا ہے۔ یہ ناشکری کی دوسری صورت ہے۔

(۳) منعمِ حقیقی کی فراموشی:

(۳) ناشکری کی تیسری قسم- شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں- یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا فرمودہ ان نعمتوں کی محبت ہم پر اس قدر غالب آجاتی ہے، کہ ہم اپنے آپ کو ان کے استعمال میں اتنا غرق کر دیتے ہیں کہ نعمت دینے والی ذات کو ہی بھول جاتے ہیں۔ اور منعمِ حقیقی کی طرف سے غفلت برتتے ہیں، یہ تیسری قسم ہے۔

چناں چہ حضرت محمد بن ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ کَنُوْد اس کو کہتے ہیں جو نعمت کو دیکھے اور نعمت دینے والے کو نہ دیکھے۔[۱] نعمت تو استعمال کر رہا ہے؛ لیکن یہ نہیں سوچتا منعم کون ہے؟ اس کا مجھ پر کیا حق ہے؟ تو گویا ان نعمتوں کی محبت اور ان کی مشغولی نے ہمیں منعم کی طرف سے غافل کر دیا۔ اب ہمیں بھولے سے بھی خیال نہیں آتا کہ یہ نعمت ہمیں اللہ نے دی ہے، ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے، اس کی اطاعت وفرماں برداری اور اس کے احکام کی بجا آوری کرنی چاہیے۔

......یہ تو میرا حق ہے:

انسان کا ایک اور مزاج ہے، کہ انسان نعمتوں کے ملنے پر کبھی یہ نہیں سوچتا کہ یہ نعمتیں مجھے اللہ تعالیٰ نے دی ہیں؛ بلکہ یوں سوچتا ہے کہ میری محنت کی وجہ سے اور میرے حق کے طور پر مجھے ملی ہیں۔ قرآن کریم میں باری تعالیٰ انسان کے اسی مزاج کو فرماتے ہیں:

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ (حم السجدۃ:۵۰) (جب ہم تکلیف کے بعد کسی نعمت سے نوازتے ہیں تو پھر وہ بڑا دندناتا ہوا اور دعوے سے کہتا ہے کہ یہ تو میرا حق تھا جو مجھے ملا)۔ گویا اس کو اللہ کی عطا نہیں سمجھتا۔ یہ اور زیادہ خطرناک ذہنیت اور سوچ ہے۔

کبھی نہیں سوچتے......:

ہم اگر اپنی زندگی کا جائزہ لیں تو صبح سے لے کر شام تک ہم اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ اللہ کی دی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، زبان سے اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، کانوں سے سنتے ہیں، علم حاصل کرتے ہیں، ہاتھوں کو اپنی حاجتوں

---

(۱) تفسیر ثعلبی، تفسیر قرطبی، معارف القرآن (عثمانی) وغیرہ۔

میں استعمال کرتے ہیں، پاؤں سے چل کر اپنے کام انجام دیتے ہیں۔ لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے کہ یہ نعمتیں کس نے دی ہیں؟ اللہ نے دی ہیں، تو ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت:

دیکھو! انسان کو اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ ہم اور آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، اتنا بڑا مجمع ہے، ہر ایک کی ایک عمر ہے، میری عمر پچھتر (۷۵) سال ہے، ہر آدمی سوچے کہ اپنی اتنی طویل عمر میں کیا ہم نے کبھی اپنی زبان سے یہ کہا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمیں آنکھیں عطا فرمائیں۔ ایک مرتبہ بھی ہماری زبان سے ایسا نکلا؟ کیا ہماری زبان سے یہ نکلا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے کان جیسی نعمت عطا فرمائی۔ جو اس نعمت سے محروم ہیں، وہ بہرے ہونے کی وجہ سے بولنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے، یعنی گونگے بھی بن جاتے ہیں۔ اتنی بڑی نعمت اللہ نے ہمیں دی، اتنے سالوں سے استعمال کر رہے ہیں؛ لیکن کبھی بھی ہماری زبان پر یہ نہیں آیا کہ اے اللہ! تو نے کان جیسی نعمت عطا فرمائی، تیرا شکر اور احسان ہے۔ زبان جیسی نعمت عطا فرمائی اس کا شکر ادا نہیں کیا۔ ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ اور ایسی بے شمار نعمتوں میں ہم غرق ہیں؛ لیکن اپنی زبان سے کبھی اس کا شکر ادا کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

از خدائے خویشتن غافل مباش:

ہم اپنا جائزہ لیں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم دن میں کتنی مرتبہ اللہ کے حضور یہ اقرار کرتے ہیں کہ اے اللہ! یہ سب تو نے عطا فرمایا ہے، تیرا احسان ہے، تیرا شکر ہے۔ اللهم لك الحمد كله ولك الشكر كله اے اللہ! تیرا ہی شکر ہے، تیری ہی تعریف ہے کہ تو نے آنکھیں دیں، کان دیے۔ ہم نے اتنی عمر میں کتنی مرتبہ یہ شکر ادا کیا؟ ہر ایک اپنے

اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنا اپنا جائزہ لے اور اس سوال کا جواب حاصل کر لے۔ کیا واقعۃً ہم غفلت میں نہیں ہیں؟ اللہ کی ان نعمتوں کو پوری غفلت کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ کبھی بھی اس نعمت دینے والے کے احسان کا خیال نہ آیا۔

میرا اسیٹھ کتنا اچھا ہے!!!:

ایک ملازم کسی کمپنی میں نوکری کرتا ہے، ایک غلام اپنے آقا کی خدمت کرتا ہے، اس کے آقا نے اس کو مکان دیا، گاڑی دی، ٹیلیفون لگا دیا، اس کی دیگر ضروریات کا انتظام کر دیا۔ تو وہ ساری دنیا کے سامنے گاتا پھرتا ہے کہ مکان مجھے میرے آقا نے دیا، یہ میری گاڑی مجھے آقا نے دی، اور جب بھی مکان میں جائے گا دل ہی دل میں آقا کو یاد کرے گا، کہ میرا آقا کتنا اچھا ہے!!! میرا اسیٹھ کتنا اچھا ہے!!! اس نے مجھے مکان بنا دیا، اس نے مجھے گاڑی دی، اس نے مجھے یہ چیز دی۔ تو انسان کی دی ہوئی چیزوں کے معاملے میں تو ہمارا یہ حال ہے؛ لیکن اللہ نے اتنی عظیم اور بڑی بڑی نعمتیں عطا فرمائیں؛ لیکن کبھی بھولے سے بھی ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ نعمتیں اللہ کی دی ہوئی ہیں۔ نعمتوں میں مشغول ہیں، نعمتیں استعمال کر رہے ہیں، اسی میں اپنے آپ کو کھپا رہے ہیں؛ لیکن نعمت دینے والے کی طرف سے غفلت برت رہے ہیں، اس کو بھول رہے ہیں۔ یہ ناشکری کی تیسری صورت ہے۔

قدرِ نعمت بعد زوالِ نعمت:

دیکھو! جب تک اطمینان اور سکون سے نعمت استعمال کرتے رہتے ہیں، تب تک کبھی خیال نہیں آتا کہ یہ اللہ کی اتنی بڑی نعمت ہے۔ لیکن کوئی بیماری آ گئی جس کی وجہ سے بولنا بند ہو گیا، تو جس کا بولنا بند ہوا اس کو پوچھو اس پر کیا گزرتی ہے؟ دوست آ کر ملتے ہیں اور

جب نہیں بول پاتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ وہ اپنے درد کا اظہار بھی نہیں کرسکتا، لیکن اتنی مدت تک یہ زبان کو استعمال کرتے رہے، اور سالہا سال اللہ کی اس نعمت سے فائدہ اٹھاتے رہے اُس وقت کبھی یہ خیال نہ آیا کہ اس نعمت کا میں شکر ادا کروں۔ کبھی کوئی مصیبت آگئی جس کی وجہ سے بینائی تھوڑی دیر کے لیے چھن گئی، تو کیا ہوگیا؟ جیسے ایک بڑی مصیبت آگئی، آدمی ہکا بکا رہ جاتا ہے، اور بڑی سے بڑی دولت خرچ کر کے اس نعمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب دوبارہ حاصل ہو جاتی ہے تو کہتا ہے: اے اللہ! تیرا شکر ہے تو نے پھر سے دیکھنے کی صلاحیت عطا فرمائی۔ لیکن اب تک جو مسلسل دیکھتا رہا کبھی اس کا شکر ادا کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

گردن از حکمِ داور مپیچ:

حضرات انبیاءؑ کو اللہ تبارک وتعالیٰ دنیا میں اسی لیے بھیجتے ہیں کہ وہ انسان کو اس غفلت سے نکالیں، اور بندہ اللہ کی جو نعمتیں استعمال کر رہا ہے، اس کو متوجہ کریں کہ تم اپنے آپ کو ان نعمتوں میں مشغول کر کے اللہ کو بھول مت جاؤ؛ بلکہ ان نعمتوں کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ نعمت دینے والے کی طرف بھی تمہاری توجہ ہونی چاہیے، اس کی اطاعت و فرماں برداری ہونی چاہیے، اس کے احکام کی بجا آوری ہونی چاہیے۔ یہی اس نعمت کا شکر ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ جب نعمت چھن جاتی ہے تب ہمیں خیال آتا ہے۔ ہم روزانہ دو تین وقت کھانا کھاتے ہیں، اور غفلت کے ساتھ کھانا شروع کیا، اور پورا بھی کرلیا، اس کھانے سے فائدہ اٹھالیا، اپنی بھوک مٹائی، لذت حاصل کرلی۔ لیکن اگر بیماری آگئی، بیماری کی وجہ سے بھوک کا تقاضہ ختم ہوگیا، یا بیماری کی وجہ سے کھانے کی لذت محسوس نہ ہو، تو آدمی

بے چین ہو جائے گا، ڈاکٹروں اور حکیموں کے پاس جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب! چاہے جتنے پیسے لے لو لیکن اس کا یہ علاج کرو۔ کھانا کھاتا ہوں؛ لیکن پتا ہی نہیں چلتا کہ کچھ کھا بھی رہا ہوں یا نہیں، لذت کا احساس نہیں ہوتا۔ تو لذت کے ساتھ کھانا کھانا؛ یہ اتنی بڑی نعمت ہے جس کا آج احساس ہوا۔ اسی طرح کھانا آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے یہ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے؟ آج تک ہمارا دھیان ہی نہیں گیا!!! لیکن جب بدہضمی کی شکایت ہو جائے تو اندازہ ہوگا کہ او ہو! اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت تھی! جس کا میں نے آج تک کبھی شکریے کا اہتمام نہیں کیا۔ حضرات انبیاءؑ آ کر یہی سکھلاتے ہیں کہ بھائی! تم اللہ کی جس نعمت کو استعمال کر رہے ہو، اس کے ساتھ نعمت دینے والے کو بھی یاد کرو، اس کا شکر ادا کرو۔

عجیب ہے......!!!:

شمائل میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: إن الله ليرضىٰ عن العبد أن يأكل أكلة فيحمده عليها و يشرب شربة فيحمده عليها (اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے خوش ہوتے ہیں جب وہ کھانا کھاتا ہے تو کھانے پر اللہ کی حمد اور تعریف کرتا ہے، پانی پیتا ہے تو پانی پر اللہ کی حمد و تعریف کرتا ہے)[1] لو بھئی! ہم نے تو کھایا، اور کھانے پر صرف اتنا ہی کہہ دیا کہ اللهم لك الحمد و الشكر تو بھی اللہ خوش ہوتے ہیں، اور اس پر جنت کا فیصلہ۔ عجیب ہے!!! اللہ کے انعامات دیکھیے! صرف زبان سے شکر ادا کرنا ہے، اس نعمت پر زبان سے اللہ کی حمد کرنا ہے، جو ہم نے کیا وہ تو اللہ کا حق تھا، لیکن اس پر اللہ تعالیٰ خوش ہو کر مزید آخرت کی نعمتوں سے ہمیں نوازتے ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم: ۸۹[۲۷۳۴] و سنن الترمذي: ۱۸۱۶ و السنن الكبرىٰ للنسائي: ۶۸۷۲.

گاہک بھیجنے والا کون......؟؟؟

ایک تاجر دکان پر بیٹھتا ہے، صبح سے شام تک پیسے کمانے میں لگا ہوا ہے، ایک لمحے کے لیے بھولے سے بھی اللہ کو یاد نہیں کرتا؛ یہ سوچتا نہیں کہ صبح سے لے کر شام تک گاہکوں کا یہ جوتا نتا بندھا ہوا ہے، لائن لگی ہوئی ہے، یہ گاہک کس نے بھیجے؟ اللہ نے ان کے دل میں ڈالا۔ تم جس مال کو بیچنے کے لیے دکان کھولے ہوئے ہو، ویسا ہی مال اتنے ہی داموں میں تمہارے پڑوس والا دکان دار بھی بیچ رہا ہے، وہاں ایک گاہک بھی نہیں جاتا، اور آپ کی دکان پر لائن لگی ہوئی ہے، آپ کو ایک لمحہ کی بھی فرصت نہیں۔ آپ پیسے بٹورنے میں تو پڑے ہوئے ہیں؛ لیکن کبھی یہ سوچا کہ ان گاہکوں کو میری دکان پر بھیجنے والا کون ہے؟ اللہ نے ان کے دلوں میں ڈالا۔ تو کبھی اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا یہی حال ہے۔

ترا مال ونعمت فزاید زشکر:

اور کمال کی بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نعمتوں کے شکر ادا کرنے پر ان نعمتوں میں زیادتی کا وعدہ فرمایا ہے: لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراھیم: ۷) (اگر تم شکر کروگے تو ضرور بالضرور میں نعمتوں میں اضافہ کروں گا) وعدہ بھی بالکل پکا ہے کہ ان نعمتوں کے شکر پر نعمت میں زیادتی ہوتی ہے۔ ہم زیادتی تو چاہتے ہیں؛ لیکن کبھی شکر ادا کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ عجیب معاملہ ہے انسان کا۔ اور ہر جگہ یہی حال ہے۔

اس سے بڑی ناشکری کیا ہوگی؟:

آپ کو بمبئی جانا ہے، گھر سے نکلے، رکشا میں بیٹھ کر اسٹیشن جا رہے ہیں، ٹریفک جام ہے تو دل ہی دل میں دعا کریں گے: اے اللہ! کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ٹرین چوک جاؤں، مجھے وقت پر اسٹیشن پر پہنچا دے۔ اب وقت پر اسٹیشن پر پہنچ گیا؛ لیکن شکر کے لیے زبان پر ایک لفظ بھی نہیں آتا۔ اب آگے کی فکر یہ ہے کہ مجھے ٹرین میں جگہ مل جائے، جگہ مل گئی، شکر کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں آیا۔ اب فکر ہے کہ ٹرین اپنے وقت پر منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم درجہ بہ درجہ نعمتیں مانگتے جا رہے ہیں، تمنا اور خواہش کرتے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہماری تمنا اور خواہش کے مطابق نعمتیں دیتے چلے جا رہے ہیں؛ لیکن ہمیں اس نعمت کے شکریے کے لیے ایک لفظ اور ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نکالنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اس سے بڑی ناشکری اور کیا ہوگی؟ ہر آدمی اپنا حال سوچے، ہمیں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

کس نتواند کہ بجا آورد:

حضرات انبیاءؑ لوگوں کو اسی غفلت سے نکالنے کے لیے آتے ہیں۔ لوگوں کو اللہ کی نعمتوں سے واقف کریں کہ یہ اللہ کی نعمت ہے، یہ اللہ کی نعمت ہے۔ اور اس کا شکر تم کو اس طرح ادا کرنا چاہیے، شکر ادا کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ حالاں کہ اللہ کی نعمتیں تو بے حساب ہیں، آدمی شکر ادا کرنا چاہے تب بھی ادا نہیں کرسکتا۔ قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ (سبا-۱۳) (اے داود کے خاندان والو! گھرانے والو! فیملی والو! اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو، میرے بندوں میں شکر کرنے

والے بہت کم ہیں) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں حضرت داودؑ خود مراد ہیں کہ اے داود! اللہ کی نعمتوں کا شکرادا کرو۔اس کے جواب میں حضرت داودؑ نے عرض کیا: اے باری تعالیٰ! تیری نعمتوں کا شکر کیسے ادا کرسکتا ہوں؟ اس لیے کہ جب شکر ادا کروں گا تو شکر ادا کرنے کی توفیق کا ملنا بھی تیری نعمت ہے، پھر اس کا بھی شکرادا کروں گا، پھر واپس نعمت۔تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب تونے جان لیا کہ نعمت میری ہی جانب سے ملتی ہے،تو تونے میرا شکرادا کردیا۔[1] بہرحال! اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ایسی تسلسل کے ساتھ ہیں کہ آدمی ان کا شکرادا نہیں کرسکتا۔

ہر سانس پر دو شکر:

شیخ سعدیؒ نے جہاں گلستاں کی شروعات کی ہے وہاں ایک بات عجیب فرمائی:: *ہر نفسے کہ فرومی رود ممد حیات ست وچوں برمی آید مفرح ذات، پس در ہر نفسے دو نعمت موجود و بر ہر نعمتے شکرے واجب* (ہر سانس جو اندر جاتی ہے وہ آدمی کی زندگی کو بڑھاتی ہے اور جب باہر آتی ہے تو وہ آدمی کے لیے فرحت ہے) اس لیے کہ اندر کی سانس اگر اندر ہی رہ جائے تو آدمی کا دم گھٹ جائے اور مرجائے۔دم گھٹنے کی وجہ سے آدمی کیسی تنگی محسوس کرتا ہے؟ جب سانس نکلتی ہے تو ایک فرحت اور خوشی کا احساس ہوتا ہے۔پھر شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں (ہر سانس میں دو نعمت ہیں، اس کا اندر جانا بھی نعمت، اس کا باہر نکلنا بھی نعمت ہے،تو گویا ہر نعمت پر شکر واجب) تو ایک سانس میں دو شکر۔اور ایک سانس میں دو شکرادا کرنے جائے گا اتنے میں تو دوسری اور تیسری سانس آجائے گی۔انسان پوری زندگی خالی سانس کا شکرادا کرنا چاہے

---

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۶/۵۰۱ والدر المنثور: ۶/۶۸۰ نقلاً عن ابن أبي حاتم عن الفضیل.

تب بھی نہیں کرسکتا۔لہٰذا ہم تو اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے سورج کی روشنی استعمال کررہے ہیں، زمین سے فائدہ اٹھارہے ہیں، اور بے شمار نعمتوں سے فائدہ اٹھارہے ہیں، ان کی بات تو دور کی رہی، خالی سانس کا شکر ادا کرنا چاہیں تو بھی وہ ادا نہیں کرسکتے۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (النحل:۱۸) (اللہ کی نعمتوں کو اگر تم شمار کرو تو اس کو شمار نہیں کرسکتے) جب شمار نہیں کرسکتے، تو شکر کہاں ادا کرسکتے ہیں؟

شکر پر پہلا وار شیطان کا:

جب شیطان کو حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو شیطان نے سجدہ نہیں کیا، قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف:۱۲) (میں ان سے بہتر ہوں (میں ان کو کیسے سجدہ کروں گا؟) مجھے تو آپ نے آگ سے پیدا کیا اور ان کو مٹی سے پیدا کیا) اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی بارگاہ سے مردود کیا، تو شیطان نے کہا کہ اِن (آدمؑ) کی وجہ سے مجھے آپ کی بارگاہ سے مردود ہونا پڑا، اب اِن کی اولاد کی خبر لوں گا۔ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (الاعراف:۱۲) (میں ان کو گمراہ کرنے کے لیے آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے ان پر حملہ کروں گا، اور اے پروردگار! تو ان میں سے اکثروں کو شکر گزار نہیں پائے گا) شیطان کا پہلا حملہ شکر پر ہوتا ہے۔ چناں چہ کتنے شکر کرنے والے ہیں؟

بیمار کے تو وارے نیارے:

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں **کنود** اس کو کہتے ہیں جو مصائب کو یاد رکھے اور

نعمتوں کو بھول جائے۔[۱] بخار آیا تو عین اُس وقت جب بخار ہے شکایت کرتا ہے کہ بخار ہے، بخار ہے، بخار ہے۔ بخار کے وقت وہ اللہ کی کتنی نعمتیں استعمال کر رہا ہے؟ اللہ کی پیدا کی ہوئی ہوا سے سانس لے رہا ہے، اللہ کی پیدا کی ہوئی روشنی سے فائدہ اٹھا رہا ہے، کھانا کھا رہا ہے اور جس بیماری کو وہ مصیبت سمجھتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی عنایت ہوتی ہے کہ بیماری کی وجہ سے گھر کے سب لوگ آ کر اس کی خبر لے رہے ہیں، خدمت کر رہے ہیں۔ دوستوں کے فون آ رہے ہیں، ہم نے سنا آپ کو بخار ہو گیا ہے، کیسی طبیعت ہے؟ اگر ہسپتال میں داخل کرنے کی نوبت آتی ہے تو جوق در جوق لوگ آپ کی خبر لینے کے لیے آ رہے ہیں۔ آپ کو پتا چل رہا ہے کہ دنیا میں آپ سے محبت کرنے والے کتنے ہیں؟ یہ بخار نہ آتا تو پتا نہ چلتا۔ لہٰذا یہ بخار بھی اس معنی کر کے اللہ کی ایک نعمت ہے۔ لیکن آدمی ان ساری چیزوں کو بھول کر اسی کی شکایت کرتا ہے۔ یہ انسان کا مزاج ہے۔

شکر کی ادائیگی کا نبوی طریقہ:

صبح کی دعا:

حضور ﷺ نے شکر کی ادائیگی کے مختلف طریقے بتلائے: مشکوٰۃ شریف میں روایت ہے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: من قال حين يصبح اللهم ما أصبح بي من نعمة أو بأحد من خلقك فمنك وحدك لا شريك لك فلك الحمد ولك الشكر فقد ادّى شكر يومه.... (جو آدمی صبح کے وقت یہ دعاء پڑھ لے گا: اے اللہ! آج صبح میں جتنی نعمتیں مجھے حاصل ہوئیں، اور تیری مخلوق میں سے سب کو جو بھی نعمتیں حاصل ہوئیں وہ سب تیرے

(۱) تفسير الطبري و تفسير ابن كثير و معارف القرآن (عثمانی) وغيرها.

اکیلے ہی کی طرف سے ہیں، اس میں تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ بس! تیری ہی ہیں سب تعریفیں، اور تیرا ہی ہے سب شکر۔ اس نے اس دن کا شکرادا کردیا......)[۱] یہ اللہ کا احسان ہے کہ صرف ایک دعا پڑھنے کی وجہ سے دن بھر کی نعمتوں کا شکر ادا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے ذریعے کتنا آسان راستہ ہم کو بتلادیا؟

شام کی دعا:

پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں: اسی طرح کا جملہ شام کو کہے: اللهم ما امسى بي من نعمة أو بأحد من خلقك فمنك وحدك لا شريك لك فلك الحمد ولك الشكر (اے اللہ! اس شام کو جتنی نعمتیں مجھے اور تیری مخلوق کو حاصل ہوئیں وہ تیرے اکیلے کی طرف سے ہیں، اس میں کوئی شریک نہیں، بس! تیرے ہی لیے ساری تعریف اور تیرے ہی لیے سارا شکر ہے) تو رات بھر کی نعمتوں کا اس نے شکرادا کردیا۔[۲] کتنا آسان طریقہ نبی کریم ﷺ نے بتلایا!!! ایک دعا صبح پڑھنی ہے، وہی دعا ایک کلمہ بدل کر شام کو پڑھنی ہے، گویا ہم نے دن بھر اور رات بھر کی نعمتوں کا شکرادا کردیا۔

بنامِ خدا می کنم ابتدا:

شکر کی ادائیگی کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہر کام کی شروعات اللہ کے نام سے کرو۔

كل كلام أو أمر ذي بال لا يبدأ فيه (أو لا يفتح) بذكر الله (أو بالحمد لله) فهو أبتر أو قال أقطع (ہر مہتم بالشان کلام یا کام جو اللہ کی حمد سے شروع نہ کیا گیا ہو وہ ناقص اور ادھورا رہتا

---

(۱) سنن أبي داود: ۵۰۷۳ ومشكاة المصابيح: ۲۴۰۷ [۲۷].

(۲) سنن أبي داود: ۵۰۷۳ ومشكاة المصابيح: ۲۴۰۷ [۲۷].

ہے)[۱] کھانا کھاؤ تو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھو۔ پانی پیو تو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھو۔ کوئی اہم کام شروع کرو تو بسم اللہ پڑھو۔ گویا اس کلمے کے ذریعے حضور ﷺ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ہم یہ کلمہ پڑھ کر اللہ کے حضور اس کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اے اللہ! تیری توفیق سے میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اگر تیری توفیق شامل حال نہ ہوتی تو میں یہ کام نہ کر سکتا۔

بسم اللہ کی برکت کھانے میں:

اسباب کو اختیار کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے، اس دنیا کو دار الاسباب بنایا ہے؛ لیکن اسباب میں تاثیر اللہ تعالیٰ نے ڈالی۔ کھانے کو بھوک دور کرنے کا ایک سبب اللہ نے بنایا ہے لیکن کھانے میں بھوک کو دور کرنے کی تاثیر کس نے رکھی؟ اللہ نے۔ لہٰذا جب ہم بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر کھانا کھائیں گے، تو اللہ تعالیٰ کی تاثیر سے بھوک دور ہوگی۔ ورنہ بہت سے لوگوں کو ایک بیماری ''جوع البقر'' ہو جاتی ہے، اس میں کھانا کھا رہے ہیں؛ لیکن بھوک دور نہیں ہوتی۔ اسی طرح استسقاء کا مرض ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے پانی پی رہے ہیں؛ لیکن پیاس دور نہیں ہوتی۔ گویا اس بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے کلمے سے ہمیں ایک بہت بڑا سبق دیا گیا ہے، کہ ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہونے کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ اور اس سبب کو میں اللہ کے حکم کی وجہ سے اختیار کر رہا ہوں۔

---

(۱) مسند أحمد: ۸۲۹۷ وسنن ابن ماجه: ۱۸۹۴ والسنن الكبرىٰ للنسائي: ۱۰/ ۲۵۵ ومسند البزار: ۷۸۹۸ والمعجم الكبير للطبراني: ۱۹/ ۷۲ [۱۴۱].

بسم اللہ کی برکت دکان میں:

آپ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر دکان کا تالا کھولو گے، تو گویا آپ یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اے اللہ! دکان روزی دینے والی نہیں ہے، روزی دینے والا تو ہے، تیرے حکم سے میں نے سبب اختیار کیا ہے۔ تو گویا ہر سبب میں تاثیر پیدا کرنا کس کا کام ہے؟ اللہ کا۔

بسم اللہ کی برکت دوا میں:

آپ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر دوا کھائیں گے، تو گویا اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ اس دوا میں صحت اور شفا ڈالنا تیرا کام ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہی دوا اسی بیماری میں ایک مہینہ پہلے کھائی تھی تو ٹھیک ہو گیا تھا۔ لیکن وہی بیمار آج اُسی بیماری میں وہی دوا کھا رہا ہے؛ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ ابھی میں ایک بیماری سے گزر رہا ہوں، ایک دوا آدھی چمچی صبح میں کھا لیتا تھا، فائدہ ہوتا تھا۔ ابھی کئی دنوں سے بواسیر کا خون نکل رہا ہے، دوا کھاتا جا رہا ہوں؛ لیکن کوئی فائدہ نہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ بتلانا چاہتے ہیں کہ دوا میں اثر ڈالنا میرا کام ہے۔ ہم اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ اللہ ہی کی قدرت ہے، ہمارے بس میں ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔ تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

دعا؛ شکریے کا طریقہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موقع بہ موقع مختلف دعائیں ہم کو بتلائیں۔ کپڑا اپنا پہن رہے ہیں تو پہنتے وقت اللهم لك الحمد كما كسوتنيه أسألك خيره وخير ما صنع له وأعوذ بك من شره وشر ما صنع له (اے اللہ! تیری تعریف کہ تو نے یہ کپڑا مجھے عطا فرمایا، اب میں

جس کام کے لیے وہ بنایا گیا اس کی خیر اور اس کپڑے کی خیر تجھ سے مانگتا ہوں، اور جس مقصد میں استعمال ہوتا ہے اس کے شر اور اس کپڑے کے شر سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں)[۱]

الغرض! ہر نعمت اور ہر چیز کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے موقع بہ موقع مختلف اوقات میں جو دعائیں تلقین فرمائی ہیں، اگر ان کو پڑھنے کا اہتمام کریں گے، تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہوگا، جو نبی کریم ﷺ نے ہم کو بتلایا۔

کھانا کھا کر پڑھیں گے: الحمد لله الذى أطعمنا و سقانا وجعلنا مسلمين (تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے ہمیں کھلایا پلایا اور مسلمان بنایا)[۲] کھانے پینے کے ساتھ اسلام کی نعمت کا بھی شکر ادا ہوا، کہ اسی نعمتِ اسلام کی وجہ سے آج ہم شکر ادا کرنے کے قابل ہوئے۔ تو بہر حال! یہ جو صبح و شام اور مختلف مواقع کی دعاؤں کو باقاعدہ یاد کر کے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ جس کی وجہ سے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا ہوگا، اور شکر کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اللہ کی نعمتوں کو استعمال کرنے کا حق بھی ادا ہوگا۔

میری ناشکری کی سزا.......:

تو یہ تیسری ناشکری تھی کہ آدمی نعمتوں میں لگ کر نعمت دینے والے کو بھول جائے۔ آج کل یہی ہو رہا ہے۔ مال دیا، تو آپ مال خوب استعمال کر رہے ہیں؛ لیکن کبھی بھولے سے یہ خیال نہیں آتا کہ یہ مال کس نے دیا؟ میں اس کا شکر کروں۔

ہمارے حضرتؒ نے قصہ سنایا تھا کہ ایک بزرگ تھے حضرت مولانا احمد شاہؒ،

---

(۱) مسند أحمد: ۱۱۲۴۸، ۱۱۴۵۹ و المنتخب لعبد بن حُمید: ۸۸۲ وسنن أبي داود: ۴۰۲۰ وسنن الترمذي: ۱۷۶۷ و السنن الكبرىٰ للنسائي: ۱۰۰۵۹.

(۲) مسند أحمد: ۱۳۱۳، ۱۱۲۷۶، ۱۱۹۳۴ وسنن أبي داود: ۳۸۵۰ وسنن ابن ماجه: ۳۲۸۳.

مرادآباد کے پاس ایک گاؤں کے رہنے والے تھے حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ بہت اونچی نسبت والے تھے۔تو ان کو اخیر میں کسی بیماری کی وجہ سے پیشاب کے لیے تھیلی لگانی پڑی۔تو وہ پیشاب کی تھیلی ہاتھ میں لیے رہتے تھے، کسی نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہے؟ تو جواب میں فرماتے تھے کہ میری ناشکری کی سزا ہے، پوری زندگی بڑے اطمینان کے ساتھ پیشاب ہوتی رہی؛ لیکن کبھی اس پھوٹی زبان سے یہ نہیں کہا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے اطمینان کے ساتھ پیشاب کرادی۔اب اس ناشکری کی سزا بھگت رہا ہوں۔

پیشاب رُک جائے تو......؟؟؟:

ایک آدمی ہے جو بالکل اپاہج ہے، پاؤں بھی کام نہیں کرتے، پڑا ہوا ہے، مکھیاں اس پر بھنبھنا رہی ہیں، وہاں سے لوگ گزر رہے ہیں۔ایک بزرگ وہاں سے گزرے۔ انہوں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اس پر اللہ کی کیا نعمتیں ہیں؟ کہا: کیا نعمتیں ہیں؟ فرمایا کہ کیا وہ اطمینان کے ساتھ سانس نہیں لے رہا ہے؟ کیا اطمینان کے ساتھ اس کو پیشاب نہیں ہورہا ہے؟ اگر پانچ منٹ کے لیے پیشاب رک جائے تو ہمارا کیا حال ہوتا ہے؟

تندرستی ہزار نعمت:

صحت ایک نعمت ایک ہے، بلکہ ہزاروں نعمتیں ہیں۔آنکھ کی صحت الگ نعمت ہے، زبان کی صحت الگ نعمت ہے، کان کی صحت الگ نعمت ہے، ناک کی صحت الگ نعمت ہے، ہاتھ کی صحت الگ نعمت ہے، پاؤں کی صحت الگ نعمت ہے، دل و دماغ کی صحت الگ نعمت ہے، گردے کی صحت الگ نعمت ہے۔ہر عضو کی صحت اپنی جگہ الگ نعمت ہے۔ایک تندرستی میں ہزار نعمتیں ہیں۔گجراتی میں بولتے ہیں એક તંદુરસ્તી હજાર નેઅમત. حقیقت تو

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں جتنے اعضاء پیدا فرمائے، ان سب میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر کام کر رہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نہیں؛ بے شمار نعمتیں ہیں۔ ہم کتنے کا شکر ادا کرتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ عادیات

(قسط-۵)

(مؤرخہ ۱۱؍جمادی الاخریٰ ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۶؍فروری ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم۝

وَ الْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۝۱ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ۝۲ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ۝۳ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝۴ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝۵ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝۶ وَ اِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِیْدٌ ۝۷ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۝۸ اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ۝۹ وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ۝۱۰ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ یَوْمَىِٕذٍ لَّخَبِیْرٌ ۝۱۱

انسان بڑا ناشکرا ہے:

سورۂ عادیات کی تشریح چل رہی ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ

لَكَنُوْدٌ اللہ تبارک وتعالیٰ نے گھوڑوں کی قسم کھا کر انسان کی ایک خرابی اور نقص کو بیان کیا کہ انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔ گویا ایک طرف آپ گھوڑوں کے حالات پر نظر کیجیے، دوسری طرف انسان کا حال دیکھیے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان اپنی ناشکری میں کہاں تک پہنچا ہوا ہے؟ ناشکری کی تین صورتیں آپ کے سامنے بیان کی گئیں۔

خود گواہ ہے:

آگے باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (اور وہ خود اس بات کا گواہ ہے) یعنی خود انسان اپنے ناشکرا ہونے کا گواہ ہے۔ کیسے؟ انسان صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش میں سر سے لے کر پاؤں تک ڈوبا ہوا ہے، چوبیس گھنٹے، ہر گھڑی، ہر لمحہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ان نعمتوں کو استعمال کر رہا ہے؛ لیکن اس کا جو شکر ادا کرنا چاہیے وہ نہیں کرتا۔ انسان اپنی زندگی کے اس طرز عمل پر خود گواہ ہے کہ وہ اللہ کا بڑا ناشکرا ہے۔ باہر سے گواہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آگے باری تعالیٰ ان ہی گھوڑوں کی قسم کو سامنے رکھ کر ایک دوسری خرابی اور نقص بیان فرماتے ہیں: وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (انسان مال کی محبت میں بہت آگے بڑھا ہوا ہے، بہت پکا ہے)۔

ایک زمانہ ایسا آئے گا......:

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مال کو لفظ ''خیر'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرآن میں دیگر جگہوں پر بھی مال کو لفظ خیر سے تعبیر کیا گیا ہے، یہاں بھی اللہ تبارک تعالیٰ نے مال کو خیر بتلا کر فرمایا کہ انسان مال کی محبت میں بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ مال کی محبت انسان پر

چھائی ہوئی ہے، اس کے دل میں پیوست ہوچکی ہے، اور اسی وجہ سے جب وہ مال کو حاصل کرنے کے درپے ہوتا ہے تو جائز و ناجائز، حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں کرتا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی پیشین گوئی بخاری شریف میں ہے: يأتي على الناس زمان لا يبالي المرء ما أخذ منه أمن الحلال أم من الحرام (ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ آدمی اس بات کی پرواہ نہیں کرے گا وہ جو مال حاصل کررہا ہے وہ حلال ہے یا حرام)[۱] بس! مال چاہیے۔ آج کل یہ مزاج عام ہورہا ہے۔ گویا مال حاصل کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ مال کی محبت انسان کے دل میں پیوست ہوچکی ہے۔

مال خیر کیسے......؟؟؟:

آیت میں اللہ تعالیٰ نے مال کو لفظ خیر سے تعبیر فرمایا اور خیر تو بھلائی کو کہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اور شریعت مطہرہ نے مال کمانے کا جو طریقہ ہمیں بتلایا ہے، اگر اس طریقے کے مطابق مال حاصل کیا جائے اور استعمال کیا جائے، تو وہ مال خیر اور بھلائی ہی بھلائی ہے۔ پہلے بھی بتلایا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قیامت کے روز میدان حشر میں انسان سے جو پانچ سوال کیے جائیں گے، ان میں دو سوال تو مال ہی سے متعلق ہیں من أين اكتسبه و فيم أنفقه؟ (کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا)[۲] لہٰذا آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دراصل مال اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے، جو اللہ تبارک تعالیٰ نے بندوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے عطا فرمائی ہے، کہ اس کے بغیر انسان کی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں۔ انسان کو بھوک لگتی ہے، کھانے کی ضرورت ہے،

---

(۱) مسند أحمد: ۱۸۳۲۸ وصحيح البخاري: ۲۰۵۹ و سنن الترمذي: ۱۲۰۵ و المعجم الكبير للطبراني: ۲۱/۳۴[۱۲] وغيرها.

(۲) سنن الترمذي: ۲۴۱۶ وغيره.

پہننے کے لیے لباس کی ضرورت ہے، سر چھپانے کے لیے مکان کی ضرورت ہے۔ ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مال کو پیدا فرمایا ہے۔ اگر جائز وحلال طریقے سے کماتا اور جائز وحلال طریقے سے استعمال کرتا ہے، تو وہ انسان کے حق میں خیر ہی خیر ہے۔ اس کے ذریعے سے وہ اللہ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مال کو خیر سے تعبیر فرمایا۔

نعم مال صالح خواندش رسول:

حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد وارد ہے: نعم المال الصالح للرجل الصالح (پاک اور حلال مال جو جائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہو وہ نیک آدمی کے لیے بہت اچھی چیز ہے)[1] مال بھی پاک اور حلال ہو، اور جس کے ہاتھ میں وہ مال ہے وہ بھی صالح اور مطیع وفرماں بردار ہو۔ لہٰذا مال کو جائز طریقوں سے حاصل کر کے جائز طریقوں سے خرچ کرنے کو نبی کریم ﷺ بہترین چیز فرما رہے ہیں۔

مال سے خدمت لیجیے!!:

ویسے مال اپنی ذات کے اعتبار سے بری چیز نہیں، خیر ہی خیر ہے۔ تو برا کیا ہے؟ اس کی محبت۔ جو دل میں پیوست ہو جاتی ہے اور سارے معاملات کو الٹ دیتی ہے۔ مال کو اللہ تعالیٰ نے انسان کا خادم بنا کر پیدا کیا ہے، نہ کہ انسان اس مال کی خدمت میں لگ جائے اور اس کو مخدوم بنا دے۔ مال سے خدمت لیجیے۔ جب تک اس کی محبت آپ کے دل میں گھر نہ کر لے، پیوست نہ ہو جائے، تب تک وہ آپ کے حق میں خیر ہی خیر اور بھلائی کا ذریعہ ہے۔

---

(۱) مسند أحمد: ۱۷۷۶۳ و الأدب المفرد: ۲۹۹ والصحیح ابن حبان: ۳۲۱۰.

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است:

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی شریف نامی ایک کتاب ہے، اس میں بڑے عمدہ حقائق و معارف کو مختصر لفظوں میں، اشعار میں بیان فرمایا ہے۔ ہمارے اکابر کے ہاں اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے کا بڑا اہتمام تھا، حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ تو باقاعدہ اس کا درس دیتے تھے۔ حضرت حکیم الامتؒ کے ہاں بھی اس کے درس کا سلسلہ ہوتا تھا۔ بڑے عجیب عجیب حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ تو مولانا جلال الدین رومیؒ نے مال کو سمجھانے کے لیے اشعار میں ایک عجیب وغریب مثال دی:

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است　　　　آب اندر زیر کشتی پشتی است

مال و دولت کی مثال دریا کے پانی کی طرح ہے، اور انسان کی مثال کشتی کے مانند ہے۔ اگر پانی کشتی کے آگے، پیچھے، دائیں، بائیں اور نیچے ہو، تو وہ کشتی کو چلاتا ہے، دھکے دیتا ہے، آگے بڑھاتا ہے، جب تک پانی کشتی سے باہر ہے؛ مفید اور کارآمد ہے، لیکن اگر یہی پانی کشتی میں داخل ہوگیا تو اب وہ پانی کشتی کو ڈبودے گا۔ اسی طریقہ سے مال کی محبت اگر انسان کے دل میں پیوست ہوجائے، تو یہی مال انسان کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

بے مال بدحال:

مال ایسی ضروری چیز ہے کہ اس کے بغیر آدمی کا کام نہیں چلتا۔ مال نہیں ہوگا تو کھائے گا کہاں سے؟ پہنے گا کیا؟ رہے گا کہاں؟ اپنی ضرورتیں کیسے پوری کرے گا؟ ضرورت کی چیز ہے؛ لیکن اس کے باوجود اس کو اپنے دل میں جگہ نہیں دینی چاہیے؛ بلکہ باہر رکھ کر فائدہ اٹھانا چاہیے۔ جیسے کشتی کے باہر پانی ہوتا ہے تو وہ اس کے لیے مفید اور کارآمد ہوتا

ہے، اس کو دھکے دیتا ہے، آگے چلاتا ہے، اور اگر اندر گھس جائے تو وہ اس کو ڈبو دیتا ہے۔

خادم کو مخدوم نہ بناؤ:

جیسے بیت الخلا، اِس زمانہ میں عموماً کوئی بھی مکان ایسا نہیں ہوگا جس میں بیت الخلا، واش روم نہ ہو۔ وہ ہے ضرورت کی چیز!!! جس کو گجراتی میں જાજરૂ کہتے ہیں وہ جائے ضرور ہے، تو اس کے بغیر کوئی بھی مکان ادھورا ہے؛ لیکن وہ شوق اور محبت کی چیز نہیں ہے، وہ تو صرف ضرورت کی چیز ہے۔ آدمی بوقت ضرورت اس کو استعمال کرتا ہے۔ کوئی آدمی یوں سوچے کہ میں گھر جاؤں گا، بیت الخلا میں اس طرح بیٹھوں گا، اس طرح اپنا وقت گزاروں گا کبھی کوئی آدمی بیت الخلا کے متعلق یوں سوچتا ہے؟ کبھی نہیں۔ کیوں کہ بیت الخلا کو اس نے اپنی ضرورت کی چیز سمجھا ہے۔ جب تقاضا ہوگا اس وقت جائے گا، اور اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد نکل آئے گا۔ کوئی اس کو اپنا شوق، محبت کا مرکز، اپنی رغبت کی چیز نہیں بناتا۔ اسی طرح مال کا حال ہے کہ مال انسان کی ضرورت کی چیز ضرور ہے، اس کے بغیر آدمی کا کام چلتا نہیں ہے؛ لیکن اس مال کو اگر انسان اپنے دل میں جگہ دے دے، تو وہ اس کے لیے ہلاکت اور بربادی کا ذریعہ بنے گا۔ خادم کو خادم ہی رکھو، مخدوم مت بناؤ، اسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔

چناں عاشق روئے زر گشتۂ:

انسان کا حال کیا ہو گیا ہے؟ انسان مال کی محبت میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ اس کو کمانے کی فکر میں چوبیس گھنٹے اپنے آپ کو لگائے رکھتا ہے، کہ کس طرح میرا بینک بیلینس بڑھ جائے، کس طرح میری دکان ترقی کر جائے؟ کس طرح میری فیکٹری بڑھ جائے؟ کس

طرح میری ایک کے بہ جائے دو دکانیں، دو فیکٹریاں، اتنی زمین کے بہ جائے ڈیڑھی، دوگنی زمین میں کس طرح بنالوں؟ بس! پیسوں کو حاصل کرنے کے چکر میں ایسا لگا رہتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو بھول جاتا ہے۔ اپنی راحت اور آرام کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ کس کے لیے؟ مال کے لیے۔ حالاں کہ یہ مال تو اس لیے پیدا کیا گیا تھا کہ اس کے ذریعے انسان کی ضرورتیں پوری ہوں، اس کو راحت ملے، اس کو لذت حاصل ہو، سکون ملے۔ اس کے بہ جائے اپنی راحت ولذت اور سکون کو مال پر قربان کر دیتا ہے۔ عام طور پر جو لوگ مال کی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں ان کا یہی حال ہوتا ہے۔

وہ مال کس کام کا......؟؟؟:

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے متعلق مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم نے فرمایا کہ ایک صاحب والد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، بڑے مالدار تھے، دنیا کے مختلف ملکوں میں ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ ان کے کئی بیٹے تھے اور اپنا کاروبار چلانے کے لیے بیٹوں کو مختلف ملکوں میں لگا رکھا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحبؒ نے پوچھا کہ تمہارے کتنے بیٹے ہیں؟ کہا کہ پانچ یا چھ ہیں۔ دریافت فرمایا کہ کہاں ہیں؟ تو کہا کہ ایک سنگاپور میں، ایک ہانگ کانگ میں، ایک لندن میں، ایک فلاں ملک میں، ایک فلاں ملک میں ہے۔ مفتی صاحبؒ نے پوچھا کہ ان سے آپ کی ملاقات کب ہوتی ہے؟ یا کب ہوئی تھی؟ تو کہا کہ دو سال پہلے ہوئی تھی۔ پھر پوچھا: سال بھر میں کتنی مرتبہ ہوتی ہے؟ تو کہا کہ وہ اپنے کاروبار میں مشغول ہیں۔ بھلا وہ مال کس کام کا، جو آدمی کو اپنی اولاد سے دور کر دے؟؟ اپنے گھر والوں سے دور کر دے، اپنی لذت اور راحت کو اپنے اوپر قربان کرادے۔ وہ مال

خادم کہاں رہا؟ وہ خادم نہیں؛ بلکہ مخدوم بن گیا۔ بھلا اس مال سے کیا فائدہ؟ جس کی وجہ سے آدمی اپنی اولاد کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ کر ٹھنڈک حاصل نہ کر سکے۔

......تو معاملہ الٹ جائے گا:

یہ حال اس لیے ہوا کہ جب آدمی مال کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے، تو اپنی زندگی کا مقصود اسی کو سمجھتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ میرے پاس موجود پیسوں سے مجھے سکون اور راحت ملتی ہے یا نہیں؟ اس مال کو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے ذریعہ بنایا ہے، مقصود نہیں ہے۔ یہ تو دوسرے اچھے مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، جب تک آپ اس کو ذریعے کے طور پر استعمال کریں گے، تب تک آپ کے کام کا ہے، اور اگر اسی کو مقصود بنالیا، مخدوم بنالیا، تو پھر معاملہ الٹ جائے گا۔ آپ اس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے والے بن جائیں گے۔

قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ مدثر میں ایک کافر کا تذکرہ کیا ہے، اور اپنی نعمتوں کو بیان کیا ہے، باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم نے اس کو فلاں فلاں نعمتیں دیں، ان میں سے ایک ہے: وَّ بَنِیْنَ شُهُوْدًا (المدثر:۱۳) (ہم نے بیٹے دیے جو اس کے سامنے موجود ہیں) ماں باپ اولاد کو اپنے سامنے کو دیکھ کر، ان کی خدمتوں، ان کے اعمال خیر سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں، تب تو وہ ان کے حق میں نعمت ہے۔ ورنہ اولاد میں سے کوئی نیویارک ہے، کوئی لندن ہے، کوئی پیرس ہے، وہاں ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں کما بھی رہے ہیں، تب بھی کیا حاصل؟ دولت کا مقصد تو حاصل نہ ہوا، یہ تو آدمی نے اپنے آپ کو اس پر فنا کر دیا، وہ مال کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اگر مال کی محبت میں گرفتار نہ ہوتا اور اس کو جو درجہ اور حیثیت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس پر باقی رکھتا، تو یہ نوبت پیش نہ آتی۔

دگر بانگ دارد کہ ہل من مزید:

جب ایک مرتبہ مال کی محبت اور طلب پیدا ہوگئی، هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ(ق:۳۰) کہ میں زیادہ سے زیادہ اپنے مال کو بڑھاؤں، تو زندگی بھر آدمی کو کبھی چین اور سکون نہیں آ سکتا۔ حدیث شریف میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: لو كان لابن آدم واد من ذهب لابتغى أن يكون له واديان ولو كان له واديان لابتغى أن يكون له ثلاث ولا يملأ جوف ابن آدم إلا التراب (اگر کسی انسان کے پاس سونے کی ایک وادی- دو پہاڑوں کے درمیان کی ہموار جگہ، جس کو گجراتی میں ખીણ کہا جاتا ہے، وہ بہت بڑا خلا ہوتا ہے، معمولی سی جگہ نہیں ہوتی- بھری ہوئی ہے تو بھی وہ چاہے گا کہ میرے پاس دو وادی ہو جائیں، اور دو وادی ہوں تو وہ تمنا کرے گا کہ میرے پاس تین ہو جائیں، انسان کا پیٹ قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے)۔[1]

زنورِ قناعت برافروز جاں:

دنیا میں رہتے ہوئے اس کے پیٹ کو بھرنے والی ایک ہی چیز ہے: قناعت۔ آدمی قناعت اختیار کر لے، اس پر نبی کریم ﷺ کی دعا ہے: اللهم قنعني بما رزقتني وبارك لي فيه.... (اے اللہ! آپ نے جو روزی مجھے دی اس پر مجھے قناعت عطا فرمائیے، اور میرے لیے اس میں برکت عطا فرمائیے......)[2] یعنی آدمی یوں سوچ لے کہ میں نے شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے مقدور بھر، جتنی کوشش کرنی چاہیے تھی کر لی، اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لیے فیصلہ ہو چکا ہے۔ ویسے بھی آپ کتنے بھی ہاتھ پیر ماریں اس

(۱) مسند أحمد: ۱۷۷۶۳ والأدب المفرد: ۲۹۹ والصحيح ابن حبان: ۳۲۱۰.

(۲) مسند أحمد: ۱۷۷۶۳ والأدب المفرد: ۲۹۹ والصحيح ابن حبان: ۳۲۱۰.

میں کوئی اضافہ ہونے والا نہیں ہے، لہٰذا اسی پر راضی رہ کر اللہ تعالیٰ سے اس میں برکت کی دعا کر لیجیے: اے اللہ! آپ نے مجھے جو روزی دی ہے اس میں برکت عطا فرما دیجیے، مجھے اس پر قناعت عطا فرما دیجیے۔ اگر اللہ تعالیٰ قناعت کی صفت عطا فرما دیں اور اللہ کی دی ہوئی روزی میں ہمیں برکت مل جائے تو ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ برکت کی دعا کی ضرورت ہے، کثرت کی نہیں۔

رضا بر قضا:

حاصل یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے اگر آپ مال کے ذریعے اپنا پیٹ بھرنا چاہیں گے تو نہیں بھر سکیں گے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ انسان کے پیٹ کو تو قبر کی مٹی ہی بھرے گی۔ ہاں! آپ قناعت اختیار کر لیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور فیصلے سے جو کچھ عطا فرمایا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ برکت ڈال دے، تو اس سے آپ کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ الغرض! جو آدمی یوں سوچ کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی اسباب و وسائل بنائے ہیں، منجملہ ان کے مال بھی ہے، یہ اللہ نے میری ضرورت کے لیے پیدا فرمایا ہے، میرا خادم بنا کر پیدا فرمایا ہے، اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کو پورا کرنے کے لیے، اپنی عبادت و اطاعت کے لیے پیدا فرمایا ہے، تو اس صورت میں اس کا مسئلہ آسان ہو جائے گا۔

بشارت سنا دیجیے......:

ورنہ یہی مال کی کثرت قیامت کے روز انسان کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ قرآن کریم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ. يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ

جُنُوۡبُهُمۡ وَ ظُهُوۡرُهُمۡ ؕ هٰذَا مَا كَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡنِزُوۡنَ (التوبة:۳۴-۳۵) (جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، تو اے نبی! آپ ان کو بشارت سنا دیجیے دردناک عذاب کی۔ سونے چاندی کی تختیوں کو جہنم میں تپا کر ان کی پیشانی، ان کے پہلو، ان کی پشت کو داغا جائے گا۔ اور کہا جائے گا: جو تم مال جمع کرتے ہو اس کا مزہ چکھو) لہٰذا اگر مال جمع کیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں جو احکام اور حقوق بتلائے ہیں، ان کی ادائیگی کا اہتمام کریں۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کریں۔

سب کی نیت کریں……:

صرف زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں؛ بلکہ حدیث پاک میں آتا ہے: إن في المال حقاً سوى الزكوة (مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں)[1] آپ کا حق ہے، آپ کے بال بچوں کا حق ہے، آپ کے گھر والوں کا حق ہے، آپ کے ماں باپ کا حق ہے، آپ کے رشتہ داروں کا حق ہے، غریبوں اور محتاجوں کا حق ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ جو مال اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، وہ آپ اکیلے کے لیے ہے؛ بلکہ ویسے بھی ایک مؤمن کو چاہیے کہ کمانے میں نیت سب کی کرلے۔ اور اس کی کمائی کے ذریعے سے اللہ کے جتنے بھی بندوں کی ضرورتیں پوری ہوں گی وہ سب ثواب اس کو ملتا رہے گا۔ ہمارے مال میں بیوی بچوں، بھائی بہنوں، ماں باپ، رشتہ داروں، پڑوسیوں، غرباء اور مساکین وغیرہ کا حصہ ہے۔ اور باقاعدہ ان مالی حقوق کو ادا کرنے کا اہتمام بھی کیا جائے۔ آدمی کتنا بھی مال کما لے اس کے ساتھ نہیں جائے گا، ساری دنیا بھی جمع کرلے تو بھی سارا یہیں چھوڑ کر جانا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذي: ۶۶۰ و سنن الدار قطني: ۲۰۱۶.

تین چیزیں:

حدیث پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو اس کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں:

(۱) ایک تو اس کے رشتہ دار، جو جنازہ لے کر جاتے ہیں۔

(۲) دوسرا اس کا مال، یعنی کفن، جنازہ کی چار پائی، اور دوسری کچھ چیزیں۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ آدمی کے دفن کے وقت اس کا سارا مال بھی ساتھ لے جاتے تھے، اور دفن کرنے کے بعد واپس لاتے تھے۔

(۳) تیسری چیز اس کے اعمال ہیں۔

پھر فرمایا: دو چیزیں تو واپس آجائیں گی، لیکن اعمال اس کے ساتھ رہیں گے۔[۱]

یہ خرابی کی چیز ہے:

حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی نے اس مال کے لیے اپنے اعمال اور دین کو خراب کیا ہے، یعنی رشوت کے ذریعے، لوگوں کو دھوکا دے کر، چوری کر کے، سود کے ذریعے حاصل کیا، تو ساری بداعمالیاں اس کے ساتھ جائیں گی اور یہ مال دنیا میں رہ جائے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ مال کو اللہ نے جو درجہ دیا ہے، آدمی اسی درجہ میں رکھے۔ اور وہ درجہ کیا ہے؟ اس کی محبت کو اپنے دل میں گھسنے نہ دے۔ یہ خرابی کی چیز ہے، اسی کو اس آیت میں بتلایا گیا: وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (مال کی محبت میں وہ بہت آگے بڑھا ہوا ہے) مال ضرور کمایئے، استعمال بھی کیجیے، خرچ بھی کیجیے؛ لیکن اس کی محبت کو اپنے دل میں جگہ نہ دیجیے۔ جہاں اس کی محبت

---

(۱) مسند أحمد: ۱۲۰۸۰ وصحیح البخاري: ۶۵۱۴ وصحیح مسلم: ۵/۲۹۶۰ وسنن الترمذي: ۲۳۷۹ وسنن النسائي: ۱۹۳۷ وغیرها.

دل میں آئے گی، وہیں سے ساری خرابیاں آئیں گی۔ پھر آدمی مال حاصل کرنے کے غلط طریقے اپناتا ہے، اپنے دین کو قربان کرتا ہے۔ اسی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:
وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (وہ مال کی محبت میں بہت آگے بڑھا ہوا ہے)۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو مال کے سلسلے میں اسی طریقے کا اہتمام کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ عادیات

(قسط-٦)

(مؤرخہ ۱۸/جمادی الاخریٰ ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۳/فروری ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم○ بسم الله الرحمٰن الرحيم○

وَالۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا ۙ﴿۲﴾ فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرۡنَ بِہٖ نَقۡعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطۡنَ بِہٖ جَمۡعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوۡدٌ ۚ﴿۶﴾ وَ اِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیۡدٌ ۚ﴿۷﴾ وَ اِنَّہٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ ؕ﴿۸﴾ اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ۙ﴿۹﴾ وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ ۙ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾

دو خرابیاں:

یہ سورۂ عادیات ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس میں گھوڑوں کی قسم کھا کر انسان کی

دو خرابیوں اور کمزوریوں کی طرف نشان دہی فرمائی ہے:

(۱) ایک تو یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے، جس کی تفصیل آچکی ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے: وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (اور حقیقت یہ ہے کہ وہ مال کی محبت میں بڑا پکا ہے)۔

ترجمہ:

آگے ہے اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِى الْقُبُوْرِ (بھلا کیا اس کو معلوم نہیں جب قبروں میں جو کچھ ہے اسے باہر بکھیر دیا جائے گا)۔

وَ حُصِّلَ مَا فِى الصُّدُوْرِ (اور سینوں میں جو کچھ ہے اس کو ظاہر کر دیا جائے گا)۔

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ (بے شک ان کا پروردگار اس دن ان کی حالت سے پوری طرح باخبر ہے)۔

مال خیر؛ کیسے......؟؟؟

اللہ تعالیٰ نے مال کو لفظ خیر سے تعبیر فرمایا ہے۔ خیر عربی زبان میں بھلائی کو کہتے ہیں۔ گویا اس تعبیر کو اختیار کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مال اپنی ذات کے اعتبار سے تو اچھی چیز ہے۔ انسان کی ساری ضرورتیں اسی پر موقوف ہیں۔ جیسے کشتی کے لیے پانی ضروری ہوتا ہے، اس کے بغیر وہ چل نہیں سکتی۔ اسی طرح انسان کی ضرورتوں کا پورا ہونا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسباب کے درجے میں مال پر موقوف رکھا ہے۔ اگر مال نہیں ہے تو وہ کیا کھائے گا؟ کیا پہنے گا؟ کہاں رہے گا؟ کہاں سے اپنی ضرورتیں پوری کرے گا؟ اس معنی کر کے مال اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، جس کے ذریعے انسان اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے

اور زندگی گزارنے میں مدد حاصل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اپنی ذات کے اعتبار سے اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔

اصل خرابی......!!!:

اگر خرابی اور برائی ہے تو کس میں ہے؟ اس مال کی محبت انسان کے دل میں پیوست ہو جائے، انسان کے اوپر غالب آ جائے، اس کو اپنا غلام بنا لے۔ اور وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ مال اللہ تعالیٰ نے میری ضرورت کو پورا کرنے اور میری خدمت کے لیے پیدا کیا ہے؛ بلکہ مال کی محبت میں اس کو خادم کے طور پر استعمال کرنے کے بہ جائے اپنا مخدوم بنا کر خود ہی اس مال کی خدمت میں لگ جاتا ہے۔ اس کے حصول کے لیے تگ و دَو کرتا ہے، دوڑ دھوپ کرتا ہے، مارا مارا پھرتا ہے، اپنی ذات کو بھی بھول جاتا ہے۔ بس اسی مال کی محبت میں وہ ایسا مست و مغلوب ہو جاتا ہے، کہ وہ اپنی حقیقت بھول جاتا ہے۔ تو اس مال کی محبت کا انسان کے دل میں پیوست ہونا، یہ ہے اصل خرابی کی چیز!!!

الضرورة تتقدر بقدر الضرورة:

مال تو اللہ کی ایک نعمت ہے۔ انسان کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے؛ لیکن جب تک انسان اس کو اپنی ضرورت کی حد تک حاصل کرے، تب تک خیر ہے۔ فقہا کے یہاں ایک جملہ استعمال کیا جاتا ہے: الضروة تتقدر بقدر الضرورة (جو کام ضرورت کے پیشِ نظر انجام دیا جاتا ہے، وہ ضرورت کی حد تک ہی رہتا ہے) اس کو اس سے آگے نہیں بڑھایا جاتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کی ضرورتوں کے لیے مال کو پیدا فرمایا ہے، تو انسان کو بھی چاہیے کہ اس کو ضرورت کے مطابق حاصل کرے، اور ضرورت کے

مطابق اس کو استعمال کرے۔

کہ شوریدہ احوال وسرگشتۂ:

اس کی محبت میں اتنا آگے نہ بڑھ جائے کہ وہ اپنی ذات کو بھول جائے، اپنے مقصد زندگی کو فراموش کر دے۔ میں کیوں پیدا کیا گیا ہوں؟ اللہ تعالیٰ نے مجھے کس کام کے لیے دنیا میں بھیجا ہے؟ وہ سب بھول بھال کر مال کے حاصل کرنے میں ایسا لگ جائے کہ اپنے آپ کو اسی میں لگا کر اپنا آرام، سکون، راحت، سکھ چین سب مال پر قربان کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مال کی یہی محبت آدمی کے لیے مہلک بن جاتی ہے۔

ایں جہاں راچوں زنے داں خوبروی:

البتہ ایک بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مال و دولت میں ایک کشش رکھی ہے۔ قرآن میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے چند چیزوں کا تذکرہ کیا ہے۔ چناں چہ قرآن پاک میں سورۂ آل عمران میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (آل عمران:۱۴) (اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان چیزوں کی محبت لوگوں کے لیے خوش نما بنا دی ہے، جو چیزیں انسان کی نفسانی خواہش کے مطابق ہیں، یعنی عورتیں، بیٹے، سونے اور چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں۔ یہ سب دنیوی زندگی کا سامان ہے (لیکن) ابدی انجام کا حسن تو صرف اللہ کے پاس ہے)۔ جو گھوڑے عمدہ ہوتے تھے ان پر اہل عرب خصوصی نشان لگاتے تھے، ان کی جگہ آج کل کاروں نے لے لی ہے، اس زمانے میں گھوڑے

سواری کے کام آتے تھے، اِس زمانے میں اونچی اونچی کاریں ہیں، ان کی محبت دل میں بھری ہوئی ہے- چوپائے، مویشی اور کھیتیاں۔

دنیا امتحان گاہ ہے:

اگر آپ انسان کی زندگی کا معاینہ کریں، تو کہیں نہ کہیں یہ چیز نظر آئے گی۔ دیہات کے لوگوں کے دلوں میں کھیتی اور جانوروں کی محبت ہے۔ شہر والوں کو کاروں اور فیکٹریوں سے محبت ہے۔ رہی عورتیں، سونے چاندی کے ڈھیر اور مال کی محبت؛ تو وہ کسی دیہات اور شہر کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہر ایک دل میں اس کی محبت بھری ہوئی ہے۔ یہ سب قدرت نے آزمائش کے لیے کیا ہے۔ ویسے بھی انسان کو دنیا میں آزمائش اور امتحان کے لیے بھیجا ہے۔ تو اب اسی آزمائش کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ان چند چیزوں کی محبت اور رغبت انسان کے دلوں میں ڈالی گئی، اور ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مزین کر دیا۔

حضرت عمرؓ کی دعا:

چناں چہ حضرت عمرؓ کے سلسلے میں منقول ہے کہ آپؓ کے دورِ خلافت میں کوئی علاقہ فتح ہوا، اور وہاں سے سونے، چاندی، زیورات اور برتن مالِ غنیمت کے طور پر آئے- حضور ﷺ اور خلفاءِ راشدین حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے زمانے میں جو مالِ غنیمت آتا تھا، مسجد نبوی کے صحن میں اس کا ڈھیر لگا دیا جاتا تھا۔ اور وہیں سے اس مال کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا جاتا تھا- چناں چہ مسجد نبوی کے صحن میں اس مال کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ حضرت عمر جب مسجد میں تشریف لائے اور مال دیکھا تو حضرت عمرؓ نے ایک دعا کی- حضرت عمرؓ کے حالات میں اور بہت سی کتبِ تفسیر میں، جہاں آثارِ صحابہؓ اور تابعین بیان کیے گئے ہیں وہاں اس قصے کو

ذکر کیا گیا ہے- اللهم إنك ذكرتَ هذا المال فقلتَ: زين للناس حب الشهوت من النساء والبنين والقناطير المقنطرة (اے اللہ! اس مال دولت کا اپنی کتاب، قرآن میں آپ نے تذکرہ کیا، اور آپ نے فرمایا: مزین کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے پسندیدہ اور محبوب چیزوں کی محبت، عورتوں میں سے اور بیٹوں میں سے اور سونے چاندی کے ڈھیر، اور نشان لگے ہوئے گھوڑے وغیرہ)۔

ہمارے بس میں نہیں......:

اور آپ ہی نے قرآن میں دوسری جگہ فرمایا: لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ (الحدید: ۲۳) (تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اس پر تم افسوس نہ کرو اور جو چیز اللہ تعالیٰ تم کو دے اس پر تم اتراؤ نہیں) تو اب جب آپ نے خود فرمادیا کہ لوگوں کے لیے یہ چیزیں مزین کردی گئیں، اور ان چیزوں کے ملنے پر لوگوں میں اتراہٹ اور خوشی پیدا ہوتی ہے۔ تو إنا لا نستطيع إلا أن نفرح بما زينت لنا (اے اللہ! اب ہمارے بس میں نہیں ہے کہ آپ نے جس چیز کو ہمارے لیے مزین کردیا اس کو دیکھ کر ہمیں خوشی نہ ہو) آپ نے تو اس کو بنایا ہی ہے ایسا کہ اس کو دیکھ کر آدمی للچاتا ہے، خوش ہوتا ہے۔ لہٰذا اللهم إني أسألك أن ننفقه في حقه وأعوذبك من شره (اے اللہ! میں آپ سے اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ ہم اس مال ودولت کو، تو نے جہاں حکم دیا ہے، وہاں خرچ کریں اور اس کے شر سے تو ہماری حفاظت فرما)[1] گویا یہ تو ناممکن ہے کہ آدمی ان چیزوں سے خوش نہ ہو۔ میرے دل میں بھی اس کی طرف میلان ہے۔

---

(۱) الزهد لأبي داود ص: ۸۲ (۷۱) (ط: دار المشكاة، حلوان).

یہ تو ہو ہی نہیں سکتا......:

کوئی بڑے سے بڑا کیوں نہ ہو، انسان کے مزاج اور طبیعت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان چیزوں کی محبت ڈالی ہے، اس لیے اس کی طرف طبیعت کا میلان تو ہوگا، لیکن ہم آپ سے اتنا ہی سوال کرتے ہیں کہ ان چیزوں کی محبت دلوں میں قدرتی طور پر ہے، تو ہماری مدد فرما کہ ان چیزوں کی وجہ سے ہم تیرے کسی حکم کو نہ توڑیں۔ ان کو حاصل کرنے کے لیے تو نے جو حدود قائم کی ہیں، ان سے ہٹ کر غلط طریقے سے اس مال کو حاصل نہ کریں۔ ان کو خرچ کرنے کے لیے تو نے جو طریقے اور اصول وضوابط بتلائے ہیں، ان سے ہٹ کر ہم مال خرچ نہ کریں۔ گویا یہ مال ہمارے لیے تیری حکم عدولی کا، تیرے احکام کو توڑنے کا سبب نہ بنے۔ حاصل کریں تو بھی تیرے حکم کے مطابق، اور خرچ کریں تو بھی تیرے حکم کے مطابق۔ گویا یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کی طرف طبیعت کا میلان نہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ یہ چیزیں، مال واولاد، عورتیں اور سونے چاندی کے ڈھیر ہمارے لیے ہلاکت اور تباہی کا سبب نہ بنیں۔

کہ دولت بہ طاعت تواں یافتن:

اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں مال کی طرف قدرتی طور پر کشش رکھی ہے؛ لیکن ہمیں یہ احتیاط کرنا ہے کہ مال ہمارے لیے اللہ کے احکام کو توڑنے کا ذریعہ نہ بنے۔ ہم کون سے طریقے سے حاصل کررہے ہیں؟ حلال اور جائز طریقے سے حاصل کررہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے مال حاصل کرنے کا جو طریقہ بتلایا ہے، ان طریقوں اور اصولوں کو سامنے رکھ کر اور برت کر کے حاصل کررہے ہیں؟ یا پھر ناجائز اور حرام طریقے سے؟ اللہ نے مال حاصل

کرنے کے لیے جو احکام دیے ان کو توڑ کر؟ مطلب یہ ہے کہ آدمی مال کو حاصل تو کرے؛ کیوں کہ ضرورت کی چیز ہے، اس کے بغیر کام نکلتا نہیں ہے۔ لیکن اس کے حاصل کرنے اور استعمال کرنے میں اللہ کی نافرمانی کا صدور نہ ہو، ورنہ تو یہ مال بہ جائے نعمت اور خیر کے عذاب بن جائے گا۔

وہ مال خیر نہیں......:

چناں چہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی بتلایا ہے کہ مال کی محبت جب اپنی حدود سے آگے بڑھ جاتی ہے، شریعت کی طرف سے اس کے لیے جو بارڈر مقرر کی گئی ہے، اسے کراس کر جاتی ہے، تو پھر آدمی کے لیے بہ جائے نعمت کے مصیبت بن جاتا ہے، بہ جائے خیر کے شر بن جاتا ہے، بہ جائے راحت وسکون اور چین و آرام کے مصیبت اور عذاب بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین اور منافقین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور ﷺ کو فرمایا فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ (التوبة:۵۵) (اے نبی! ان کافروں، مشرکوں اور منافقین کا مال اور ان کی اولادیں تم کو تعجب میں نہ ڈالیں، اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اسی مال اور اولاد کے ذریعے سے ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دیں، اور ان کی جانیں دنیا سے جاتے ہوئے ایسی حالت میں نکلیں کہ وہ اللہ کا انکار کرنے والے ہوں) یہ تعجب نہ ہو کہ ان کے پاس اتنا سارا مال اور اولادیں کہاں سے آئیں؟ یہ تو دنیا سے ایمان سے محرومی کی حالت میں جائیں گے۔ لہٰذا جو مال اللہ کی نافرمانی پر آمادہ کرے، وہ خیر نہیں؛ بلکہ شر ہے، نعمت نہیں؛ بلکہ مصیبت ہے۔ راحت نہیں؛ بلکہ عذاب ہے۔ مال بھی کبھی عذاب کی شکل اختیار کرتا ہے۔

مال عذاب بنا ہوا ہے:

دیکھو! دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے پاس مال کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ان کے پاس مال و جائیداد اور املاک کی اتنی بڑی مقدار ہے، کہ ان کو خود معلوم نہیں کہ ہماری ملکیت میں کتنا مال ہے؟ لوگ ان کی اس مال کی زیادتی پر رشک اور تعجب کرتے ہیں، کہ ان کے پاس اتنا زیادہ مال ہے!!! لیکن ان لوگوں کے لیے وہ مال مصیبت بنا ہوا ہے۔ اسی کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں کہ زمین کے بہت بڑے حصے پر کسی نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اب اس فکر میں ہیں کہ اس کو کیسے چھڑایا جائے؟ کیس لڑ رہے ہیں، نچلی کورٹ میں، ہائی کورٹ میں، سپریم کورٹ میں، ہزاروں، لاکھوں روپے خرچ بھی ہو رہے ہیں، راتوں کی نیند بھی غائب ہے۔ اسی طرح کسی فیکٹری میں نقصان ہو رہا ہے، اس کی وجہ سے چین وسکون چھنا ہوا ہے۔ فیکٹری والے نقصان برداشت نہیں کر سکتے۔ جب تک چلتی رہے تب تک کام کی ہے، اس سے فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؛ اور اگر نقصان میں جا رہی ہے تو وہ دردِ سر ہے، راتوں کی نیند خراب کر دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس سب کچھ ہے، لوگ ان کے پاس چیزیں دیکھ کر ان پر رشک کرتے ہیں؛ لیکن ان کو دولت، جائیداد، کارخانوں، فیکٹریوں اور کاروبار کی وجہ سے نہ دن میں سکون، راحت اور چین ہے، نہ رات میں نیند آ رہی ہے۔ تو مال ان کے لیے عذاب بن گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے ذریعے ان کو عذاب دے رہے ہیں۔ اس کی زندگی بہ جائے سکون کے، بے چینی اور اضطراب کی حالت میں گذر رہی ہے۔

دلا گر قناعت بدست آوری:

اس لیے مال تھوڑا ہو؛ لیکن باعث سکون ہو۔ جیسا کہ گذر چکا: اللهم قنعني بما

رزقتني وبارك لي فيه (اے اللہ! تو مجھے روزی میں قناعت عطا فرما، اور اس میں برکت عطا فرما)۔ تیری دی ہوئی اس روزی پر میں دل سے راضی رہوں، دل میں زیادہ کی طلب نہ ہو، حرص، لالچ، بے چینی نہ ہو کہ اتنا ہی کیوں مل رہا ہے؟ بلکہ تیری طرف سے مجھ کو جو مل رہا ہے اس پر میرا دل راضی ہو۔ اور میرے لیے اس میں برکت دے دے۔ یعنی ایسا بنا دے کہ اس سے میری ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ اگر ایسا مال ہے؛ تو آدمی کے لیے نعمت ہے۔ اس کے لیے سکون اور چین کا ذریعہ ہے۔ دنیا اور آخرت میں بھی وہی مال آدمی کے لیے خوش گواری کا سبب ہوتا ہے، جس پر آدمی کو قناعت حاصل ہو رہی ہو، اس کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہوں، چین حاصل ہو۔ جو مال بے چینی کا، بے اطمینانی و اضطراب کا سبب بنتا ہے، دنیا اور آخرت میں وہ مال انسان کے حق میں عذاب کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مشرکین اور منافقین کے لیے فرمایا کہ ان کے مال کو دیکھ کر تعجب میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ اسی مال اور اولاد کو ان کے لیے عذاب بنائے ہوئے ہیں۔

برتو بایدا ے عزیز!:

ایک مؤمن کو چاہیے کہ اس کی حالت اُن مشرکین اور منافقین جیسی نہ ہو؛ بلکہ اس کے حق میں مال و اولاد سکون اور چین کا ذریعہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ مال ہے ضرورت کی چیز؛ لیکن اس کی محبت اس کے دل میں گھر نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں دل میں محبت آ گئی تو پھر مال خادم نہیں رہے گا؛ بلکہ مخدوم بن جائے گا، اور آدمی کے لیے چین و سکون کا ذریعہ نہیں رہے گا؛ بلکہ بے چینی اور بے اطمینانی کا ذریعہ بنے گا، آدمی کے لیے خیر نہیں؛ بلکہ شر اور عذاب بن جائے گا۔

یہیں چھوڑ کر جانا پڑے گا:

اللہ تعالیٰ بتلا رہے ہیں کہ انسان کی یہ دو کمزوریاں (وہ اپنے رب کا ناشکرا ہے اور مال کی محبت میں پکا ہے) ہیں، ان سے نجات پانے کا کیا طریقہ ہے؟ اس کی دوا کیا ہے؟ وہ دوا آگے بتلا دی: اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ (کیا اس کو معلوم نہیں کہ جب قبروں میں جو کچھ بھی ہے وہ باہر نکال کر پھیلا دیا جائے گا) یعنی وہ انسان جو مال کی محبت میں گرفتار ہو کر اسی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر رہا ہے، اس کو سوچنا چاہیے کہ آخر اس دنیا سے اس کو ایک دن جانا ہے۔ چاہے کتنا ہی مال کیوں نہ کما لیا ہو، مالوں کے ڈھیر حاصل کر لیے ہوں، تب بھی وہ مال ساتھ لے کر نہیں جائے گا، یہاں چھوڑ کر جانا پڑے گا۔

کچھ نہ کام آئے گا سرمایہ تیرا:

اگلی مجلس میں ایک حدیث آپ کو بتلائی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب آدمی کا جنازہ اٹھتا ہے تو اس کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں: (۱) جنازہ کو لے کر جانے والے اعزاء واقارب، اہل وعیال بیٹے وغیرہ۔ (۲) کچھ مال بھی جاتا ہے، جیسے جنازہ کی چارپائی، چادر کچھ اور چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ (۳) تیسرے اس کے اعمال۔[۱] اس کو بتلایا جارہا ہے کہ دیکھو! جب موت آئے گی تو یہ ساری دولت جس کے لیے آپ نے اپنا سب کچھ چھوڑا تھا، وہ یہیں چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ اور قبر میں نہ دولت آئے گی، نہ اہل وعیال۔ ہاں! اعمال ساتھ آئیں گے اور کام دیں گے۔

---

(۱) مسند أحمد: ۱۲۰۸۰ وصحيح البخاري: ٦۵۱۴ وصحيح مسلم: ۵/۲۹٦۰ وسنن الترمذي: ۲۳۷۹ وسنن النسائي: ۱۹۳۷ وغيرها.

جہنم کا ایندھن......:

اس لیے ضرورت ہے کہ اس دن کو یاد کرو جب اللہ تبارک وتعالیٰ قبر کے مردوں کو زندہ کر کے زمین پر پھیلائیں گے، یعنی قیامت کا دن، دوسرا صور پھونکے جانے کے بعد قبر میں جو کچھ بھی ہے اس کو اللہ تعالیٰ باہر نکال کر زمین پر پھیلا دیں گے۔سوچو! اس دن یہ دولت جو تم نے جمع کی ہے- حلال وحرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کیے بغیر-کیا وہ تمہارے کام آئے گی؟ یا تمہارے لیے جہنم کا ایندھن بنے گی؟ یہ تو جہنم کا ایندھن بنے گی۔اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (النساء:۱۰) (جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں، یعنی ناجائز طریقے سے مال حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں)۔دنیا میں آگ ہونے کا پتا نہیں چلتا، یہی چیز قیامت میں آگ کی شکل اختیار کر لے گی۔بہر حال! قیامت کے روز سب کو قبروں سے باہر نکالا جائے گا۔

سینوں کے راز کھول دیے جائیں گے:

وَحُصِّلَ مَا فِى الصُّدُوْرِ (اور سینوں کے راز کھولے جائیں گے) فاش کیے جائیں گے آج تو بہت سے لوگ مال کماتے ہوئے اپنے آپ کو اور لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے یوں کہتے ہیں: میں تو اچھی نیت سے مال کما رہا ہوں۔ اچھی نیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اب تمہارے دل میں کیا ہے؟ وہ تو کوئی نہیں جانتا۔لیکن وہی دل کے ارادے، دل کی نیتیں چاہے اچھی ہوں یا بری، قیامت میں ساری دنیا دیکھ لے گی۔ دنیا میں تو ہم لوگوں کو دھوکا دیتے رہتے تھے کہ مال اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے، نیکی کے کاموں کے لیے کما رہا ہوں۔لوگوں کو بھی ایک جھوٹ کہہ رہے تھے، اور اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہے

تھے۔کل کو قیامت میں دلوں کے سب راز کھول دیے جائیں گے، تو اس وقت لوگوں کو پتا چلے گا کہ یہ جھوٹ بول رہا تھا، اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہا تھا۔

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ (اور لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے رب کو ہمارے حال کا سب کچھ پتا تھا)۔

ابھی آدمی کو یہ بھول سے بھی خیال نہیں آتا کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔کافروں اور مشرکوں کا تو ایمان بھی نہیں ہے۔لیکن جو مسلمان غفلت میں پڑے ہیں ان کا ایمان تو ہے؛لیکن استحضار نہیں ہے، قیامت کے روز سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اللہ سب جانتے ہیں۔

سرکاری گواہ:

بلکہ اللہ تعالیٰ کے گواہ ،قدرت کے سی آئی ڈی ہمارے ساتھ لگے ہوئے ہیں، وہ اس کے خلاف گواہی دیں گے۔کان، زبان، ہاتھ، پاؤں جن سے اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے گناہوں کا ارتکاب کیا تھا، یہی اعضا ہمارے خلاف گواہی دیں گے۔ یہ ہمارے ساتھ سرکاری گواہ لگے ہوئے ہیں۔ چوبیس گھنٹے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ابھی بولتے نہیں ہیں۔کل کو قیامت میں جب اللہ تعالیٰ ان کو بولنے کی طاقت دیں گے اور وہ ہمارے خلاف گواہی دیں گے، تو اس وقت انسان ان سے کہے گا کہ تم ہمارے خلاف گواہی دیتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ نے ہم کو بولنے کی طاقت دی ہے۔اللہ کا حکم ہے، ہم تو اس سے ہٹ نہیں سکتے، ہم کو گواہی دینی پڑے گی۔کوئی باہر کا گواہ ہو تو وہاں آدمی یہ الزام بھی لگا سکتا ہے کہ یہ تو میرا دشمن ہے، میرا مخالف ہے اس لیے مجھ کو نقصان پہنچانے کے لیے میرے خلاف

گواہی دیتا ہے؛ لیکن یہ تمہارا ہاتھ، تمہارے پاؤں، تمہاری زبان، تمہارا دل یہ تمہارے اپنے اعضا تمہارے خلاف گواہی دیں گے۔

سب کھل جائے گا:

آج کل بہت سے آدمی کاروبار میں جو گڑبڑ کرتے ہیں وہ کسی کو نہیں بتاتے، سب کچھ اپنے دل میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ لیکن قیامت کے روز وہ سب باہر آجائے گا، ساری دنیا دیکھے گی، سب کھل جائے گا، سارے حالات لوگوں کے سامنے آئیں گے۔ کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔ کوئی بھید، بھید نہیں رہے گا۔ پھر اس وقت آدمی دیکھے گا کہ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے، اللہ تعالیٰ سے ہم کسی چیز کو چھپا نہیں سکتے۔ وہ حساب بھی لے گا، اور تمہارے اعمال کا بدلہ بھی دے گا۔ اگر تم نے اچھے کام کیے ہیں تو اس پر تم کو جزا ملے گی، اچھا بدلہ ملے گا۔ اور گناہ کیے ہیں تو سزا ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان چیزوں کے حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ زلزال

(قسط-۱)

(مؤرخہ ۲۵/جمادی الاخریٰ، ۱۴۴۰ھ-مطابق ۳/مارچ ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۙ﴿۱﴾ وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ۙ﴿۲﴾ وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا ۚ﴿۳﴾ يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۙ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا ؕ﴿۵﴾ يَوۡمَئِذٍ يَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا ۙ لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ ؕ﴿۶﴾ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ؕ﴿۷﴾ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾

پس منظر:

اس سورت کا نام زلزال، یا اذا زلزلت یا زلزلة ہے۔ اس میں قیامت کے دن آنے

والے ایک سخت بھونچال اور زلزلے کی خبر دی گئی ہے، لہٰذا اس کا نام سورۂ زلزال رکھا گیا ہے۔

مشرکین مکہ قیامت کے متعلق پوچھتے رہتے تھے، کیوں کہ وہ قیامت کا انکار کرتے تھے، مانتے نہیں تھے۔ ان کے اس سوال کا قرآن میں مختلف جگہوں پر تذکرہ ہے۔ وہ پوچھتے تھے: مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الملك:۲۵) (قیامت آنے والی ہے یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ اگر تم اپنی بات میں سچے ہو) سورۂ قیامہ میں ہے: اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ (القيامة:٦) (قیامت کا دن کب ہوگا؟) مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ (السجدة:۲۸) (یہ فیصلہ کب ہوگا؟) يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا (الاعراف: ۱۸۷، النزعت: ۴۲) (یہ لوگ قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ کب آئے گی؟) تو مشرکین کی طرف سے قیامت کے وقوع کے سلسلے میں موقع بہ موقع مختلف انداز سے سوالات کیے جاتے تھے، اس سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو جواب دیا ہے، لیکن اس جواب میں قیامت کے کچھ حالات بتلائے گئے ہیں۔ لیکن اس کی تعیین کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذات پاک کے ساتھ مخصوص رکھا ہے؛ کسی کو معلوم نہیں۔ یہاں تک کہ حضور اکرم ﷺ اور حضرت جبریلؑ کو بھی معلوم نہیں۔

علمی جواب:

حدیث کی کتابوں میں ایک حدیث ہے، جس کو ”حدیث جبریل“ کہتے ہیں۔ جس میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات سے قبل ایک مرتبہ حضرت جبریلؑ غیر معروف انسانی شکل میں تشریف لائے، عام طور پر حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ کی شکل میں تشریف لاتے تھے- یہ ایک بڑے حسین وجمیل صحابی تھے- لیکن اس روز ان کی شکل میں نہیں؛ بلکہ ایک اور اجنبی شکل میں آئے اور نبی کریم ﷺ سے مختلف سوالات کیے: اسلام کیا

ہے؟ ایمان کیا ہے؟ احسان کیا ہے؟ ان ہی سوالات میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ قیامت کب آئے گی ؟ اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ما المسؤول عنها بأعلم من السائل (جس سے سوال کیا گیا ہے (آپ ﷺ) وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا ہے)۔[۱]

اپنا جواب بھول گئے؟:

یہاں ایک لطیفہ اور نکتہ ہے کہ آپ ﷺ یوں بھی جواب دے سکتے تھے کہ مجھے معلوم نہیں کہ کون سے دن اور تاریخ میں قیامت آنے والی ہے۔ لیکن جواب کا دوسرا انداز اختیار کرنے کے سلسلے میں شارحینِ حدیث نے دو باتیں لکھی ہیں:

(۱) ایک مرتبہ حضرت عیسیٰؑ نے حضرت جبریلؑ سے پوچھا تھا کہ قیامت کب آنے والی ہے؟ تو حضرت جبریلؑ نے اسی جملے اور ان ہی الفاظ میں ان کو جواب دیا تھا: ما المسؤول عنها بأعلم من السائل (جس سے سوال کیا جا رہا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا)[۲] گویا حضور ﷺ حضرت جبریلؑ کو تنبیہ کرنا چاہتے تھے کہ اپنا جواب بھول گئے کیا؟

جواب بہر حال یہی رہے گا:

(۲) آپ ﷺ نے ایک اصولی جواب دیا کہ قیامت کے متعلق جس سے سوال کیا جا رہا ہے، وہ سوال کرنے والے سے زیادہ جانتا نہیں ہے، یعنی آپ کا یہ سوال ایسا ہے کہ

---

(۱) مسند أحمد: ۱۸۴، ۹۵۰۱ وصحيح البخاري: ۵۰، ۴۷۷۷ وصحيح مسلم: ۱/۸، ۵/۹، ۷/۱۰ وغيرها.

(۲) حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (۲/۳۵۲) میں نوادر الحمیدی سے اسے نقل کیا ہے۔

جب بھی یہ سوال کیا جائے گا، اس کا جواب یہی ہوگا۔ کہ پوچھے جانے والے کو پوچھنے والے سے زیادہ اس کا علم نہ ہوگا۔ چاہے پوچھنے والے جبریل ہوں یا کوئی اور یا پوچھے جانے والے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں یا کوئی اور۔ جواب بہرحال یہی رہے گا۔

شانِ نزول:

تو قیامت کا متعین وقت (تاریخ وسن) کوئی نہیں بتلاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ مخصوص رکھا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اس کی علامتیں اور نشانیاں بتلائی گئی ہیں۔ لہٰذا جب مشرکین کی طرف سے بار بار سوال ہوتے تھے تو اس کے جواب میں قرآن میں مختلف موقعوں پر، مختلف آیتیں اور سورتیں نازل کی گئی ہیں۔ یہ سورت بھی اسی مناسبت سے نازل ہوئی، جس میں قیامت کے کچھ حالات بتلائے گئے ہیں کہ قیامت جب آئے گی تو کیا ہوگا؟ لیکن کون سے دن، تاریخ اور سن میں آئے گی؟ یہ نہیں بتلایا گیا۔

......صبح کا انتظار نہیں فرمایا:

ہاں! اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے کچھ حالات بتلائے، وہ بھونچال اور زلزلہ (ધરતીકંપ) کتنا خطرناک ہوگا؟ یہ بتلایا گیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں کتب تفاسیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ سورت رات کا ایک حصہ گزر جانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت شریفہ تو یہ تھی کہ رات کو اگر کوئی آیت یا چند آیتیں یا کوئی سورت نازل ہوتی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات ہی صحابہؓ کو نہیں بتلاتے تھے، بلکہ دن کا انتظار کرتے۔ جب دن میں صحابہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے

تب آپ ﷺ نئی نازل شدہ آیت یا آیات یا سورت ان کے سامنے پڑھ کر سناتے تھے۔ لیکن جب یہ سورت رات کا کچھ حصہ گزرنے کے بعد نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے صبح کا انتظار نہیں فرمایا، اسی وقت گھر سے باہر تشریف لائے اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اس سورت کی تلاوت فرمائی۔[۱]

نکاح کر! نکاح کر!:

اس سورت کی فضیلت کے سلسلے میں ترمذی شریف کی روایت ہے: أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِرَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِهِ: هَلْ تَزَوَّجْتَ يَا فُلَانُ؟ قَالَ: لَا وَاللّٰهِ يَارَسُولَ اللهِ، وَلَا عِنْدِي مَا أَتَزَوَّجُ بِهِ، قَالَ: أَلَيْسَ مَعَكَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ؟ قَالَ: بَلَى، قَالَ: ثُلُثُ الْقُرآنِ، قَالَ: أَلَيْسَ مَعَكَ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ؟ قَالَ: بَلَى، قَالَ: رُبُعُ الْقُرآنِ قَالَ: أَلَيْسَ مَعَكَ قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ؟ قَالَ: بَلَى، قَالَ: رُبُعُ الْقُرآنِ قَالَ: أَلَيْسَ مَعَكَ إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ؟ قَالَ: بَلَى، قَالَ: رُبُعُ الْقُرآنِ قَالَ: تَزَوَّجْ تَزَوَّجْ.

(نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ ایک آدمی سے پوچھا: اے فلاں! کیا تم نے نکاح کرلیا؟ اس نے عرض کیا: بالکل نہیں یارسول اللہ! اور میرے پاس شادی کرنے کے لیے کچھ ہے بھی نہیں، حضور ﷺ نے پوچھا: کیا تیرے پاس قل ھو اللہ أحد نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں! فرمایا: وہ ایک تہائی قرآن ہے۔ پھر حضور ﷺ نے دوسرا سوال کیا: کیا تیرے پاس سورۂ اذا جاء نصر اللہ والفتح نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: یہ سورت قرآن کا ایک چوتھائی ہے۔ پھر حضور ﷺ نے پوچھا: کیا تیرے پاس قل یا ایھا

---

(۱) مسند أحمد: ۱۸۴، ۹۵۰۱ وصحیح البخاري: ۵۰، ۴۷۷۷ وصحیح مسلم: ۱/۸، ۵/۹، ۷/۱۰ وغیرھا.

الکافرون نہیں ہے؟ اس نے جواب میں کہا: کیوں نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تو ایک چوتھائی قرآن ہے۔ پھر آپ ﷺ نے سوال کیا: کیا سورۂ اذا زلزلت الارض زلزالھا تمہیں یاد نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ بھی ایک چوتھائی قرآن ہے۔ نکاح کر لے، نکاح کر لے)[۱] الغرض اس کی فضیلت یہ ہے کہ اس کو پڑھنے پر ایک چوتھائی قرآن کے برابر ثواب ملتا ہے۔

نصف قرآن کا ثواب:

ترمذی ہی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سورۂ اذا زلزلت الارض زلزالھا نصف قرآن کے برابر ہے، سورۂ قل ھو اللہ احد تہائی قرآن کے برابر ہے اور قل یا ایھا الکافرون چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔[۲]

جامع اور یکتا......:

اس سورت کے آخر میں دو آیتیں ہیں: فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۝۷ وَ مَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸ یہ چھوٹی اور ایسی جامع آیات ہیں کہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ پوری شریعت مطہرہ کی تعلیمات کا ایک خلاصہ ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: الآیۃ الجامعۃ الفاذۃ (ایک جامع اور یکتا آیت ہے)[۳] یعنی ایسی جامع کوئی دوسری آیت قرآن میں نہیں ہے۔ شریعت کی تعلیم یہی تو کہتی ہے کہ اچھا عمل

---

(۱) مسند أحمد: ۱۸۴، ۹۵۰۱ وصحیح البخاري: ۵۰، ۴۷۷۷ وصحیح مسلم: ۸/۱، ۹/۵، ۱۰/۷ وغیرھا.

(۲) سنن الترمذي: ۲۸۹۴.

(۳) صحیح البخاري: ۲۳۷۱، ۲۸۶۰، ۳۶۴۶، ۴۹۶۲، ۴۹۶۳، ۷۳۵۶.

کروگے، تو اچھا بدلہ ملے گا، چاہے چھوٹا سا کیوں نہ ہو۔ اور برا عمل کروگے چاہے وہ چھوٹا سا کیوں نہ ہو، اس کا برا بدلہ ملے گا۔ گویا ان دو آیتوں میں قرآن پاک کی تعلیمات کا خلاصہ آ گیا ہے۔ یہ بھی اس سورت کی ایک خصوصیت ہے۔

سخت بھونچال:

اس سورت میں جس بھونچال کا تذکرہ ہے- جب زمین اپنے بھونچال کے ساتھ جھنجھوڑی جائے گی- وہ قیامت کا زلزلہ ہے۔ دنیا کے زلزلوں کی طرح نہیں ہے، دنیا کے زلزلے ایک- دو یا تین- چار شہروں کو ہلا دیتے ہیں، دوسری جگہ اس کا پتا بھی نہیں چلتا، جب کہ یہ تو اتنا زبردست اور خطرناک زلزلہ ہوگا کہ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ (الحج:۱) (اے لوگو! اپنے پروردگار کے غضب سے ڈرو، اور یقین جانو کہ قیامت کا بھونچال بڑی زبردست چیز ہے) اللہ تعالیٰ اس کو بڑی زبردست چیز فرما رہے ہیں۔ اس سے اس کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حواس اڑ جائیں گے......:

جب یہ زلزلہ اور بھونچال (ધરતીકંપ) آئے گا تو لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ. (الحج:۲) (جس دن تمہیں نظر آئے گا کہ ہر دودھ پلانے والی اس بچے تک کو بھول جائے گی جس کو اس نے دودھ پلایا ہے۔ اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی۔ اور لوگ تمہیں ایسے نظر آئیں گے جیسے نشے میں بدحواس اور بے ہوش ہیں؛ حالاں کہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے؛ بلکہ اللہ کا عذاب بڑا شدید ہوگا)۔ گویا قیامت کا بھونچال ایسا

خطرناک ہوگا کہ کوئی اپنے حواس میں باقی نہیں رہے گا، سب کے حواس اڑ جائیں گے۔ سورۂ حج میں جس بھونچال کی تفصیل بیان کی گئی ہے اسی کا یہاں تذکرہ ہے۔

پہلا زلزلہ:

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا (جب زمین اپنے بھونچال سے جھنجھوڑ دی جائے گی)

قیامت کے زلزلے سے متعلق روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دو زلزلے ہوں گے:

ایک وہ زلزلہ ہے جب حضرت اسرافیلؑ پہلی مرتبہ صور پھونکیں گے، اس وقت ساری چیزیں ختم ہوجائیں گی۔ اور اس صور کی ابتدا آہستہ سے ہوگی، یعنی ایک دم بھیانک آواز نہیں؛ بلکہ دھیرے دھیرے آواز نکلے گی، اور آہستہ آہستہ تیز ہوگی، یہاں تک کہ اس کی آواز سے تمام انسان، جنات، جانور سب مرجائیں گے، اس آواز کی وجہ سے زمین میں ایک زلزلہ آئے گا، جس سے لوگوں کے دل پھٹ جائیں گے، اور تمام ہلاک ہوجائیں گے۔ اِس وقت دنیا کی جو نقل وحرکت اور جو گہما گہمی ہے؛ سب ختم ہوجائے گی۔ اس دنیا کی زندگی ختم ہوجائے گی۔ یہاں تک کہ فرشتے بھی ختم ہوجائیں گے۔ یہ تو پہلے صور کی بات ہے۔

دوسرا زلزلہ:

پھر ایک زمانے تک خاموشی چھائی رہے گی، کچھ نہیں ہوگا، سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے، اللہ تعالیٰ تنہا رہیں گے۔ پھر دوبارہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب کو زندہ کریں گے، پہلے فرشتوں کو زندہ کریں گے، حضرت اسرافیلؑ دوبارہ صور پھونکیں گے۔ اس مرتبہ بھی زمین میں جو پہلے بھونچال آیا تھا ویسا ہی؛ بلکہ اس سے خطرناک بھونچال آئے گا، ساری زمین الٹ پلٹ ہو جائے گی، اس میں جو مردے دفن کیے گئے تھے وہ باہر نکل آئیں گے، دفینے اور خزینے،

قیمتی معدنیات بھی باہر آجائیں گی۔

اثقالھا سے کیا مراد ہے......؟؟؟

وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا (اورزمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی)

اس کے بوجھ کیا ہیں؟ جب سے کائنات بنی، تب سے لے کر جتنے انسان مرے اورزمین میں دفن کیے گئے وہ سب۔اورزمین میں جتنے بھی خزانے ہیں سونا، چاندی، تانبا، پیتل، جواہرات، ہیرے، کانیں اور دولت سب اس کے بوجھ ہیں، وہ باہر نکل آئیں گے، پھر انسان قبر سے زندہ باہر نکلیں گے، اور دوسری زندگی شروع ہوگی۔فرشتوں کو بھی دوبارہ وجود میں لایا جائے گا۔اسی دوسرے زلزلے کا اس سورت میں بیان ہے۔مفسرین کا راجح قول یہی ہے۔بڑی محنتوں اورکوششوں سے ان دولتوں کو زمین سے نکالا جاتا ہے؛ لیکن اس دن اس جھنجھوڑنے کی وجہ سے ان ساری چیزوں کے ڈھیر لگ جائیں گے، جن کو حاصل کرنے کے لیے انسان مارا مارا پھرتا ہے، دوڑ بھاگ، محنتیں اورکوششیں کرتا ہے۔

خزانے اگلوانے کا مقصد:

یہ سب اندر سے کیوں باہر نکلوایا جائے گا؟ حضرات علماء فرماتے ہیں کہ خزانوں کو اگلوانے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ یہی وہ دولت ہے جس کے لیے وہ مارا مارا پھرتا تھا، کسی نے اپنے بھائی کا گلا کاٹا، رشتہ داری ختم کی، جائز و ناجائز کی تمیز نہیں کی، اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے نہ معلوم کیسی کیسی حرکتیں کی تھیں؟ قاتل بھی سوچے گا کہ یہی وہ خزانے ہیں، جن کی خاطر میں نے قتل جیسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا تھا؟ جن کے لیے میں نے حلال وحرام کا فرق باقی نہیں رکھا تھا۔اس وقت خزانوں کے ڈھیر

پڑے ہوئے ہوں گے؛ لیکن یہ خزانے کسی کام کے نہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو کھلی آنکھوں یہ دکھا دیں گے کہ تم جس کے لیے دنیا کی زندگی میں مارے مارے پھرے تھے، لوگوں کے کیا کیا حق مارے تھے، تعلقات توڑے تھے یہ اب کسی کام کے نہیں ہیں۔ یہ ڈھیر پڑے ہیں۔ ہم اپنی دنیا کی زندگی میں ان ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے، گویا یہی ہماری پوری کائنات ہیں، ان کے لیے ہم بڑی محنتیں کرتے تھے، مشقتیں اٹھاتے تھے آج وہ کسی کام کے نہیں۔ ہمیں اُس وقت اللہ کے نبیوں اور مقبول بندوں نے بتلایا تھا، وہ سب انسان کو یاد آئے گا کہ دنیا میں نبوی تعلیمات کے ذریعے ہم کو یہ چیز بتلائی گئی تھی۔

کیا آپ......کر سکتے ہیں؟؟؟:

ویسے بھی پیسہ اپنی ذات کے اعتبار سے کوئی فائدہ دینے والا نہیں ہے۔ سونا، چاندی روپے کے نوٹ سے کیا آپ کھا کر اپنی بھوک مٹا سکتے ہیں؟ کیا ان کے ذریعے اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں؟ کیا کوئی آدمی ننگا ہے تو ان کو لباس کے طور پر پہن سکتا ہے؟ یا اگر گھر نہیں ہے، تو ان نوٹوں کو گھر کے طور پر استعمال کر سکتا ہے؟ نہیں! بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایک ذریعے اور سبب کے طور پر پیدا کیا ہے۔ دنیا میں انسان کی ضرورتیں اس مال کے ذریعے پوری کی جاتی ہیں۔

مال کی کمی؛ خود قاضیِ حاجت نہیں:

مان لیجیے! ایک آدمی جنگل میں ہے، اس کے پاس پورا بیگ ڈالروں سے بھرا ہوا ہے؛ لیکن وہاں کوئی دکان نہیں، کوئی بازار نہیں، کوئی چیز بیچنے والا نہیں، اگر اس کو وہاں بھوک لگی، پیاس لگی تو ان نوٹوں کو کیا کرے گا؟ کھائے گا؟ پیے گا؟ کیا اپنی ضرورت پوری

کرے گا؟ نہیں! ان پیسوں سے ذاتی طور پر کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ اس مال میں ایک یہ کمی ہے۔

...... پہلے نوٹ لاؤ:

دوسری کمی یہ ہے کہ مال ہاتھ سے نکل کر ضرورت پوری کرتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ جو اکابر تابعین میں سے ہیں، تمام اولیاء اللہ کے سرخیل ہیں، فقہا میں سے بھی ہیں، اور محدثین میں سے بھی ہیں، فرماتے ہیں: دیکھو! دنیا میں ساتھی وہ ہوتا ہے کہ جب وہ تمہارے ساتھ ہوتو اس سے تم کو فائدہ ہو، مدد ملے۔ لیکن یہ مال ایسا ساتھی ہے جو جائے گا تو تم کو فائدہ پہنچے گا، جیب میں اور ہاتھ میں رہتے ہوئے فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ پیسے ہم اپنے پاس ہی رہنے دیں اور یہ سمجھیں کہ میری کھانے، پینے، پہننے اور رہنے کی ضرورت پوری ہو جائے، تو کوئی ایک دانہ بھی آپ کو نہیں دے گا۔ دکان پر جائیں گے تو کہے گا: پہلے نوٹ لاؤ، جیب سے نکال کر مجھے دو۔ تو یہ ایسا ساتھی ہے کہ وہ آپ کا ساتھ چھوڑے گا تب آپ کو فائدہ ہوگا۔ اس کے باقی رہتے ہوئے کوئی فائدہ نہیں، آپ کا کوئی کام نہیں بنا سکتا۔ یہ بھی اس کی ایک کمزوری بیان کی گئی ہے۔

عبرت ناک واقعہ:

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے مواعظ میں ایک واقعہ لکھا ہے، پہلے زمانے میں بینکیں نہیں تھیں، لوگوں کے پاس سونے، چاندی، جواہرات، ہیرے وغیرہ ہوتے، تو وہ عام طور پر اپنے گھروں میں تہہ خانے بناتے تھے، اس میں حفاظت سے رکھتے تھے۔ ایک بہت بڑا مالدار آدمی تھا، اس کے پاس سونے، چاندی، جواہرات اور دراہم و دنانیر کے ڈھیر

تھے۔ اس نے ان کو رکھنے کے لیے اپنے مکان میں نیچے تہہ خانہ بنایا تھا، وہ تہہ خانہ ایسا تھا کہ اس کے دروازے پر ایک کَل لگائی تھی، جس کو کھولنے کا طریقہ اسی کو معلوم تھا، کسی اور کو نہیں۔ ایک مرتبہ وہ اپنے اس خزانے کو دیکھنے کے لیے اندر گیا۔ آدمی کے پاس پیسے ہوتے ہیں، تو معلوم ہونے کے باوجود نکال نکال کر گنتا ہے۔ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (مال جمع کیا اور گنتا ہے) گننے میں مزہ آتا ہے، جی خوش ہوتا ہے۔ تو وہ بھی اپنے اس تہہ خانے میں گیا، اور دروازہ بند کر کے مال و دولت کے ڈھیر کو گننے میں مشغول ہوا۔ تھوڑی دیر ہوئی تو بھوک لگی، سوچا کہ واپس جاؤں، لیکن دروازے کی کل خراب ہوگئی تھی، دروازہ نہیں کھلا۔ اب وہ اندر چلّاتا بھی ہے تو باہر کس کو پتا کہ وہ اندر گیا ہوا ہے؟ اب دیکھیے! سونے چاندی کے ڈھیر ہیں، دراہم و دنانیر ہیں، جواہرات ہیں؛ لیکن نہ اس کی بھوک مٹی، نہ پیاس مٹی، اسی میں وہ مر گیا۔ یہ بہت عبرت کا قصہ ہے۔ تو یہ مال اپنی ذات کے اعتبار سے ہم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ مگر عجیب اس کی محبت ہے کہ آدمی ہر وقت اسی میں مشغول رہتا ہے۔

بے کاری ظاہر ہو جائے گی:

تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ زمین کے خزانوں کو باہر نکال دیں گے۔ سارے ڈھیر پڑے ہوں گے۔ اور حضرت آدمؑ سے لے قیامت تک کے انسان، جنات، جانور سب میدانِ حشر میں ہوں گے، اور یہ دولت کے ڈھیر بھی ہوں گے؛ لیکن اس وقت آدمی ان کو دیکھ کر محسوس کرے گا کہ کسی کام کے نہیں ہیں۔ گویا اس کا بے کار ہونا اس کی آنکھوں کے سامنے واضح ہو جائے گا۔ اسی کو فرمایا: وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (زمین اپنے بوجھ نکال دے گی) ایک بوجھ تو دفن شدہ مردے ہیں۔ دوسرا بوجھ خزانے، دفینے اور معدنیات ہیں۔

دوسری زندگی:

اب انسانوں کی دوسری زندگی شروع ہورہی ہے؛ لیکن انسان دیکھ لے گا کہ میری اس دوسری زندگی میں یہ روپے، پیسوں کے ڈھیر کسی کام آنے والے نہیں ہیں، بلکہ نیکی کام آئے گی۔ تو اللہ تعالیٰ ان سب کو نکال کر انسان کی آنکھوں کے سامنے دکھا کر اس بات کا یقین دلا دیں گے کہ واقعۃً دنیا کی زندگی میں جو مجھ سے کہا جاتا تھا کہ یہ کسی کام کا نہیں ہے وہ آج حقیقت میں معلوم ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان حقائق کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، جس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہم اپنی عاقبت اور آخرت کو برباد کررہے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ زلزال

(قسط-۲)

(مؤرخہ ۲/رجب المرجب ۱۴۴۰ھ مطابق ۲/مارچ ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد للّٰہ نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً .

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۝

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۝۱ وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ۝۲ وَ قَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا ۝۳ يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۝۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا ۝۵ يَوۡمَئِذٍ يَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا ۙ۬ لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ ۝۶ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۝۷ وَ مَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸

ترجمہ:

یہ سورۂ زلزال ہے جو ابھی آپ کے سامنے تلاوت کی گئی۔ گذشتہ مجلس سے اس

سورت کی تشریح کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قیامت اور حساب و کتاب کے کچھ حالات بیان فرمائے ہیں۔ چناں چہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (جب زمین اپنے بھونچال سے جھنجھوڑی جائے گی)۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی)۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا (اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے؟)۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (اس دن زمین اپنی ساری خبریں بتادے گی)۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (کیوں کہ تمہارے پروردگار نے اس کو یہی حکم دیا ہوگا)۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ (اس روز لوگ مختلف ٹولیوں میں واپس ہوں گے؛ تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھا دیے جائیں)۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (چناں چہ جس نے ذرہ برابر کوئی اچھائی کی ہوگی، وہ اسے دیکھے گا)۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (اور جس نے ذرہ برابر کوئی برائی اور بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا)۔

یہی وہ بنیاد ہے:

گذشتہ مجلس میں آپ کو بتلایا تھا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے حالات کو بیان کیا ہے، جب اللہ تعالیٰ دوسرے صور کے بعد زمین سے مردوں کو زندہ کر کے اٹھائیں گے، اور اس وقت زمین پر ایک زلزلہ اور بھونچال طاری ہوگا، لہٰذا ایک طرف تو مردے زندہ ہو کر باہر آجائیں گے اور دوسری طرف زمین کے تمام خزینے، دفینے اور معدنیات وغیرہ سب باہر

آجائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے مردوں کو زندہ کریں گے۔یہی وہ بنیادی چیز ہے جس کا مشرکین مکہ انکار کرتے تھے۔اور کہتے تھے: اَءِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (الواقعۃ:۴۷) (کیا جب ہمارا وجود ہڈیوں میں تبدیل ہوجائے گا اور ہم مٹی میں مل جائیں گے،تو اس وقت دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے؟) اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے اس اشکال کا قرآن پاک میں مختلف طریقوں سے جواب دیا ہے۔

......تو کیا مشکل ہے؟؟؟

دیکھو! پہلے بھی میں بتلا چکا ہوں کہ اس کائنات کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا کیا، انسان کو پیدا کیا،مشرکین مکہ اس کا تو اقرار کرتے تھے؛لیکن دوبارہ پیدا کیے جانے کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابتداءً تم کو پانی کے ایک قطرے سے پیدا کیا، پھر جمے ہوئے خون کی شکل دی ، پھر اس کو گوشت کے لوتھڑے میں بدلا، پھر اس میں ہڈیاں بنائیں، پھر روح پھونکی،نتیجۃً دنیا میں تمہارا وجود ہوا۔ جب تم بالکل موجود نہیں تھے اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی قدرت سے تم کو وجود عطا فرمایا،تو مرنے کے بعد جب تم مٹی میں مل جاؤ گے تب اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے تمہارے اس وجود کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟

عام طور پر آدمی جب اپنی عقل سے کوئی بات سوچتا ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ کسی چیز کو ازسرِ نو بنانا تھوڑا مشکل ہے، بہ نسبت اس کے کہ وہ چیز ایک مرتبہ بنانے کے بعد دوسری مرتبہ بنائے۔تو جب تم لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو اور پوری کائنات کو بنایا، جب تم اپنے ابتدائی وجود کو اللہ کا بنایا ہوا تسلیم کرتے ہو،تو مرنے کے بعد اللہ

تعالیٰ دوبارہ پیدا کریں گے اس کو ماننے میں کیا اشکال ہے؟ جب کہ دوبارہ کسی چیز کو بنانا عقلاً مشکل ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے تو سب برابر ہے۔

آسمان کی تخلیق مشکل ہے یا انسان کی؟؟؟:

قرآن میں ایک اور جگہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا (النّٰزعٰت: ۲۷) (کیا تمہارا پیدا کرنا دشوار ہے، یا اس آسمان کا جو پوری کائنات کو محیط ہے؟) ظاہر ہے انسان کا وجود تو پانچ چھ فٹ کا ہے، اس کے مقابلے میں یہ آسمان جو پوری کائنات کو گھیرے ہوئے ہے۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی قدرت سے اسے بنایا تو ظاہر ہے کہ آسمان کی تخلیق انسان کی تخلیق کے مقابلے میں مشکل ہے!!! جب اللہ تعالیٰ نے آسمان بنادیا تو تمہارے پانچ چھ فٹ کے وجود کو بنانا کیا دشوار ہے؟ اس میں کیا رکاوٹ پیدا ہوجائے گی؟ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے دوبارہ زندگی عطا فرمانے میں کیا اشکال ہے؟

عالم ثانی جزائے این وآں:

اب سوال یہ ہے کہ اللہ دوبارہ زندگی کیوں دیں گے؟ کیا ضرورت ہے؟ اس لیے کہ تم کو اپنے اعمال کا بدلہ دیا جائے۔ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی پوری زندگی نیک کام کرتا ہے، اور بہ ظاہر اس کے حالات کو ہم بہ غور دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ان نیک اعمال کا کوئی بدلہ اس دنیا میں نہیں ملا۔ اس کے برخلاف ایک آدمی ہے، جو ہر وقت ظلم وزیادتی میں مشغول ہے، گناہوں میں لت پت ہے، برائیاں کرتا رہتا ہے، پوری زندگی اسی طرح گزار دیتا ہے، بہ ظاہر ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ اس کو اس کے ان گناہوں کی کوئی سزا دنیوی زندگی میں ملی ہو۔ تو اللہ تعالیٰ دوسری زندگی اسی لیے عطا فرمائیں گے: لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ

تا کہ انہوں نے دنیا میں جو اعمال کیے ہیں- اچھے اعمال کرنے والوں کے اچھے اعمال اور برے اعمال کرنے والوں کے برے اعمال- ان کا بدلہ اور سزا ان کو دی جائے۔ دوسری زندگی دینے کا یہی مقصد ہے۔

چوں شوی بیدار از خواب اے عزیز!:

اگلی مجلس میں بتلا دیا گیا تھا کہ اس دوسرے بھونچال کی وجہ سے ایک طرف تو جو مردے زمین میں دفن ہوں گے وہ زندہ ہو کر باہر آ جائیں گے، اور دوسری طرف زمین اپنے اندر چھپے ہوئے تمام خزینے اور دفینے اگل دے گی۔ جب انسان اپنی آنکھوں سے ان تمام مناظر کو دیکھے گا تو کہے گا کہ ارے! یہی تو وہ مال ہے، یہی تو وہ دولت ہے جس کی خاطر میں نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا، جس کی خاطر میں نے اپنے رشتہ داروں سے تعلقات ختم کر دیے تھے، جس کی خاطر میں نے حلال و حرام کی تمیز ختم کر دی تھی۔ آج یہ مال کسی کام کا نہیں ہے، ڈھیر پڑے ہوئے ہوں گے؛ لیکن وہ انسان کے کسی کام کے نہ ہوں گے۔ دوسری زندگی میں اس مال سے کوئی کام بننے والا نہیں ہے۔ گویا عالم آخرت میں اس مال کا بے کار ہونا اللہ تبارک و تعالیٰ انسانوں کو ان کی حقیقی آنکھوں سے دکھلا دیں گے۔

زمین ہماری سی آئی ڈی:

یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا (اس دن زمین ساری خبریں لوگوں کی دے گی)۔

کیا خبریں دے گی؟ حدیث شریف میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر زمین کے کسی حصے پر کسی آدمی نے کوئی نیکی کا کام کیا ہے، تو زمین قیامت کے روز گواہی دے گی کہ فلاں آدمی نے، فلاں دن، فلاں تاریخ کو میرے اوپر نیکی کا یہ کام کیا تھا۔ وہ

گواہی دے گی۔ زمین کے کسی خطے پر کسی نے گناہ کا کوئی کام کیا ہے تو قیامت کے روز زمین اس کے متعلق گواہی دے گی کہ فلاں آدمی نے، فلاں دن، فلاں تاریخ، فلاں وقت میں مجھ پر فلاں گناہ کیا تھا۔ گویا یہ زمین ہماری سی آئی ڈی ہے، جاسوس ہے۔ قیامت کے روز وہ سارے حالات اللہ کے حضور بتلا دے گی، سنا دے گی۔

ایں بجز حق دیگرے کے می کند:

اب کسی کے دل میں خیال آسکتا ہے کہ یہ زمین تو مٹی اور پتھر کا ایک مجموعہ ہے۔ وہ کیسے بولے گی؟ وہ کیسے اپنی خبریں سنائے گی؟ اس لیے کہ وہ تو مٹی اور پتھر ہے، نہ تو اس میں عقل ہے، نہ کوئی سمجھ ہے، نہ اس میں بولنے کی صلاحیت و طاقت ہے۔ وہ کیسے بولے گی؟ اس میں بتلانے کی یہ صلاحیت کیسے پیدا ہوجائے گی؟ اور وہ اپنی ساری خبریں کیسے سنائے گی؟ تو اس کا جواب صاف ہے کہ دیکھیے! اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے، انسان کے تمام اعضا میں سے صرف زبان بولتی ہے۔ تو زبان کو کس نے پیدا کیا؟ اللہ نے پیدا کیا۔ زبان میں قوتِ گویائی کس نے رکھی؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے رکھی۔ حالاں کہ بہ ظاہر زبان گوشت کا ایک لوتھڑا ہے بس!!! تو جو اللہ گوشت کے ایک لوتھڑے میں بولنے کی صلاحیت پیدا فرما سکتے ہیں، تو زمین جو مٹی اور پتھر کا مجموعہ ہے، اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ قوت گویائی ڈال دیں تو یہ کون سے تعجب کی بات ہے؟

......زبان میں بھی زبان نہیں:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا واقعہ ہے: ایک مرتبہ وہ ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے، دورانِ سفر ایک آدمی نے آپ سے سوال کیا کہ حضرت!

قرآن میں آتا ہے کہ قیامت کے روز آدمی کے ہاتھ پاؤں اس کے خلاف گواہی دیں گے، تو وہ کیسے بولیں گے؟ جب کہ ان میں کوئی زبان نہیں ہے!!! ہاتھ میں کوئی زبان نہیں، وہ کیسے بولتی ہے؟ پاؤں میں کوئی زبان نہیں، وہ کیسے بولے گا؟ تو حضرت نے فرمایا: زبان میں بھی زبان نہیں ہے، وہ کیسے بولے گی؟ حضرت کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ زبان جو بولتی ہے، اس میں اس کی اپنی کوئی صلاحیت نہیں ہے؛ بلکہ اس میں بولنے کی صلاحیت اور قوت گویائی اللہ نے رکھی ہے۔ جس اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے زبان میں بولنے کی صلاحیت رکھی، وہی اللہ قیامت کے روز ہاتھ اور پاؤں کو بھی قوت گویائی عطا کرے گا۔ اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (فصلت: ۲۱) یہ انسان بھی اپنے اعضا سے کہے گا کہ ارے! تم میرے خلاف کیسے گواہی دے رہے ہو؟ وہ کہیں گے: جس اللہ نے سب کو بولنے کی قوت عطا فرمائی تھی، اس نے ہمیں بھی قوت گویائی عطا فرمائی، اس لیے ہم بول رہے ہیں۔

......تو کوئی گونگا نہ ہوتا:

تو ''بولنا'' زبان کا اپنا ذاتی کمال نہیں ہے؛ بلکہ زبان بھی اس لیے بولتی ہے کہ اللہ نے اس میں یہ صلاحیت رکھی ہے۔ ورنہ بہت سی مرتبہ بعض بولنے والے اچانک خاموش ہو جاتے ہیں، زبان جوں کی توں ہے۔ اگر ''بولنا'' یہ زبان کا ذاتی وصف ہوتا تو زبان ہر حال میں بولتی، دنیا میں کوئی گونگا نہ ہوتا۔

طفل را در مہد گویا او کند:

بعض لوگوں کی زبان نہیں بولتی۔ بچوں کی زبان بولتی نہیں۔ لیکن بعض مرتبہ بچوں کی زبان کو بھی اللہ تعالیٰ بولتا ہوا کر دیتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کو بچپن میں ہی اللہ تعالیٰ نے قوت

گویائی عطا فرمائی تھی۔ ویسے عام عرف یہی ہے کہ بچہ بولتا نہیں ہے؛ لیکن حدیث میں بعض بچوں کے قصے آتے ہیں، اور قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کا واقعہ ہے، کہ جب وہ پیدا ہوئے تو پیدا ہوتے ہی بولے: قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا (مریم:۳۰) (میں اللہ کا بندہ ہوں، اور اللہ نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے اپنا نبی بنایا)۔ بچہ ہونے کی حالت میں بولے، حالاں کہ بچے بولتے نہیں ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے جب قوت گویائی عطا فرمائی تو وہ بولے۔ تو بڑوں کو بولنے کی صلاحیت کس نے دی؟ اللہ نے۔ وہی اللہ اگر بچوں کو بولنے کی صلاحیت دے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے؟

جب بیل بولا:

جانور بھی انسانی زبان میں بات کرتے ہیں۔ بخاری شریف میں ہے کہ ایک آدمی بیل پر سواری کر کے جا رہا تھا، تو اس بیل نے پیچھے اس کی طرف منہ کر کے کہا: میں اس کے لیے پیدا نہیں کیا گیا، مجھے تو اللہ تعالیٰ نے کھیتی کے لیے پیدا کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا: اس پر میرا ایمان ہے، اور ابوبکرؓ اور عمرؓ کا ایمان ہے۔ اس وقت مجلس میں حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ موجود نہیں تھے؛ لیکن ان کی ایمانی قوت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی اعتماد پر فرمایا کہ اس پر میرا اور حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کا ایمان ہے۔[1]

حدیث میں اور بھی بچوں کے بولنے کے واقعات آئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ جیسے بڑے کی زبان کو قوت گویائی اللہ نے عطا فرمائی، کبھی اللہ تعالیٰ بچوں کو بھی یہ قوت عطا فرماتے ہیں۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ قیامت کے زلزلے کے بعد زمین کو- جو ایک مٹی اور پتھر کا

---

(۱) صحيح البخاري: ۲۳۲۴، ۳۴۷۱، ۳۶۶۳، ۳۶۹۰.

مجموعہ ہے- بولنے کی صلاحیت دے دیں تو اس میں تعجب کیا ہے؟

مؤمن کا عقیدہ:

زمین انسان کے اعمال کی گواہی دے گی۔ ہم لوگ بعض مرتبہ کوئی کام کرتے ہیں، تو ہر طرف دیکھ لیتے ہیں کہ کوئی ہے یا نہیں؟ حالاں کہ ایک مؤمن کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ہر حرکت وسکون سے واقف ہیں، سب جانتے ہیں؛ لیکن اس کی طرف سے غفلت برتتے ہوئے آدمی دوسری چیزوں کی طرف دھیان رکھتا ہے کہ یہاں کوئی اور ہے؟ ارے بھائی! تم جہاں بھی کوئی نیک یا برا عمل کروگے تو وہاں زمین تو موجود ہے!!! وہ آپ کے اس عمل کو ریکارڈ کر رہی ہے، محفوظ کر رہی ہے، اس کی تصویر لے رہی ہے، اور آپ جو بول رہے ہیں اس کو بھی محفوظ کر رہی ہے۔ آپ کے عمل کو ریکارڈ کرنے کے بعد قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی گواہی دے گی۔ ہم یوں سمجھ رہے ہیں کہ اس کو کچھ پتا نہیں، وہ نہیں دیکھ سکتی۔ نہیں! زمین میں اللہ نے یہ سب صلاحیت رکھی ہے، اور اس صلاحیت کا اُس روز پتا چلے گا۔ اور قیامت کے روز زمین انسانوں کے اعمال سے متعلق اپنی ساری خبریں سنائے گی۔

ایک سوال:

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے لے کر اب تک جاری ہے، ہزاروں سال ہو گئے۔ لاکھوں، کروڑوں، بلکہ اربوں انسان پیدا ہو گئے، اور قیامت تک نہ معلوم کتنے لاکھوں، کروڑوں انسان مزید پیدا ہوں گے؟ اور زمین کے ایک گز ٹکڑے پر بے شمار انسانوں نے کیا کیا اچھے اور برے اعمال کیے، کیا زمین

کا وہ ٹکڑا ان تمام انسانوں کے ان اچھے اور برے اعمال کے متعلق گواہی دے پائے گا؟ ایک چھوٹا سا ٹکڑا کیسے گواہی دے گا؟

قیاس مع الفارق:

اس کا جواب دیا گیا کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بنائی ہے، یہ ہماری دنیا ہے، اس میں جو حالات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، آخرت کے حالات کو بھی ہم اسی پر قیاس کرتے ہیں۔ حالاں کہ آخرت کا حال دنیا کے حال سے الگ ہوگا۔ دنیا میں بھی ایک خطے میں جو صورتِ حال ہوتی ہے وہ دوسرے خطے میں نہیں ہوتی، یہاں گرمی ہے، کسی جگہ سردی ہے۔ یہاں دن بڑا ہے، کسی جگہ دن چھوٹا ہے۔ تو اسی طرح دنیا میں جو حالات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اسی کیفیت اور حالت کا آخرت میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ قرآن میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاِنَّ يَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّكَ كَاَلۡفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (الحج:۴۷) (اللہ کے ہاں کا ایک دن، تمہارے ہزار دنوں کے برابر ہے) یعنی دنیا کے ہزار دن، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں کا ایک دن۔ تو آخرت کے دن کو ہم دنیا کے دن پر قیاس کریں تو یہ درست نہیں ہے۔ گویا آخرت کا معاملہ الگ ہے، دنیا کا معاملہ الگ ہے۔

وقت میں لمبائی اور چوڑائی بھی:

اس کی وضاحت کرتے ہوئے بعض علماء نے لکھا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز کی ایک لمبائی، ایک چوڑائی اور ایک گہرائی ہوتی ہے۔ وقت کے متعلق ہم یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں صرف لمبائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وقت میں لمبائی بھی ہے اور چوڑائی بھی ہے۔ وہ چوڑائی ہم کو نظر نہیں آتی ہے۔ بہت سی مرتبہ اللہ تبارک وتعالیٰ ایک مختصر

سے وقت میں بڑے لمبے لمبے کام انجام دلوا دیتے ہیں، کیسے؟ وہ اس وقت کی چوڑائی کو وجود میں لاتے ہیں، جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ قیامت کے روز اس کا ظہور ہوگا۔

تو زمین پر انسانوں نے جو اعمال کیے ہوں گے اچھے یا برے اس کے متعلق وہ گواہی دے گی۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتلا دیا، اس لیے ہمیں چوکنا کیا جا رہا ہے کہ تم غافل مت رہو، تم یہ مت سمجھو کہ میں یہ حرکت کر رہا ہوں اس کو کوئی دیکھ نہیں رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو دیکھ ہی رہے ہیں، لیکن زمین کے جس خطے پر آپ یہ کام کر رہے ہیں وہ زمین بھی دیکھ رہی ہے، ریکارڈ کر رہی ہے، نوٹ کر رہی ہے اور قیامت کے روز وہ گواہی دے گی۔

اس زمین پر توبہ بھی کرلو......!!!

اسی لیے ہمارے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اگر کسی آدمی سے کسی زمین پر کوئی گناہ ہو گیا، تو اس کو چاہیے کہ اسی زمین پر وہ توبہ بھی کر لے۔ تاکہ کل کو جب یہ زمین تمہارے اس گناہ کی گواہی دے، تو ساتھ ساتھ توبہ کی بھی گواہی دے دے، کہ اس نے مجھ پر یہ گناہ کیا تھا؛ لیکن توبہ بھی کر لی تھی۔ اس کی عادت ڈالو۔ توبہ بھی دوسری نیکیوں کی طرح نیکی ہی ہے۔ اور زمین جس طرح گناہوں کی گواہی دے گی، نیکیوں کی بھی گواہی دے گی۔ اس لیے ہمیں اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اگر ہماری غفلت، کوتاہی اور عادت بد کی وجہ سے کسی خطۂ زمین پر کسی گناہ کا صدور ہو گیا ہو تو فوراً اور یاد نہیں آیا، تو دوسرے وقت میں وہیں جا کر توبہ کریں؛ تاکہ زمین کا وہی خطہ اس کے حق میں توبہ کی بھی گواہی دے دے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں تو دونوں چیزوں کو دیکھا جائے گا اور دونوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ ہوگا۔ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (اس دن زمین اپنی ساری خبریں بتا دے گی) بِاَنَّ رَبَّكَ

اَوۡحٰی لَهَا (کیوں کہ تمہارے پروردگار نے اس کو یہی حکم دیا ہوگا) تو اللہ جس طرح دنیا میں زبان سے بلواتے ہیں، آخرت میں زمین سے بھی بلوائیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان چیزوں کا یقین عطا فرمائے۔ جو ہماری زندگی میں تبدیلی لاسکیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ زلزال

(قسط-۳)

(مؤرخہ ۹/رجب المرجب، ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۶/مارچ ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً .

أمابعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم۝

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۝۱ وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ۝۲ وَ قَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا ۝۳ يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۝۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا ۝۵ يَوۡمَئِذٍ يَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا ۙ لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ ۝۶ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۝۷ وَ مَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸

یہ سورۂ زلزال آپ کے سامنے تلاوت کی گئی، گذشتہ دو مجلسوں سے اس کی تشریح کا سلسلہ جاری ہے۔ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قیامت اور دوبارہ زندہ کیے جانے کے

حالات بیان فرمائے ہیں۔

اسی سلسلہ میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَىِٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (اس دن زمین اپنے واقعات برملا لوگوں کے سامنے بتائے گی) میری پشت پر کیا کیا واقعات پیش آئے؟ کس آدمی نے کیا عمل کیا؟ مفصل بتلائے گی۔

ایک اشکال:

اس موقع پر بعض لوگ اشکال کرتے ہیں کہ یہ زمین تو جمادات میں سے ہے، ایک بے جان چیز، پتھر اور مٹی کا مجموعہ ہے۔ اس میں نہ تو کوئی شعور اور ادراک ہے، نہ احساس ہے۔ وہ کیسے ان واقعات کو اپنے اندر محفوظ رکھ کر بیان کر سکے گی؟

قدرت نے تیری ان کو تسبیح خواں بنایا:

قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی جگہوں پر اس غلط فہمی کو دور فرمایا ہے۔ چناں چہ باری تعالیٰ نے ایک موقع پر فرمایا کہ یہ پتھر تمہارے سامنے تو حرکت نہیں کرتے، تم کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں، نہ بولتے ہیں، نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں، حالاں کہ ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ کائنات کی تمام چیزوں کے متعلق باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ بہ ظاہر بے جان و بے شعور نظر آتی ہیں؛ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر چیز میں کچھ نہ کچھ شعور، ادراک اور احساس پیدا فرمایا ہے۔ چناں چہ قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (الاسراء:۴۴) (کائنات کی ہر چیز اللہ کی پاکی اور تسبیح بیان کرتی ہے؛ لیکن اے انسانو! تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو) ہمیں پتا نہیں چلتا کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی پاکی بیان کر رہی ہیں۔ حالاں کہ پتھر بھی اللہ کی

پاکی بیان کررہاہے،اوردرخت بھی اللہ کی پاکی بیان کررہاہے،پہاڑ بھی اللہ کی پاکی بیان کر رہاہے،دریابھی اللہ کی پاکی بیان کررہاہے،زمین بھی اللہ کی پاکی بیان کررہی ہے،آسمان بھی اللہ کی پاکی بیان کررہاہے،ہرچیز اللہ کی پاکی اورتسبیح بیان کررہی ہے۔

پتھر میں شعور:

بلکہ قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک جگہ خاص طور پر پتھروں کے سلسلے میں ارشادفرمایا: وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (البقرة:۷۴)(بعض پتھرایسے ہیں کہ بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ کے خوف وخشیت کی وجہ سے لڑھک جاتے ہیں)

پہاڑ میں ادراک:

ایک اورجگہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر:۲۱)(اگرہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پراتاراہوتا توآپ دیکھتے کہ وہ پہاڑ بھی اللہ کی خشیت سے جھکا ہوااور پھٹا پڑ رہاہے) پہاڑ بہ ظاہر بے جان اور جماد نظر آتاہے؛لیکن اللہ نے اس کے اندربھی شعور رکھاہے۔تبھی تو وہ کیفیت اس میں پیداہوئی جوقرآن نے بیان کی۔معلوم ہواکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں بھی اس کے مناسب شعوراورسمجھ رکھی ہے۔

درختوں میں سمجھ:

درختوں کودیکھو!کوئی درخت کسی دیوار کےقریب اگاہے،جب بڑھتے بڑھتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچتاہے کہ جہاں دیوارآڑے آرہی ہے،تودرخت اپنارخ بدل دیتاہےاورمڑ

جاتا ہے۔ درخت کو کس نے بتایا کہ اب تیرا راستہ بند ہو گیا ہے، تجھے راستہ بدلنا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو جس شعور اور سمجھ کی ضرورت ہے، وہ عطا فرمائی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنا رخ موڑ لیتا ہے۔ کیا کسی انسان نے آکر اس کو وہاں سے ہٹایا؟ نہیں! وہ خود ہی اپنا راستہ بدل لیتا ہے۔ اس کو کس نے بتایا؟ کیسے اس نے راستہ بدلا؟ یہ سمجھ اس کے اندر کہاں سے آئی؟ یہ شعور اور ادراک کہاں سے آیا؟ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے اس کی حالت کے مناسب شعور اور ادراک رکھا ہے۔

زمین؛ اللہ کا جاسوس:

اس زمین سے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ اسی سورت میں فرماتے ہیں کہ وہ اپنی خبریں بیان کرے گی۔ تو زمین کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ بہ ظاہر نہ وہ بولتی ہے، نہ اس کی کوئی زبان ہے، گونگی معلوم ہوتی ہے، نہ اس کے کوئی کان نظر آتے ہیں، بہری معلوم ہوتی ہے، نہ وہ کچھ دیکھتی ہوئی ہمیں نظر آتی ہے، نہ اس کی آنکھیں ہیں؛ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ کوئی بھی کام جب اس کی پشت پر ہوتا ہے، کوئی بھی انسان اچھا یا برا عمل کرتا ہے تو زمین دیکھتی ہے، اور ریکارڈ کرتی ہے، وہ بات بھی سنتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے شعور عطا فرمایا ہے۔ جیسا کہ اگلی مجلس میں بتلایا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز یہ زمین ان ساری چیزوں کو جو اس نے اپنے پیٹ میں ریکارڈ کی ہیں؛ بتلائے گی، ابھی تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہیں ہے، ایک بے جان چیز ہے؛ لیکن یہی اللہ میاں کا جاسوس ہے۔ اور یہ ایک ایسا جاسوس ہے کہ ہم اس سے بچ نہیں سکتے۔ آدمی گناہ کرنے کے لیے کہاں جائے گا؟ زمین سے ہٹ کر تو جانے والا نہیں۔ زمین تو ہر جگہ ہے، اس سے اس کو ہر جگہ واسطہ پڑتا ہے۔ تو یہ

زمین بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا جاسوس ہے۔

اس کی کیا گارنٹی......؟؟؟:

اب ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ زمین قیامت کے روز گواہی دے گی، اور سب خبریں بتلائے گی۔- گواہی دنیا میں بھی دی جاتی ہے- تو گواہی کبھی سچی ہوتی ہے اور کبھی جھوٹی بھی۔ تو زمین انسانوں کے متعلق جو گواہی دے گی اس میں کیا گارنٹی ہے کہ سچی ہی گواہی دے گی؟ جھوٹی نہیں دے گی؟ ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آدمی کے کسی کے خلاف جھوٹی گواہی دینے کی دو وجہ ہوسکتی ہیں:

دشمنی؛ جھوٹی گواہی کا سبب:

(۱) گواہی دینے والے کی- جس کے خلاف وہ جھوٹی گواہی دے رہا ہے- دشمنی۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ میں اس کو مصیبت اور تکلیف میں ڈالوں، سزا دلواؤں۔ لہٰذا سزا دلوانے کے لیے وہ اس کے خلاف جھوٹی گواہی دیتا ہے؛ تاکہ اس کے خلاف فیصلہ ہو، اور اس کو تکلیف میں ڈالا جائے۔

ماں بیٹے کے خلاف کیوں گواہی دے......؟؟؟:

تو زمین جھوٹی گواہی کیوں دے گی؟ کیا زمین کو ہمارے ساتھ کوئی دشمنی ہے؟ ظاہر ہے کہ زمین کو ہمارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے؛ بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ زمین تو ہماری ماں ہے۔ گجراتی میں بھی بولتے ہیں: માતૃભૂમી انسان اسی مٹی سے پیدا ہوا ہے، تو زمین کا رشتہ ہمارے ساتھ کچھ ایسا ہی ہے جیسا ماں کا اپنے بیٹے کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ بھلا

ماں اپنے بیٹے کے خلاف ایسی گواہی کیوں دے گی، جس کی وجہ سے اس کو سزا ہو جائے!!!
کیا ماں جھوٹی گواہی دے سکتی ہے؟ نہیں۔ تو زمین کو بھی ہمارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے۔
آپ نے نیکی کی ہے تو وہ بھی بتا دے گی، اور بدی کی ہے تو وہ بھی بتلائے گی۔ وہ تو حقائق کا
اظہار کرتی ہے، کسی دشمنی کے سبب نہیں۔

اکراہ: جھوٹی گواہی کا سبب:

(۲) کسی کے خلاف جھوٹی گواہی دینے کی دوسری وجہ کسی صاحب اقتدار اور طاقتور
شخص کا اکراہ ہے، وہ تو نہیں چاہتا لیکن اس کو مجبور کیا گیا۔ اور مجبور کرنے کی وجہ سے وہ گواہ
اس کے خلاف جھوٹی گواہی دیتا ہے۔ اس گواہی دلوانے والے صاحب اقتدار کی آپ سے
دشمنی ہے، جس کی وجہ سے وہ گواہ سے آپ کے خلاف جھوٹی گواہی دلوا رہا ہے۔
اب زمین کے پاس کون گواہی دلوا رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ۔ آگے اللہ تعالیٰ فرماتے
ہیں: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا کہ زمین کو گواہی دینے کا حکم اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ
کون ہیں؟

زمین گواہی کیوں دے گی......؟؟؟:

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ رب ذکر فرمایا، یعنی وہ اللہ جس نے تمہیں پیدا
کیا، تمہیں پال پوس کر بڑا کیا، روزی دی، نعمتوں کی بارش برسائی، وہ اللہ اس زمین کو حکم
دے گا کہ وہ گواہی دے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو آپ کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اگر
اللہ تعالیٰ کو نعوذ باللہ کوئی دشمنی ہوتی تو وہ پیدا کیوں کرتا؟ اپنی نعمتیں کیوں کھلاتا پلاتا؟ اپنی
رحمتیں کیوں نازل فرماتا؟ تو لفظ رب استعمال فرمایا، یہ نہیں فرمایا: بان اللہ اوحیٰ لھا زمین اس

لیے گواہی دے گی کہ اس کو اللہ نے حکم دیا ہے۔ نہیں! بلکہ فرمایا: بِاَنَّ رَبَّكَ (تمہارے رب نے اس کو حکم فرمایا ہے)۔ اور اللہ نے حکم اس لیے دیا کہ وہ حقائق کا اظہار کرے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اس کی پشت پر جو اعمال کیے گئے، جو واقعات وجود میں آئے، وہ ظاہر ہوں، لہٰذا زمین کو کہا گیا کہ تو بول، وہ جو کچھ ہوا ہے سب سچ سچ بولے گی، جھوٹ نہیں بولے گی۔ اور نہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ وہ جھوٹی گواہی دے۔ اللہ تعالیٰ کو ہم سے کیا دشمنی؟

اگر دشمنی ہوتی تو……:

قرآن پاک میں باری تعالیٰ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں: مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ (النساء: ۱۴۷) (اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو اور ایمان لاؤ، تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟) تمہیں عذاب دے کر اللہ کا کیا فائدہ؟ وہ تو تم ہی برے کرتوت کر کے اپنے آپ کو عذاب کا حقدار بناتے ہو۔ اللہ کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایک ماں باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ جو شفقت و محبت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے ساتھ اس سے زیادہ شفقت و محبت ہے۔ تو بھلا اللہ تعالیٰ کیوں ہمارے خلاف زمین کے ذریعے سے جھوٹی گواہی دلوائیں گے؟ اللہ تعالیٰ اس کو گواہی دینے اور خبریں بتلانے کے لیے جو کہہ رہے ہیں اس کی وجہ تو صرف اتنی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ حقائق سامنے آجائیں۔ دنیا میں جو حقائق و واقعات پیش آئے تھے یہ زمین ان واقعات کو صحیح صحیح بیان کر دے۔ اسی لیے اگر اس نے گناہ کیا ہے تو وہ بھی بتلائے گی، اور نیکی کی ہے تو وہ بھی بتلائے گی۔ اگر دشمنی کی وجہ سے گواہی دیتی، تو نیکی نہ بتلاتی، بلکہ صرف گناہ کا اظہار کرتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔

اپنا اپنا گروپ:

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ (اس دن لوگ مختلف ٹولیوں کی شکل میں لوٹیں گے)۔یعنی جو نیک لوگ ہیں ان کی بھی مختلف ٹولیاں، مختلف گروہ اور مختلف گروپ ہوں گے۔ جیسے جیسے اعمال، نمازیوں کا گروپ الگ، صدقہ خیرات کرنے والوں کا گروپ الگ، روزہ رکھنے والوں کا گروپ الگ۔ جو جو اوصاف حمیدہ اور جیسی جیسی خوبیاں اور کمالات ہیں ان کے اعتبار سے ہر ایک گروپ ہوگا۔ بدکاروں کے گروپ بھی اسی طریقے سے ہوں گے۔ چوروں کا گروپ الگ، زانیوں کا گروپ الگ، شرابیوں کا گروپ الگ، دھوکہ دینے والوں کا گروپ الگ۔تمام لوگوں کو مختلف جماعت اور گروپ کی شکل میں لوٹایا جائے گا۔

یہ تو وہی وعدہ ہے……:

باری تعالیٰ سورۂ یاسین میں فرماتے ہیں کہ لوگ تو اپنی قبروں میں مرے ہوئے پڑے ہیں؛ لیکن جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو اس صور کی آواز کو سن کر مردے ایک دم کھلبلا کر زندہ ہو کر اپنی قبروں سے باہر نکل آئیں گے۔اور اس وقت ان کی زبان پر یہ ہوگا: يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰس: ۵۲) (کس نے اچانک ہم کو نیند سے اٹھا دیا اور اپنی قبروں سے باہر نکال دیا؟) پھر انسان کو یاد آئے گا: هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یٰس: ۵۲) ہاں! دنیا میں اللہ کے نبی اور پیغمبر آکر ہم کو بتلاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تم کو دوبارہ زندہ کریں گے، یہی اللہ کا وعدہ ہے جو پورا ہو رہا ہے، اور پیغمبروں نے ہمیں جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔ ہم اُس وقت ان کو نہیں مانتے تھے، انکار کرتے تھے؛ لیکن آج ہم اپنی

آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اللہ کا وہ وعدہ پورا ہو رہا ہے۔

اپنا اپنا ڈیٹا چیک کرلو.......:

اب میدان حشر میں مختلف ٹولیوں کی شکل میں کیوں لائے جائیں گے؟ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ (تا کہ ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال بتلائے جائیں)۔ تم نے دنیا میں کیا کیا تھا؟ تمہارا دنیا میں بالغ ہونے سے لے کر موت تک کا پورا ڈیٹا اعمال نامے میں موجود ہے، ہر ایک کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ آدمی جب اپنے اس اعمال نامے، اور اس ڈیٹا کو دیکھے گا تو اس کو سب یاد آئے گا۔ بسا اوقات ہم کوئی کام، کوئی چیز کرنے کے بعد بھول جاتے ہیں؛ لیکن جب ہمارے سامنے وہ چیز لائی جاتی ہے، تو ہم کو یاد آجاتی ہے۔ قیامت کے روز جب آدمی اپنے نامۂ اعمال کو دیکھے گا تو کہے گا: مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا (الکھف:۴۹) (اس نوشتے کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہیں ہے جو اس نے چھوڑا ہو) ہم جو بول بولے، جو حرکتیں کیں، جو خیالات دلوں میں پکائے تھے وہ سب کچھ اندر ہیں۔ سب لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ تو حشر میں اسی لیے لایا جائے گا کہ انہوں نے جو اعمال دنیا میں کیے تھے وہ اعمال ناموں کی شکل میں ان کو دکھلائے جائیں گے۔

جب اعمال نامہ پیش کیا جائے گا تو کہا جائے گا: اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (بنی اسرائیل:۱۴) دیکھو یہ تمہارا اعمال نامہ، پڑھ لو، تم ہی فیصلہ کرلو! یعنی تمہارا انجام کیا ہے، کہاں تمہیں بھیجا جانا ہے، جنت میں یا جہنم میں، سزا دی جائے گی یا انعام دیا جائے گا؟ ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہر آدمی سمجھ جائے گا کہ میرا انجام کیا ہے؟ کچھ بتلانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

الحاجة تفتق الحيلة:

پہلے زمانے میں تو لوگوں کو یہ بات سمجھنے میں ذرا دشواری ہوتی تھی، کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک لاکھوں کروڑوں، اربوں، کھربوں انسان پیدا ہوئے اور ہوں گے ان سب کا ریکارڈ، سب کے اعمال، نیکیاں، گناہ، ان کی سوچ، ان کے دلوں میں پکے ہوئے خیالات، اتنی ساری چیزیں، نیز کسی آدمی کی عمر پچاس سال، کسی کی ساٹھ، کسی کی ستر، کسی کی اسّی، کسی کی نوّے، کسی کی سو، کسی کی اس سے زیادہ، اتنی لمبی عمر، پہلے کے زمانے میں تو اس سے بھی لمبی عمریں ہوا کرتی تھیں، اتنی لمبی عمر میں جو کیا، وہ سب زمین کیسے بتلائے گی؟ تو لوگوں کی سمجھ میں آتا نہیں تھا، تو لوگوں کو سمجھانے کے لیے کہا جاتا تھا کہ بھائی! بس! اتنا سمجھ لو کہ جس اللہ نے ساری کائنات کو پیدا کیا، انسانوں کو پیدا کیا، اس اللہ کو اس بات پر قدرت ہے کہ وہ ساری چیزیں اس وقت پیش کردے۔ لیکن آج تو کمپیوٹر کی ایجاد نے یہ مسئلہ حل کردیا۔

......تب سمجھ میں نہیں آتا تھا:

قرآن میں باری تعالیٰ نے ایک چیز بتلائی: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (فصلت:۵۳) (اے انسانو! ہم کائنات میں اور تمہاری ذات میں ہماری ایسی نشانیاں تم کو بتلائیں گے جن کو دیکھ کر تم کو اس بات کا یقین ہوجائے گا کہ اللہ کا دین، اور اللہ نے یہ ساری چیزیں جو بھیجی ہیں وہ سب سچی ہیں) اللہ نے جو کہا تھا کہ تم کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا، تمہارے اعمال تمہارے سامنے پیش کیے جائیں گے اس وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا، اتنے لاکھوں کروڑوں اور کھربوں انسانوں کے اعمال نامے، ایک ایک آدمی کی پچاس، سو سال تک کی زندگی، یہ سب کیسے ہوگا؟ لیکن ایک کمپیوٹر کے چھوٹے سے پین ڈرائیو میں

لاکھوں انسانوں کا ڈیٹا بٹن دباتے ہی سامنے آجاتا ہے۔

ذات ہے تیری لامحدود:

اب تو تصویر کے ساتھ، یعنی انسان نے جو کیا ہے اس کی تصویر بھی موجود ہے کہ تم نے یہ حرکت کی ہے۔ تو وہاں بھی اسی طرح ہوگا۔ سب چیز اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا، لکھا ہوا بھی دیکھ لے گا، اور اپنے آپ کو کرتا ہوا بھی دیکھ لے گا۔ اللہ نے ایک ایسی ایجاد اسی انسان کے ہاتھوں کروائی ہے۔ جب ایک انسان، اللہ کا پیدا کیا ہوا، اللہ نے اس کو محدود عقل اور محدود طاقت دی، وہ اپنی اس محدود اور لمیٹیڈ عقل و طاقت کے ذریعے سب کچھ کر سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طاقت وقدرت تو لامحدود ہے، وہ اگر تمام انسانوں کے اعمال ناموں کو سب کے سامنے کھول کر رکھ دے، تو کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے آپ کے اعمال درست کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

تنبیہ:

اس سورت میں ہمیں متنبہ کیا گیا ہے کہ یہ مت سمجھنا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس کا کسی کو پتا نہیں ہے۔ عام طور پر انسان غلط کام کرنے کے لیے تنہائی تلاش کرتا ہے؛ لیکن جہاں بھی جائے گا وہاں زمین تو موجود ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہاں کوئی اور نہیں ہے۔ اگرچہ مؤمن کا عقیدہ تو یہ ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں، اللہ ہمیں دیکھتا ہے؛ لیکن اس وقت وہ اس کو بھول جاتا ہے، اور دوسرے لوگوں کی طرف نظر ہوتی ہے کہ کوئی انسان تو مجھے نہیں دیکھ رہا ہے؟ یہاں کوئی کیمرا تو لگا ہوا نہیں ہے؟ سب کا اطمینان کر لے تو بھی اللہ میاں کا لگایا ہوا کیمرا تو ہے ہی، وہ ایسا ہے کہ اس میں باتیں بھی آجاتی ہیں، اور کرتوت بھی آجاتے ہیں۔ ہمیں ان

سب کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

اللہ ہم سب کو توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ زلزال

(قسط-۴)

(مؤرخہ ۱۷ / رجب المرجب، ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۳ / مارچ ۲۰۱۹ء شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً .

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم۝

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۝۱ وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ۝۲ وَ قَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا ۝۳ یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۝۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰی لَهَا ۝۵ یَوۡمَئِذٍ یَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا ۬ۙ لِّیُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ ۝۶ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ ۝۷ وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝۸

سورۂ زلزال کی توضیح اور تشریح کا سلسلہ پچھلی مجالس سے چل رہا ہے۔ اس سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے اور قبروں سے نکل کر میدان حشر کی

طرف جانے کا منظر بیان فرمایا ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ (اس دن لوگ مختلف ٹولیوں اور مختلف گروہوں میں میدان حشر کی طرف جا رہے ہوں گے تا کہ ان کو ان کے اعمال دکھلائے جائیں)۔

اعمال دکھانے کا مطلب:

اعمال دکھلائے جانے کا کیا مطلب؟

(۱) ایک مطلب: ان کے سامنے ان کا نامۂ اعمال پیش کر دیا جائے گا، اور زندگی بھر انہوں نے جو بھی اچھے یا برے اعمال کیے تھے، ان کا سب کچا چٹھا انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، اور وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

(۲) دوسرا مطلب: ہم محاورہ میں بولتے ہیں کہ تم اپنے عمل کو دیکھ لو گے۔ یعنی تم کو اپنے عمل کا انجام دکھا دیا جائے گا۔ گویا جو بھی اچھے یا برے اعمال کیے ہیں، ان کا جو بھی اچھا یا برا انجام ہے وہ میدان حشر میں دوبارہ زندہ ہونے کے بعد انسان دیکھ لیں گے۔

میدانِ حشر میں پہنچنے کی شکل:

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا (اس دن لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر مختلف جماعتوں اور ٹولیوں میں میدان حشر کی طرف جائیں گے)۔

حشر کی طرف جانے شکل کیا ہوگی؟ بخاری شریف کی روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی شکل کے سلسلے میں وضاحت فرمائی ہے، کہ جب لوگوں کو دوبارہ زندہ کر کے، قبروں سے اٹھا کر میدان حشر کی طرف لایا جائے گا، اس وقت کچھ لوگ تو پیدل چلتے ہوئے

جائیں گے، کچھ لوگوں کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ سواریاں مہیا فرمائیں گے، وہ ان سواریوں پر سوار ہوکر میدان حشر کی طرف جائیں گے۔ اور معاذ اللہ! کچھ لوگ اپنے منہ کے بل گھسٹ کر میدان حشر کی طرف جائیں گے۔ قرآن میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا (ہم ان کو قیامت کے روز منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے ایسی حالت میں کہ وہ اندھے، بہرے اور گونگے ہوں گے، لائیں گے)۔

سر کے بل بھی چلا سکتا ہے……:

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کافر کو میدان حشر میں سر کے بل لایا جائے گا، تو وہ سر کے بل کیسے چلے گا؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: جس اللہ نے اس کو پاؤں کے ذریعے چلایا، وہی اللہ اپنی قدرت سے اس کو سر کے بل بھی چلائے گا۔ اللہ کے لیے کیا مشکل ہے؟ بھائی! بہت سے جانور ایسے ہیں کہ جن کے پیر نہیں ہیں، آپ سانپ کو دیکھیں، اسی طرح زمین کے کیڑے مکوڑوں کے عام طور پر پاؤں نہیں ہوتے ہیں، پھر بھی وہ زمین پر رینگ کر چلتے ہیں، لہٰذا وہ بھی اپنے سر کے بل زمین پر رینگ کر جائے گا۔

اس حدیث کے رواۃ میں سے حضرت قتادۃ تابعی رحمہ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جواب- جو اللہ اس کو پاؤں سے چلاتا ہے، وہ سر کے بل چلانے پر قادر ہے- نقل کرکے فرماتے ہیں: بلیٰ وعزۃ ربنا (کیوں نہیں! قسم ہے ہمارے پروردگار کی عزت کی)[1] گویا جس طرح وہ پاؤں سے چلا سکتا ہے، سر کے بل بھی چلا سکتا ہے۔

---

(۱) صحیح البخاري: ۴۷۶۰، ۶۵۲۳.

آنکھیں پھٹی رہ جائیں گی:

بہر حال! اپنے اپنے اعمال کے مطابق مختلف ٹولیوں اور مختلف گروہوں میں جیسے اعمال ہوں گے اسی کے مطابق لوگوں کو میدان حشر میں لایا جائے گا۔ دیکھیے! قیامت کے روز قبر سے اٹھتے ہی سختیاں شروع ہو جائیں گی، جہنم میں جانے پر موقوف نہیں ہوں گی۔ کفر و شرک یا بداعمالیوں کے ساتھ زندگی گزاری، ظلم کیا، تو قبر سے اٹھتے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سختیوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ دنیا میں ظالمین ظلم کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتے ہیں، وہ خود بھی غلط فہمی میں رہتے ہیں، اور بعض لوگ بھی یوں سمجھتے ہیں کہ ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا، باری تعالیٰ ایسے ظالموں کے متعلق قرآن میں صاف لفظوں میں فرماتے ہیں: وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ (ابراھیم:۴۲) (ظالم لوگوں کے بارے میں یہ مت سمجھو کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال اور کرتوتوں سے بے خبر ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک ایسے دن (قیامت) کے لیے ڈھیل دے رکھی ہے، جس میں ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی)۔

جب لوگ قبر سے اٹھیں گے اور میدان حشر کا ہولناک منظر دیکھیں گے، تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ آدمی کسی چیز کو دیکھتا ہے، پھر آنکھ بند کرتا ہے تو اس کی نگاہ اس کی طرف لوٹ کر آتی ہے؛ لیکن ہیبت ناک منظر ہوتا ہے تو آنکھ یوں ہی پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہے، نگاہ واپس نہیں آتی، بلکہ وہیں کی وہیں جم جاتی ہے۔ قرآن میں باری تعالیٰ آگے فرماتے ہیں: مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ (ابرھیم:۴۳) (وہ لوگ پکارنے والے کی پکار پر، آواز دینے والے کی آواز پر میدان حشر کی طرف دوڑے ہوئے جا رہے ہوں گے، اور ان کے چہرے اٹھے ہوئے ہوں گے، اور ان

کی آنکھیں پلٹ کر ان کی طرف نہیں آئیں گی، یعنی پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، اور ان کے کلیجے ہر چیز سے خالی ہوں گے)۔ گویا ان میں کچھ نہیں ہے، بالکل خالی۔ اطمینان وسکون سے خالی ہوں گے۔

اب میدان حشر میں سختی کا عالم کیا ہوگا؟ ہم بچپن سے سنتے آرہے ہیں کہ قیامت کے روز سورج ایک میل کی اونچائی پر ہوگا، گرمی شباب پر ہوگی۔ اِس وقت سائنس دانوں کے بتلانے کے مطابق سورج زمین سے نو کروڑ، تینتیس لاکھ (9,33,00000) میل دور ہے۔ اتنا دور ہونے کے باوجود گرمی کے زمانے میں گرمی کا یہ حال ہوتا ہے کہ ہم سے رہا نہیں جاتا۔ جب وہ ایک میل دور ہوگا تو آدمیوں کا کیا حال ہوگا؟

حفاۃً عراۃً غرلاً:

قیامت کے روز جب مردے قبر سے اٹھائے جائیں گے، تو کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (الانبیاء:۱۰۴) (ہم نے جس طرح پہلی مرتبہ ان کو ماں کے پیٹ سے پیدا کیا تھا، اسی طرح ان کو دوبارہ اٹھائیں گے)۔ جیسے: جب بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، تو کپڑے پہنے بغیر (ننگا) آتا ہے، بغیر جوتے کے برہنہ پا آتا ہے؛ اور بغیر ختنہ کے آتا ہے۔ تمام انسان اسی طرح پیدا ہوتے ہیں، قیامت کے دن بھی اسی طرح اٹھائے جائیں گے۔[1]

لوگ پسینوں میں......:

مسلم شریف کی روایت ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن سورج اتنا قریب ہوگا کہ گرمی کی شدت کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گناہوں کے مطابق

---

(۱) صحیح البخاري: ۳۳۴۹، ۳۴۴۷، ۴۶۲۵، ۴۷۴۰، ۶۵۲۶۔

پسینوں میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ کوئی ٹخنوں تک، کوئی گھٹنوں تک، کوئی کمر تک، کوئی سینے تک اور کسی کا پسینہ اس کے منہ تک ہوگا، گویا پسینہ اس کو لگام دیے ہوئے ہوگا۔[۱] وہ اپنے پسینے میں تیر رہے ہوں گے۔ یہ تو وہ پسینہ جو باہر ہے۔

روایات میں ہے کہ پسینہ نکلنے کے بعد ستر (۷۰) ہاتھ تو وہ پسینہ اندر جذب ہوگا۔[۲] اس حالت میں لوگ اپنے پسینوں میں تیر رہے ہوں گے۔

فزع اکبر:

میدان حشر میں جو گھبراہٹ، پریشانی اور خوف کا عالم ہوگا اس کو قرآن میں باری تعالیٰ نے اَلْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (الانبیاء:۱۰۳) (بہت بڑی گھبراہٹ) سے تعبیر کیا ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی پریشانی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس دن کی پریشانی سب سے بڑی پریشانی ہوگی۔ کافروں، مشرکوں کا گروہ بھی اسی حالت میں ہوگا۔ وہ اپنے اپنے اعمال کے مطابق تکالیف اور مشقت میں ہوں گے۔

اس کے بالمقابل ایک دوسری جماعت نیکو کاروں، فرماں برداروں اور اطاعت شعاروں کی ہے، جنہوں نے اپنی زندگی میں خواہشات پر لگام رکھی، اپنے آپ پر کنٹرول کیا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور پیروی میں اپنی زندگی کو گزارا، اور زندگی کی قدر کی۔ وہی میدان حشر اُن کے لیے بھی ہے، سورج اتنی ہی اونچائی پر، لیکن ان کا کیا حال ہوگا؟ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سایے میں ہوں گے، کوئی گھبراہٹ نہیں، ایئر کنڈشن میں ہیں۔ مشرکین، کفار، فساق وفجار جن تکلیفوں اور مشقتوں سے گذر رہے ہیں،

---

(۱) صحیح مسلم: ۶۲ - ۲۸۶۴.

(۲) صحیح البخاري: ۶۵۳۲.

ان مشقتوں کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوگا۔ بڑے اطمینان کے ساتھ اللہ کے پیدا کیے ہوئے سایے میں ہوں گے۔ اللہ ان سختیوں کو ان کے لیے آسان کر دیں گے۔

وہ سایہ کیسا ہوگا؟ ہم آج اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے: فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سبعة يظلهم الله في ظله يوم لاظل إلا ظله (سات آدمی ایسے ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سایے میں جگہ دیں گے جس دن اللہ کے سایے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا)۔[۱]

اپنے سایے میں؛ ایک نکتہ:

دیکھو! عام طور پر احادیث میں جو لفظ آتا ہے وہ ہے ''اپنے سایے میں''، عرش کا لفظ نہیں ہے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: عرش بھی تو ایک نورانی جسم ہے، اس کا سایہ کیسے؟ یہاں سایے کی نسبت اللہ کی طرف تعظیم اور تشریف کے لیے کی گئی ہے۔ جیسے: مسجد کو اللہ کا گھر کہتے ہیں، حالاں کہ یہ کوئی اللہ کے فروکش ہونے اور رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ اللہ نے اس کو اونچا مقام دینے کے لیے اس گھر کی نسبت اپنی طرف کر دی۔ اسی طرح اس سایے کا شرف، عظمت اور بزرگی کو ظاہر کرنے کے لیے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کر دی، یعنی اللہ کا سایہ۔ یعنی اللہ کے پیدا کیے ہوئے مخصوص سایے میں وہ لوگ ہوں گے۔ کون ہیں وہ سات آدمی؟

جہاں رابہ انصاف آباد دار:

(۱) الإمام العادل: انصاف کرنے والا حکمران، بادشاہ (સત્તાધીશ)۔

---

(۱) صحيح البخاري: ۶۶۰، ۱۴۲۳، ۶۸۰۶.

علماء نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حکومت کے بھی مختلف درجات ہیں۔ ایک تو سب کا بادشاہ ہوتا ہے، اس کے ماتحت مختلف علاقوں کے گورنر ہوتے ہیں۔ پھر ان گورنروں کے بھی ماتحت ہوتے ہیں، ہر ایک کو اللہ نے کسی نہ کسی درجے میں کسی نہ کسی پر حکومت اور اختیار عطا فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ گھر کا ایک بڑا ذمہ دار اپنے بیوی بچوں کا حاکم ہے، اگر اس نے ان کے ساتھ انصاف کا معاملہ کیا، ان کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کیا، تو وہ بھی الإمام العادل کے اندر شمار کیا گیا ہے۔

بعض علما نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی کے ماتحت کوئی نہیں ہے، وہ تن تنہا ہے، لیکن اس کو اللہ تعالیٰ نے جو جسم دیا ہے، اس کے اعضاء: آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں دل، دماغ وغیرہ پر اس کا کنٹرول ہے، ان کو اگر صحیح طریقہ سے چلایا ہے، ان کا حق ادا کیا ہے تو الإمام العادل میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہم سب کے لیے مسئلہ آسان ہو گیا۔ ہم بھی اگر عرش کے سایہ میں آنا چاہتے ہیں تو اس پہلی قسم ہی میں شامل ہو سکتے ہیں۔

بچ جائے جوانی میں جو دنیا کی ہوا سے:

(۲) شاب نشأ في عبادة ربه (وہ نوجوان جس نے اللہ کی عبادت اور اطاعت میں اپنی عمر بتائی)۔

ماں باپ کو چاہیے کہ بچپن سے اپنی اولاد کو نیکی کی ایسی تربیت دیں، کہ وہ جب جوان ہو تو اس کی جوانی شاب نشأ فی عبادة اللہ کا نمونہ ہو۔ ماں باپ یوں سوچیں کہ ہمیں تو یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی، ہم نے غفلت سے کام لیا، جوانی میں گناہوں کا ارتکاب کیا، غلط کام بھی کیے؛ لیکن ہم اپنی اولاد کی بہترین تربیت کر کے، ان کو ایسا نوجوان بنا سکتے ہیں جس

کی اٹھان اور پروان اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہو۔کون نہیں چاہے گا کہ میری اولاد اللہ کے سایے میں جگہ نہ پاوے؟ ہر ایک چاہتا ہے۔تو اس کے لیے محنت کرو، آسانی سے یہ کام کر سکتے ہیں، اپنی اولاد کو اس زمرے میں شامل کر سکتے ہیں۔

ہر وقت مسجد میں......:

(۳)ورجل قلبه معلق في المساجد (وہ آدمی جس کا دل مسجدوں میں اٹکا ہوا ہے، لٹکا ہوا ہے)

فجر کی نماز پڑھ کر گیا اور دل میں ہے کہ کب ظہر کا وقت ہو، اذان ہو، اور میں مسجد جاؤں اور ظہر کی نماز با جماعت ادا کروں۔ظہر پڑھ کر دکان گیا؛ لیکن دل مسجد میں لگا ہوا ہے، کب عصر کی اذان کا وقت ہو اور میں مسجد جاؤں، عصر کی نماز با جماعت ادا کروں۔گویا پانچوں نمازوں کا ایسا اہتمام کہ ایک نماز پڑھنے کے بعد دوسری نماز کی طرف اس کا دل لگا ہوا ہے، اٹکا ہوا ہے۔تو یہ آدمی بھی قیامت کے روز اللہ کے سایے میں ہوگا۔یہ کام بھی ہم کر سکتے ہیں۔ہمارے لیے مشکل نہیں ہے۔

ہمارا معاملہ الٹا ہوگیا، مسجد میں آتے ہیں تب بھی ہمارا دل دکان اور گھر میں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔نہیں، نہیں! اب مزاج کو بدلو، اس کو صحیح رخ پر لاؤ اور گھر پر ہوں، دکان پر، ہمارا دل مسجد میں اٹکا رہے، ایسا بناؤ۔محنت کریں گے تو یہ چیز بھی مل جائے گی۔

تحابا في الله...:

(۴)رجلان تحابا في الله اجتمعا عليه و تفرقا عليه (دو اللہ کے ایسے بندے

جنھوں نے اللہ کے واسطے آپس میں محبت کی، اپنی کسی غرض یا مقصد حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ اِس وقت آپ تمام حضرات اس مجلس میں تشریف فرما ہیں، یہاں کیوں آئے ہیں؟ مجھ سے آپ کو کوئی مفاد ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے؟ میں پیسے بانٹ رہا ہوں؟ یا یہاں آنے کی وجہ سے آپ کو کوئی عہدہ ملنے والا ہے؟ نہیں! جو تعلق آپ نے میرے ساتھ قائم کیا ہے وہ محض اللہ کی نسبت پر ہے، اور میں بھی جو آپ کے ساتھ اِس وقت بات کر رہا ہوں یہ تحابا في الله ہے۔ ہر وہ کام جس میں اللہ کے دو بندے اللہ کی نسبت پر آپس میں ملیں، وہ تحابا في الله ہے۔ دعوت وتبلیغ کے ساتھی آپس میں اللہ کے کام ہی کے لیے ملتے ہیں، اسی پر جدا ہوتے ہیں، دین کا علم حاصل کرنے والا شاگرد اور دین کا علم دینے والا استاذ، ان کے آپس کے تعلق بھی اللہ کے واسطے ہیں، کوئی دنیوی غرض نہیں ہے۔

بلکہ ایسے لوگوں کے متعلق حدیث میں تو یہاں تک ہے کہ وہ لوگ قیامت کے روز عرش کے نیچے نور کے منبروں پر ہوں گے، ان کو دیکھ کر انبیا وشہدا بھی ان پر رشک کریں گے، حالاں کہ انبیا وشہدا کا مقام تو بہت اونچا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی عزت افزائی اور اعزاز واکرام کو دیکھ کر انبیا، شہدا اور صدیقین بھی رشک کریں گے۔[۱]

خوشا ذوقِ مستی ز دل دادگاں:

(۵) ورجل طلبته امرأة ذات منصب وجمال فقال: إني أخاف الله (اور وہ آدمی جس کو کسی اونچے مقام والی اور حسین وجمیل عورت، زنا کی دعوت دے، شہوت پوری کرنے کی دعوت دے، اور وہ کہہ دے کہ مجھے اللہ کا خوف ہے)۔

---

(۱) مسند أحمد: ۲۲۷۸۲ (ط: مؤسسة الرسالة).

دیکھیے! جو آبرو باختہ اور بازاری عورتیں ہوتی ہیں، وہ تو ساری دنیا کو دعوت دیتی ہی ہیں؛ لیکن یہ بازاری عورت نہیں ہے، شریف اور اونچے گھرانے کی عورت ہے، اور وہ بھی حسین وجمیل۔ وہ اس کو اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے دعوت دے رہی ہے، اور اس کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ إني أخاف الله (مجھے اللہ کا ڈر ہے) جوانوں کے لیے کتنا آسان ہے! اپنی شہوت پر کنٹرول کریں، کل کو اللہ کے سایے کے حقدار بن جائیں گے۔ عفت و عصمت اور پاکدامنی کا مسئلہ اس زمانے میں بڑا مشکل ہوتا جا رہا ہے، ایسے زمانے میں جو جتنا زیادہ اہتمام کرے گا اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو اپنے سایے میں جگہ عطا فرمائیں گے۔

بائیں ہاتھ کو بھی معلوم نہ ہو:

(۶) ورجل تصدق، أخفى حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه (وہ آدمی جو چپکے سے اللہ کے راستے میں خیرات کرتا ہے، صدقہ دیتا ہے۔ اور اتنا چھپا کر کہ اس کا دایاں ہاتھ کیا دے رہا ہے؟ بائیں ہاتھ کو بھی پتا نہیں چلتا)۔

خوشا لذتِ دردِ اصحابِ عشق:

(۷) ورجل ذكر الله خالياً ففاضت عيناه (اور وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا، اللہ کی محبت میں یا اللہ کے خوف سے اس کی آنکھیں بھر آئیں) آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ اگر آدمی کے دل میں اللہ کی محبت ہوتی ہے تو کبھی تنہائی میں بیٹھ کر یہ خیال کرتا ہے کہ ہائے! میں نے اللہ کا حق ادا نہیں کیا، یہ سوچ کر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے خوف سے بھی اور اللہ کی محبت سے بھی۔ تو ایسے آدمی کو بھی اللہ تعالیٰ میدان حشر میں اپنے سایہ میں جگہ عطا فرمائیں گے۔

ہم کون سے گروپ میں......؟؟؟:

چناں چہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: لَا يَحۡزُنُهُمُ الۡفَزَعُ الۡاَكۡبَرُ وَ تَتَلَقّٰهُمُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ (الانبیاء: ۱۰۳) (بڑی گھبراہٹ جو میدان حشر کی ہے وہ ان کو غم میں نہیں ڈالے گی؛ بلکہ فرشتے ان کا استقبال اور ویل کم (WELCOME) کریں گے) اب فیصلہ کرلو! ہم کون سے گروپ میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟ ہر ایک اپنے دل سے پوچھ لے۔ یہ دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، یہاں خدا نہ کرے اگر ہم نے نفس پرستی، شیطان کی پیروی کا کام کیا تو پھر وہاں مصیبت ہی مصیبت ہے۔ چند روز اپنے آپ پر کنٹرول کر لینے، اللہ کی فرماں برداری والی زندگی گزار لینے سے وہاں ہمیشہ ہمیش کے لیے آرام ملے گا۔ لہٰذا اب ہمیں فیصلہ لینا ہے کہ ہم کون سی ٹولی میں جانا چاہتے ہیں؟ کیا وہ لوگ جو سر کے بل گھسٹ کر لے جائے جائیں گے؟ یا جن کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سایے میں جگہ دیں گے، ان میں شامل ہونا ہے؟ یا جن کے میدان حشر میں جانے کے لیے اللہ تعالیٰ سواریاں مہیا فرمائیں گے، ان میں شامل ہونا ہے؟ اگر اِن لوگوں میں شامل ہونا ہے تو اس کے لیے جو کام کرنے ہیں، ان میں اپنے آپ کو لگانے کی ضرورت ہے۔

ذرہ کے معنیٰ:

اب آخری دو آیتوں کو حضور اکرم ﷺ نے الاية الفاذة الجامعة سے تعبیر فرمایا ہے۔[۱] باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میدان حشر میں پہنچیں گے تو کسی آدمی نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی، جس کی کوئی حیثیت نہیں، چھوٹی سی نیکی کی ہوگی، وہ بھی دیکھ لے گا۔

---

(۱) صحيح البخاري: ۲۳۷۱، ۲۸۶۰، ۳۶۴۶، ۴۹۶۲، ۴۹۶۳، ۷۳۵۶.

ذرۃ عربی زبان میں دو چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے:

(۱) بسا اوقات کھڑکی کے چھوٹے سے سوراخ سے سورج کی دھوپ گھر میں آتی ہے، اس دوران روشنی میں ہمیں کچھ اڑتا ہوا نظر آتا ہے، اس کو ذرہ کہتے ہیں۔

(۲) پیلے رنگ کی چھوٹی چیونٹی کو بھی ذرہ کہتے ہیں۔

ایک آدمی نے روٹی کا ایک ٹکڑا لے کر اس کو ترازو میں تولا، پھر اس کو رکھ دیا۔ تو اس پر بے شمار چیونٹیاں لپٹ گئیں، پھر اس کے ساتھ تولا، تو اس آدمی کو پہلی مرتبہ اور اس دوسری مرتبہ کے تولنے میں ذرہ برابر بھی فرق محسوس نہیں ہوا۔ اگرچہ آج تو ایسے آلات نکلے ہیں کہ کچھ فرق کیا جا سکتا ہے؛ لیکن کہنے کا حاصل یہ ہے کہ بالکل معمولی، جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ لہٰذا چھوٹی سی نیکی کی ہوگی، وہ بھی دیکھ لے گا۔

لیروْا اعْمالھم کے معنیٰ:

دیکھ لینے کا مطلب وہی ہے جو بتلایا گیا تھا، یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو اعمال کی لسٹ دی جائے گی، بالغ ہونے کے بعد سے موت تک جتنے بھی اعمال کیے تھے وہ اس لسٹ میں موجود ہوں گے۔ چھوٹی سی نیکی بھی چھوٹی ہوئی نہ ہوگی۔ ہم تو کہیں کچھ چیزیں جمع کرتے ہیں، تو چھوٹی چیزیں چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کو ابھی رہنے دو؛ لیکن قیامت کے روز جو فہرست اور اعمال نامہ ہمیں دیا جائے گا، اس میں ذرہ کے برابر نیکی بھی لکھی ہوئی ہوگی، اور چھوٹی سے چھوٹی برائی اور گناہ بھی نظر آئے گا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس کا انجام دیکھ لے گا۔ یعنی چھوٹی نیکی کی ہوگی اس کو بھی اللہ تعالیٰ ضائع اور برباد نہیں ہونے دیں گے، اللہ اس کا بھی بدلہ اچھی شکل میں عطا فرمائیں گے۔ اور چھوٹی سے

چھوٹی برائی یا گناہ بھی چھپنے والا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس پر بھی سزا دیں گے۔

ایک منفرد اور جامع آیت:

بخاری شریف (کتاب الزکوٰۃ) میں روایت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الاية الفاذة الجامعة (ایک ایسی آیت جو منفرد اور جامع ہے)[1] جامع اس لیے کہا کہ اس نے انسانی زندگی کا کوئی عمل نہیں چھوڑا، اچھا ہو یا برا ہو، اللہ اس کو بدلہ دے گا۔ اور منفرد اس لیے کہا کہ جو آدمی بھی اس آیت کو اپنی زندگی میں ہمیشہ پیش نظر رکھے گا، وہ اپنی زندگی کو صرف ایک جملے کی وجہ سے سنوار سکتا ہے۔ ہمیشہ آپ یہ سوچتے رہیے کہ میں ذرا سا بھی نیکی کا کام کروں گا تو اس کا اچھا بدلہ اللہ کے یہاں ملنے والا ہے، ذرا سا بھی گناہ کا کام کروں گا تو اس کی سزا اللہ کے یہاں ملنے والی ہے۔ تو اس مضمون کو ذہن نشین کر لینے سے ہماری زندگیوں میں انقلاب آجائے گا۔ یہ باتیں ہر وقت مستحضر رہنی چاہییے۔

كفى بنفسك اليوم....:

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ‎اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (بنی اسرائیل: ۱۳، ۱۴) قیامت کے دن ہم ایک ایسا دفتر، رجسٹر، کتاب اس کے سامنے رکھ دیں گے جو بالکل کھلم کھلا ہو گی، اس کتاب کو پیش کرتے ہوئے اس سے کہا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ دیکھ لو، پڑھ لو، اور خود ہی فیصلہ کر لو) اس کو ہر انسان پڑھ لے گا، چاہے دنیا میں اس نے پڑھنا لکھنا سیکھا ہو یا نہ سیکھا ہو۔ کسی کو بتلانے کی ضرورت نہیں، تمہارے گناہ بھی تمہارے سامنے ہیں اور تمہاری نیکیاں بھی

---

(۱) صحيح البخاري: ۲۳۷۱، ۲۸۶۰، ۳۶۴۶، ۴۹۶۲، ۴۹۶۳، ۷۳۵۶۔

تمہارے سامنے ہیں۔اپنے متعلق تم آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہو کہ اس وقت تم انعام کے حق دار ہو یا سزا کے۔اپنا حساب وکتاب لینے کے لیے تمہاری ذات کافی ہے۔

میزانِ عدل:

قرآن میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا(الانبیاء:۴۷) (قیامت کے روز ہم انصاف کی ترازوئیں قائم کریں گے کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں ہوگا) جو نیکی کی ہوگی وہ بھی سامنے آئے گی،اس کا بھی وہ انجام دیکھ لے گا،اس کا بھی بدلہ دیا جائے گا۔جو گناہ کیا ہوگا وہ بھی سامنے آئے گا،اس کا بھی وہ انجام دیکھ لے گا،اس کی سزا اس کو دی جائے گی۔

معمولی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو......!!!:

بہر حال !اس آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ بھائی!اگر اللہ نے تمہیں کسی نیکی کا موقع دیا ہے- چاہے چھوٹی اور معمولی سی نیکی کیوں نہ ہو-تو اس کو کر گزرو۔یہ مت سوچو کہ یہ چھوٹی سی نیکی ہے اس کو کیا کریں؟معمولی سا کام ہے۔معمولی سمجھ کر چھوڑو مت۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:لا تحقرن من المعروف شيئا. (کسی بھی نیکی کے کام کو چھوٹا مت سمجھو)[۱] چلتے چلتے کانٹا پڑا ہوا دیکھا،دل میں خیال آیا کہ میں اس کو ہٹادوں؛تاکہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔تو یہ مت سوچنا کہ یہ تو معمولی سا کام ہے،اس کو کیا کرنا؟نہیں!اس کو کرلو!۔اللہ تعالیٰ اگر نیکی کے کام کا موقع دے،تو اس وقت آدمی کو ذرہ برابر بھی پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔پتا نہیں اس نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بیڑا پار کردے۔

---

(۱)مسند أحمد:۱۵۹۹۵،۲۰۶۳۳،۲۰۶۳۵،۲۱۵۱۹ومسند البزار:۳۹۶۲وصحيح مسلم:۱۴۴-۲۶۲۶وغيرها.

کتے کو پانی پلانے پر مغفرت:

آپ نے گذشتہ اسباق میں سنا تھا کہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک آدمی جنگل سے جا رہا تھا، اس کو پیاس لگی، وہاں ایک کچا کنواں تھا، جس کی منڈیر بنی ہوئی نہیں تھی۔ اس کی دیواروں پر خانے بنے ہوئے تھے، اس نے اندر اتر کر اپنی پیاس بجھائی۔ پھر باہر آ کر دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ ابھی پیاس کی جس شدت سے مجھے واسطہ پڑا تھا، اور میں تکلیف محسوس کر رہا تھا، یہ کتا بھی اُسی پیاس کی شدت سے دوچار ہے۔ چناں چہ اس نے دل میں سوچا کہ میں اس کو پانی پلا دوں۔ پیر میں چمڑے کا موزہ تھا، اس کو نکالا، کنویں میں اتر کر اس میں پانی بھرا، دانتوں میں دبا کر باہر آیا، اس کتے کو پانی پلایا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔[۱]

چو روئے پرستید نت در خداست:

دیکھو! اللہ تعالیٰ کے ہاں عمل کا سائز نہیں دیکھا جاتا کہ عمل بڑا ہے یا چھوٹا ہے؟ بلکہ اخلاص دیکھا جاتا ہے۔ جو خالص اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے ہو، للّٰہیت سے کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر فیصلے ہوتے ہیں۔ دیکھیے! ویسے اللہ تعالیٰ کے ہاں قانون تو وہی ہے کہ جس کی نیکیاں گناہوں پر غالب ہوں گی اس کے لیے جنت کا، کامیابی کا فیصلہ۔ اور جس کے گناہ غالب ہوں گے اس کے لیے جہنم کا فیصلہ؛ لیکن اس سے ہٹ کر يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ۔ (الفتح:۱۴) (جس کو چاہیں معاف کر دیں اور جس کو چاہیں عذاب دیں)۔

---

(۱) صحيح البخاري: ۱۷۳، ۲۵۲، ۲۳۶۳، ۲۴۶۶، ۲۴۷۲، ۶۰۰۹۔

یہ سب شیطانی دھوکے ہیں:

یہ حضور ﷺ نے ہمیں لا تحقرن من المعروف شیئا[۱] کے ذریعے تاکید اس لیے فرمائی کہ یہ دراصل شیطان کا ایک بہت بڑا ہتھیار ہے، جو نبی کریم ﷺ نے اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ہوتا کیا ہے؟ ایک آدمی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، کبھی کوئی نیکی کا موقع آتا ہے اور نیک کام کرنے کو جی چاہتا ہے، تو شیطان اس کو پھنساتا ہے کہ تیری زندگی تو ساری گناہوں میں گزری، اس ایک نیکی سے تیرا کیا بھلا ہونے والا ہے؟ ایک چنا کیا پھاڑ کو پھوڑے گا؟

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مؤمن	آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

یا جیسے کہتے ہیں کہ "سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی"۔ یہ سب شیطانی دھوکے ہیں۔ شیطان ہم کو اس طرح نیک عمل کرنے سے روکتا ہے۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ نہیں! اس طرح کا کوئی بھی نیک عمل - چاہے وہ معمولی نظر آتا ہو - لیکن اس کو کر لو۔ قیامت کے دن اس کا بدلہ تم کو ملے گا، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر ہماری مغفرت کر دے، نجات دے دے۔ ایک مؤمن اسی پر تو زندگی گزارتا ہے۔ اس لیے اس طرح کا مزاج بنانا چاہیے۔

نیکی نہ چھوڑو، گناہ نہ چھیڑو:

اور کسی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر مت کرو۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ کسی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑو مت، اور کسی گناہ اور برائی کو چھوٹا سمجھ کر کرو مت۔ لوگ کیا پوچھتے ہیں: مولانا! یہ ناجائز ہے یا حرام ہے؟ مطلب ان کا یہ ہوتا ہے کہ حرام کہیں تو ہم بچ جائیں، ناجائز ہے تو کچھ کر لیں۔ شیطان کبھی کہتا ہے نا! چھوٹا سا گناہ ہے، کر لونا!!! کیا نقصان ہونے والا ہے؟

---

(۱) مسند أحمد: ۱۵۹۹۵، ۲۰۶۳۳، ۲۰۶۳۵، ۲۱۵۱۹ ومسند البزار: ۳۹۶۲ وصحیح مسلم: ۱۴۴-۲۶۲۶ وغیرها.

حکیم الامت کا حکیمانہ جواب:

حضرت تھانویؒ سے ایک آدمی نے کہا کہ بدنگاہی صغیرہ ہے یا کبیرہ ہے؟ حضرت تھانویؒ نے جواب میں لکھا کہ چنگاری آگ لگانے کے لیے کافی ہے، چاہے بڑی ہو یا چھوٹی ہو۔ ہمارے ایمان کو تباہ کرنے کے لیے گناہ کافی ہے، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔

ناجائز وحرام میں فرق:

فقہا نے یہ ناجائز اور حرام کی تفصیلات تو عقیدے کے اعتبار سے لکھی ہیں۔

جس گناہ کا ثبوت دلیل قطعی سے ہو اس کو حرام کہتے ہیں۔

جس گناہ کا ثبوت دلیل قطعی سے نہ ہو اس کو ناجائز کہتے ہیں۔

ورنہ عمل کے اعتبار سے حرام سے بھی بچنا ضروری ہے، اور ناجائز سے بھی بچنا ضروری ہے۔ شیطان ہمیں دھوکہ دیتا ہے کہ چھوٹا سا گناہ ہے کرلو، اس دھوکے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال! برائی، برائی ہے، چاہے چھوٹی ہو۔ اور بھلائی، بھلائی ہے، چاہے چھوٹی ہو۔

سچے دل سے توبہ کرلی تو......:

یہ تو قدرت کا قانون اور ضابطہ بتلا دیا: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ بھی دیکھ لے گا، اور ذرہ برابر گناہ اور برائی کی ہوگی وہ بھی دیکھ لے گا) اعمال نامہ میں بھی دیکھ لے گا اور انجام میں بھی دیکھ لے گا لیکن یہاں اللہ کا ایک معاملہ رحمت کا بھی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آدمی نے اگر کوئی گناہ کیا اور اس گناہ سے چھ یا سات ساعتوں میں سچے دل سے توبہ کرلی، تو اللہ

تبارک وتعالیٰ اس کے اس گناہ کو اعمال نامے سے بھی نکال دیتے ہیں۔کل قیامت میں جو لسٹ ملے گی اس میں وہ گناہ نہیں ہوگا۔[1]

چار گواہ:

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے، تو اس کے گناہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے چار گواہ ہوتے ہیں۔

(۱) زمین کا وہ حصہ جس پر گناہ کیا گیا۔يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا (الزلزال:۴)

(۲) اس کے اعضاء۔اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (یس:۶۵) (قیامت کے روز ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے، ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے، ان کے پاؤں گواہی دیں گے ان کرتوتوں کی جو وہ کرتے تھے)۔

(۳) نامۂ اعمال۔وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (التکویر:۱۰)

(۴) وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعمال لکھنے پر مقرر کیے ہیں۔كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (الانفطار:۱۱)

کیا شانِ رحمت ہے......!!!:

ایک حدیث ہے جس کو حضرت تھانویؒ نے التشرف في أحاديث التصوف میں ذکر فرمایا ہے کہ: إذا تاب العبد أنسى الله الحفظة ذنوبه (جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اس کے گناہ بھلا دیتے ہیں) فرشتے قیامت کے روز گواہی نہیں دے سکیں گے۔ وأنسىٰ ذلك جوارحه (اور اس کے اعضاء کو بھی اللہ تعالیٰ بھلا دیتے ہیں)۔حضرت تھانویؒ

---

(۱) المعجم الكبير للطبراني: ۷۷۶۵.

فرماتے ہیں کہ بھلانے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے۔یعنی یہ کام اللہ تعالیٰ براہ راست کریں گے،فرشتوں سے بھی نہیں کہ فرشتے طعنہ دیں۔دنیا کا دستور تو یہ ہے کہ کسی کو معاف بھی کردیا جائے،تب بھی اس کی فائل تو محفوظ رکھی جاتی ہے،فائل ختم نہیں کی جاتی؛ لیکن اللہ کے ہاں ایسا نہیں ہے۔اللہ کو کس کی پرواہ ہے؟ جب معاف کردیں گے،تو ساری نشانیاں بھی مٹادی جائیں گی۔ومعالمه من الأرض (اور جس زمین پر گناہ کیا تھا اس نے دیکھا اور نوٹ کیا تھا،اس کو بھی اللہ تعالیٰ بھلادیں گے) حتیٰ یلقی اللہ ولیس علیه شاهد من اللہ بذنب (یہاں تک کہ اللہ سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اس کے گناہ پر کوئی گواہ نہیں ہوگا)[۱]۔کیا شان ہے اللہ کی رحمت کی!!!

توبہ؛ دومنٹ کا کام:

اور توبہ کوئی مشکل کام ہے؟ کیا اس کے لیے ہمیں کوئی قربانی دینی پڑتی ہے؟ ہمیں اس کا کچھ کفارہ دینا پڑتا ہے؟ کتنا آسان کام ہے کہ جو کچھ گناہ ہوئے اس پر دل سے ندامت ہو،ایک درد ہے کہ ہائے! میں نے کس ذات کی نافرمانی کی؟ اور آئندہ کے لیے نہ کرنے کا عزم ہو کہ آئندہ کبھی نہیں کرنا ہے۔بعض کہتے ہیں کہ آئندہ ہوگا تو؟ بھائی! اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ آئندہ ہوگا،تو تمہاری یہ توبہ ختم ہوجائے گی۔دوبارہ توبہ کرلیں۔آئندہ ہوگا، اس بنیاد پر آپ اپنی توبہ میں شک وشبہ نہ کریں۔جس وقت توبہ کریں،تو پورے یقین کے ساتھ کریں کہ مجھے اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرنا ہے،چاہے میں مرجاؤں۔پھر ہماری کمزوری کی وجہ سے ہوجائے تو بات دوسری ہے؛لیکن اس کی وجہ سے اس توبہ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

---

(۱) تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱۴/۱۷۔

اس توبہ سے جو گناہ معاف ہوا، وہ ہوا۔ ہم اس مجلس میں بیٹھے بیٹھے پوری زندگی کے گناہ کو بخشوا سکتے ہیں۔ دو منٹ کا کام ہے، اللہ کی طرف دھیان کرلو۔ ابھی تو گناہ کا ارتکاب نہیں کر رہے ہیں، شرابی ابھی تو شراب نہیں پی رہا ہے! زانی ابھی تو زنا نہیں کر رہا ہے! سودخور ابھی تو سود نہیں کھا رہا ہے! ابھی ہم گناہ سے بچے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دل میں ندامت بھی ہے، اور آئندہ نہ کرنے کا عزم بھی ہے۔ بس! اللہ سے گناہوں کی توبہ ہو جائے گی۔ اور جو حقوق ہیں ان کو بعد میں ادا کر دو۔ کتنا آسان ہے!!! لیکن شیطان آدمی کو توبہ نہیں کرنے دیتا۔ بھائی! حشر کا معاملہ بڑا سنگین ہے، وہاں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکے گا۔

اللہ مجھے اور آپ کو بچائے، اور اس دن کی ہولناکی سے میری اور آپ کی حفاظت فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العٰلمین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ بینہ

(مؤرخہ ۱۹ رشوال المکرم ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۲ رجون ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾ وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ؕ﴿۴﴾ وَ مَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ۬ۙ حُنَفَآءَ وَ یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ ؕ﴿۵﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ ؕ﴿۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ ؕ﴿۷﴾ جَزَآؤُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ ﴿۸﴾

سورت کے مختلف نام:

یہ سورۂ بینہ ہے۔اس سورت کے کئی نام ہیں۔حدیث شریف میں اس کو لم یکن الذین کفروا سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔مفسرین نے اس کا ایک نام سورۂ قیمة بھی بتلایا ہے۔صاحب روح المعانی نے اس کا ذکر کیا ہے۔اس میں لفظ بریة آیا ہے، خیر البریة اور شر البریة، لہٰذا اس کو سورۂ بریة بھی کہا گیا ہے۔سورۂ منفکین سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔اور بھی کئی نام ہیں؛ لیکن مشہور نام سورۂ بینہ ہے۔

بینہ کے معنیٰ:

عربی زبان میں بینہ واضح اور صاف چیز کو کہتے ہیں۔چاہے وہ دلیل ہو یا کچھ اور۔

واضح حکم کو بھی بینہ کہتے ہیں۔

واضح دلیل کو بھی بینہ کہتے ہیں۔

واضح قانون کو بھی بینہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

واضح احکام کو بھی بینہ کہتے ہیں۔قرآن میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَ الۡهُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ اُولٰٓئِكَ یَلۡعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ(البقرة:۱۵۹) (ہم نے قرآن میں جو واضح احکام اتارے، اس کو جو لوگ چھپاتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہے) یہاں شریعت میں قرآن کے ذریعے جو واضح احکام دیے گئے ان کو "بینة" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرات انبیاء کو جو معجزات دیے جاتے ہیں ان کو بھی "بینات" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔حضرت موسیٰ جب دنیا میں تشریف لائے تو فرمایا: قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِبَیِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ

(الاعراف:۱۰۵) (اے لوگو! میں تمہارے پاس واضح نشان لے کر آیا ہوں) یہاں بھی بینات سے مراد معجزہ ہے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو عطا فرمایا تھا۔

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا: قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الاعراف:۷۳) (یہ اونٹنی تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح نشانی ہے، جو تمہارے رب کے پاس سے آئی ہے) یہاں بھی معجزہ کے لیے لفظ "بینة" استعمال کیا گیا ہے۔

لیکن اس سورت کی پہلی آیت میں حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ کا مصداق کون ہے؟ اس کو آگے اللہ تعالیٰ نے خود رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً سے واضح فرمایا ہے۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر......:

اس سورت کی فضیلت کے سلسلے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری شریف میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اُبَی بن کعب رضی اللہ عنہ جن کو بارگاہ رسالت سے اقرأهم أُبَیّ (صحابہ رضی اللہ عنہم میں علم قراءت میں سب سے زیادہ ماہر حضرت اُبَی بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں) کا لقب ملا ہوا تھا۔ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: إن الله أمرني أن أقرأ عليك القرآن (مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے سامنے قرآن کی تلاوت کروں) قال أُبَيّ: آللہ سمّاني لک؟ (حضرت اُبَی رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: کیا اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے سامنے میرا نام لے کر یہ فرمایا؟)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں کہ مجھے اللہ نے یہ حکم دیا ہے، پھر سوال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہو کہ آپ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی

ایک کے سامنے قرآن کی یا اس سورت کی تلاوت کیجیے، حضرت اُبَیؓ کا نام اللہ کی طرف سے نہ لیا گیا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنے طور پر حضرت اُبَیؓ کو سنانا تجویز کیا ہو۔ اور اس میں بھی ان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ چاہے اللہ کی طرف سے ان کی تعیین نہ ہوئی؛ لیکن خود نبی کریم ﷺ نے اپنی طرف سے تجویز کیا، یہ بھی ان کی فضیلت کے لیے بہت بڑی چیز تھی۔ لیکن حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: إن الله أمرني (مجھے اللہ نے حکم دیا) اس سے بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام لیا گیا ہوگا، اس لیے انہوں نے بات کو مزید پختہ کرنے کے لیے سوال کیا کہ اٰللہ سمّاني لک؟ (اے اللہ کے رسول! کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے میرا نام لے کر آپ کو یہ حکم دیا؟) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نعم! الله سمّاك لي (جی! اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کا نام لے کر یہ حکم دیا) حضرت انسؓ فرماتے ہیں: فجعل أُبَيّ يبكي (حضرت اُبَیؓ یہ جواب سن کر رونے لگے)[1] یہ رونا جیسا کہ شراح نے لکھا ہے خوشی کا رونا تھا۔

ع ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بخاری شریف ہی کی ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں: إن الله أمرني أن أقرأ عليك لم يكن الذين كفروا من أهل الكتب (مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے سامنے سورۂ لم يكن الذين كفروا من اهل الكتب پڑھوں)[2] دیکھو! اس حدیث میں اس سورت کو لم يكن الذين كفروا من اهل الكتب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري: ۴۹۶۰.

(۲) صحيح البخاري: ۳۸۰۹، ۴۹۵۹، ۴۹۶۰.

......تو وہ دوسری مانگے گا:

مسند احمد اور ترمذی شریف میں حضرت اُبَی بن کعبؓ سے یہ واقعہ ان الفاظ میں منقول ہے: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إن الله أمرني أن أقرأ عليك القرآن قال: فقرأ: لم يكن الذين كفروا من أهل الكتاب، قال: فقرأ فيها: ولو أن ابن آدم سأل وادياً من مال فأعطيه، لسأل ثانياً ولو سأل ثانياً فأعطيه، لسأل ثالثاً، ولا يملأ جوف ابن آدم إلا التراب، ويتوب الله على من تاب.

(نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں تمہیں قرآن پڑھ کر سناؤں، چناں چہ نبی کریم ﷺ نے سورۂ لم يكن الذين كفروا پڑھ کر سنائی۔ اور اسی سورت میں آپ ﷺ نے یہ بھی پڑھا، باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر انسان مجھ سے مال کی پوری ایک وادی مانگے اور میں اس کو دے بھی دوں، تو وہ دوسری مانگے گا۔ دوسری دے دوں تو وہ تیسری مانگے گا۔ انسان کے پیٹ کو قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے، اور جو آدمی اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہے تو اللہ اس کی طرف توجہ فرماتے ہیں)۔[۱]

ہوسکتا ہے کہ پہلے یہ عبارت اس سورت کے جز کے طور پر اتاری گئی ہو، بعد میں اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی ہو۔ تو حاصل یہ ہوا کہ اس سورت کی اہمیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حکم دیا کہ حضرت اُبَیؓ کے سامنے اس کی تلاوت کریں)۔

ظہورِ قدسی؛ ایک معجزہ:

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ

---

(۱) مسند أحمد: ۲۱۲۰۲، ۲۱۲۰۳، سنن الترمذي: ۳۸۹۸.

الْبَيِّنَةُ (مشرکین اور اہل کتاب میں سے جو لوگ کافر تھے وہ اُس وقت تک باز آنے والے نہیں تھے جب تک ان کے پاس روشن دلیل نہ آتی)۔

یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی بعثت کی وجہ بتائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو تمام حضرات انبیاءؑ کا سردار بنایا۔ آپ ﷺ سید الانبیاء ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو سب سے پہلے کیوں نہیں بھیجا؟ بیچ میں کیوں نہیں بھیجا؟ آخر میں کیوں بھیجا؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت جس زمانے میں ہوئی اُس زمانے میں روئے زمین پر مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ موجود تھے: اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ، صابئین کو بھی بعض نے اہل کتاب میں شمار کیا ہے۔ مشرکین یعنی کفار و مجوسی (آتش پرست)۔ گویا مختلف مذاہب کے ماننے والے روئے زمین پر موجود تھے۔ بالخصوص اُس زمانے کی بڑی سلطنتیں یعنی روم کی سلطنت (ان کا حکومتی مذہب عیسائیت تھا) اور اہل فارس کی حکومت (ان کا حکومتی مذہب مجوسیت تھا)۔ ان مختلف مذاہب کے لوگوں میں جو خرابیاں اور گمراہیاں گھر کر گئی تھیں، عقائد کے اعتبار سے، اخلاق کے اعتبار سے، عبادات کے اعتبار سے، معاملات کے اعتبار سے، معاشرت کے اعتبار سے، وہ سب ایسی مختلف الانواع برائیوں میں مبتلا تھے کہ ان کو اِن برائیوں سے ہٹانے کے لیے کسی عظیم الشان، رفیع القدر شخصیت کی ضرورت تھی، جن کا اپنا وجود بھی اللہ کے ایک معجزے کی حیثیت رکھتا ہو۔ گویا نبی کریم ﷺ کی بعثت بھی ایک نوع کا معجزہ ہی ہے۔

اسی لیے فرمایا: حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ۔ یہ لوگ اپنے دین اور اپنی خرابیوں، برائیوں سے ہٹنے والے نہیں تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس واضح اور روشن دلیل آجائے۔

حضور اکرم ﷺ کے وجودِ بابرکات کو اللہ تعالیٰ نے لفظ "بینة" سے تعبیر کیا۔ گویا آپ اپنی علوشان رفعتِ قدر و منزلت کے پیشِ نظر اپنی ذات میں خود ایک معجزہ ہیں۔

روشن دلیل کیا ہے......؟؟؟:

آگے اَلْبَيِّنَةُ کا بدل آیا، اس کی وضاحت کر رہے ہیں کہ روشن دلیل کیا؟ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً، وہ روشن دلیل یعنی اللہ کا ایک رسول جو پاکیزہ صحیفے پڑھ کر لوگوں کو سنائے۔

صُحُفًا مُّطَهَّرَةً: ویسے تو قرآن ایک کتاب ہے؛ لیکن قرآن میں مختلف سورتیں ہیں، تو ہر سورت کو ایک صحیفے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی لیے صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فرمایا۔ (وہ رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے) فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (جن میں سیدھی سچی تحریریں لکھی ہوئی ہوں) یا جن میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے مضبوط احکام ہوں۔ یعنی اس قرآن میں اللہ کے وہ مضبوط احکام ہیں جو اللہ نے ان ہی صحیفوں میں دیے ہیں۔ اسے پڑھ کر سنائیں۔

کتاب اللہ اور رجال اللہ:

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ

دیکھیے! اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس بات کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب نازل فرمائی اس کے عملی نمونے کے طور پر نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات کو مبعوث فرمایا۔ یہ بھی قدرت کا ایک سلسلہ ہے کہ اللہ کی طرف سے کہ کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ بھی ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ صرف کتاب نازل نہیں فرماتے؛ بلکہ اپنے ایک نبی کو بھی بھیجتے ہیں، وہ نبی کی شخصیت اس کتاب کا عملی نمونہ ہوتی ہے۔ اس کتاب

میں جو چیزیں علمی انداز میں ہوتی ہیں، نبی کی ذات میں وہ عملی انداز میں ہوتی ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ تو جواب میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا: کان خُلُقه القرآن (آپ کے اخلاق قرآن ہیں)[۱] یعنی جو چیز قرآن میں علمی حیثیت سے ہے، وہی آپ ﷺ کی ذات بابرکات میں عملی طور پر موجود تھی۔ اور انسان کی خاصیت ہے کہ وہ دیکھ کر ہی سیکھتا ہے۔

......تب تک تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی:

حضرت شاہ عبد القادر جیلانیؒ کا مقولہ بعض مفسرین نے نقل کیا ہے: إن الرجل لا یفلح إلا إذا رأی المفلحین، من لم یر مفلحاً لا یفلح (آدمی جب تک کامیاب لوگوں کو نہیں دیکھتا وہ کامیابی حاصل نہیں کرتا۔ جو آدمی کسی کامیاب شخصیت کو نہ دیکھے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا)[۲]۔ انسان کا مزاج ہی اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ وہ اچھے لوگوں کو دیکھ کر اچھائی اختیار کرتا ہے۔ کوئی تعلیم اپنی جگہ پر کتنی ہی بڑھیا اور اعلیٰ قسم کی کیوں نہ ہو! جب تک اس کا کوئی عملی نمونہ نہیں ہوگا وہاں تک وہ تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔

سید سلیمان ندویؒ اور ٹیگور:

ہمارے ہندوستان کا ٹیگور، جس کو نوبیل انعام (NOBEL PRIZE AWARD) دیا گیا تھا، اس نے برہمو سماج کے نام سے ایک مذہب کی بنیاد ڈالی تھی، جس میں مختلف مذاہب کی اعلیٰ تعلیمات کو جمع کیا تھا۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خطبات مدراس

---

(۱) مسند أحمد: ۲۴۶۰۱، ۲۵۳۰۲، ۲۵۸۱۳ والمعجم الأوسط للطبراني: ۷۲.

(۲) صاحب روح المعانی فرماتے ہیں: سمعت کثیراً من المشایخ یقولون: من لم یر مفلحاً لا یفلح (روح المعاني: ۹/ ۲۳).

میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ یورپ کے سفر سے واپسی میں ہوائی جہاز میں ٹیگور کے ساتھ آپ کی ملاقات ہوگئی، تو حضرت سید سلیمان ندویؒ نے اس سے پوچھا: آپ نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی اور اس میں مختلف مذاہب کی اچھی اچھی باتوں کو لے کر اسے تیار کیا، آخر اس میں کامیابی کیوں نہیں ملی؟ تو اس نے کہا: کوئی بھی مذہب، جب تک اس کا عملی نمونہ موجود نہ ہو، وہاں تک کامیاب نہیں ہوسکتا۔

......اصلاح ممکن نہیں تھی:

تو حقیقت تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ذات کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی لیے مبعوث فرمایا۔ چناں چہ ارشاد فرمایا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (الاحزاب:۲۱) حضرات صحابہؓ نے حضور اکرم ﷺ کی ذات کو دیکھ کر اور آپ ﷺ کی صحبت پاکر اپنے آپ کو ٹھیک کیا تھا۔ حضرات تابعین نے صحابہؓ کی صحبت پاکر اور ان کو دیکھ دیکھ کر اپنے آپ کو درست کیا۔ یہی سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ برابر چلا آرہا ہے۔ صرف نظریاتی طور پر کسی نظریے سے کوئی بات بنتی نہیں چاہے وہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو! کوئی تعلیم چاہے کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو! صرف اسی سے انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ انقلاب پیدا ہوگا کسی شخصیت کے ذریعے سے، جو اس نظریے کا عملی نمونہ ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی ذات کو قرآن کی تعلیمات کا ایک نمونہ بنا کر بھیجا، اسی لیے بینہ سے تعبیر کیا۔ گویا خود آپ کی ذات، آپ کا وجود ایک روشن دلیل اور معجزہ ہے۔ اسی کو دیکھ کر لوگوں میں تبدیلی آئی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تک اللہ کا عظیم الشان رسول دنیا میں نہیں آیا، تب تک لوگوں میں اتنی خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں کہ ان کی اصلاح ممکن نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

اہل کتاب بھی جانتے تھے:

آگے فرماتے ہیں۔ اور اہل کتاب نے الگ راستہ اختیار نہیں کیا، مگر اس کے بعد جب کہ ان کے پاس روشن دلیل آ چکی تھی۔ اہل کتاب یعنی توریت کو ماننے والے یہودی یا انجیل کو ماننے والے نصرانی، ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کے انبیا کے ذریعے سے جو کتابیں دی گئی تھیں، ان میں نبی آخر الزمان کے آنے کی اطلاع بھی دی تھی اور ساتھ ہی ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علامتیں اور نشانیاں بھی بتلائی گئی تھیں۔ تو یہ اہل کتاب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا میں تشریف لانے سے پہلے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر متفق تھے، یہاں تک کہ خود قرآن میں اس سلسلے میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (سورۃ البقرۃ:۸۹)

جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری ہوئی نہیں تھی، تب تک اہل کتاب سب یک زبان ہو کر اپنی کتابوں میں موجود نبی آخر الزماں کی علامتوں اور نشانیوں کی بنیاد پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ورسالت کے قائل تھے، اور مشرکین کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ دیا کرتے تھے، کہ اے اللہ! نبی آخر الزماں کے واسطے سے تو ہمیں کامیابی نصیب فرما۔ اور مشرکین سے یہ بھی کہتے تھے کہ جب نبی آخر الزماں آئیں گے، ان پر ہم ایمان لائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا اور ہم کو تم پر غلبہ حاصل ہوگا۔

پہلے انتظار پھر انکار:

لیکن پھر ہوا کیا؟ وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ

یہ روشن دلیل یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بابرکت ذات جب دنیا میں آ چکی، تب انہوں نے اختلاف اور انکار کیا۔ آپ کی آمد سے پہلے انتظار کرتے تھے کہ آئیں گے، آئیں گے، آئیں گے، اور آپ کی آمد کے بعد انکار کرنے لگے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنو اسماعیل میں بھیجا۔ دراصل یہودی آپ کا پرچار (પ્રચાર) بڑے زور و شور سے کرتے تھے کہ آخری نبی آنے والے ہیں اور ان پر ایمان لا کر ہم کامیابی حاصل کریں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ساری علامتیں بتلائی تھیں البتہ یہ نہیں بتلایا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنو اسماعیل میں آئیں گے۔ یہودی یوں سمجھتے تھے کہ بنو اسرائیل میں آئیں گے۔ لیکن جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنو اسماعیل میں پیدا کیا اور وہی علامتیں جو ان کی کتابوں میں موجود تھیں، وہ سب انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور ان کو یقین ہو گیا کہ یہی آخری نبی ہیں جن کی پیشین گوئی کی گئی تھی، صرف بنو اسرائیل میں نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔ اور یہ انکار صرف اور صرف حسد، عناد اور بغض کی وجہ سے تھا، کہ ہمارے قبیلے میں کیوں نہیں آئے اور بنو اسماعیل میں کیوں آئے؟ چناں چہ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (البقرۃ: ۱۰۹) (انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کیا حالاں کہ حق واضح ہو چکا تھا)

حسد؛ انکار کا سبب:

جب نبی کریم ﷺ ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپ کا پہلا قیام قبا میں رہا، تو اس وقت ام المؤمنین حضرت صفیہ ؓ کا باپ حیی بن اخطب جو قبیلہ بنو نضیر کے سرداروں میں سے تھا، بڑا عالم تھا اور حضور ﷺ کی ساری علامتیں اس کو معلوم تھیں۔ چناں چہ جب آپ نے قبا میں قیام فرمایا، تو اس نے آ کر آپ ﷺ کے ساتھ رات گزاری اور جب رات گزار کر وہ اپنے گھر آیا تو اس کے بھائی نے پوچھا کہ کیا یہ وہی ہے؟ تو اس نے کہا کہ ہاں یہ وہی ہیں، جن کی خبر ہماری کتابوں میں ہے۔ پوچھا کہ اب کیا کریں؟ تو کہا کہ ہمیں تو ان کی مخالفت کرنی ہے۔ کیوں کہ وہ ہمارے قبیلے میں سے نہیں ہیں۔ اور یہ مخالفت اس لیے نہیں تھی کہ -نعوذ باللہ- آپ ﷺ میں وہ علامتیں موجود نہیں تھیں، بلکہ حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِهِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الۡحَقُّ (البقرۃ: ۱۰۹) (حق ان کے سامنے واضح ہو چکا تھا، پھر بھی انہوں نے حضور ﷺ کا انکار کیا) صرف حسد کی وجہ سے۔

جب حسد کی وجہ سے یہ بات ہے تو اس کا تو کیا علاج ہو سکتا ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا جواب خود قرآن میں اپنی طرف سے دیا کہ وَاللّٰهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ (البقرۃ: ۱۰۵) (اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اپنی رحمت سے مخصوص کر سکتا ہے) یعنی نبوت کی نعمت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنی رحمت سے عطا فرمائی ہے، تمہارا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

بہر حال! اہل کتاب میں سے بڑی تعداد وہ ہے جنہوں نے حضور ﷺ کا انکار کیا۔ کچھ لوگوں نے اقرار کیا اور ایمان لائے۔ شروع سورت میں صرف دو گروہ کا تذکرہ ہے:

(۱) اہل کتاب (۲) مشرکین۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ (اہل کتاب نے روشن دلیل آ چکنے کے بعد الگ راستہ اختیار کیا) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور حقانیت واضح ہو چکنے کے بعد انہوں نے الگ راستہ اختیار کیا۔ مشرکین نے بھی مخالفت کی، لیکن مشرکین کی تو بڑی تعداد بعد میں ایمان لے آئی، کچھ لوگ مقابلے پر آئے، مارے گئے اور ختم ہو گئے۔ اور پورے جزیرۃ العرب نے ایمان قبول کر لیا۔ اور اہل کتاب میں سے قلیل تعداد نے ایمان قبول کیا اور بڑی تعداد نے الگ راستہ اختیار کیا۔ چناں چہ اسی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمایا۔

قرآن میں دوسری جگہ بھی ہے: فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرۃ:۸۹) جس نبی کے آنے کی پہلے زور وشور سے خبر دیتے تھے، جب وہ نبی اپنے وقت پر آئے اور انہوں نے ان کو علامتوں کی بنیاد پر پہچانا، لیکن پھر بھی انہوں نے انکار کیا۔ چناں چہ اسی کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ ان پیشین گوئیوں کے مطابق پہچان لینے کے بعد بھی وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لائے اور انکار کیا۔

انکار کیوں......؟؟؟:

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کیوں کیا؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن تعلیمات کو لے کر آئے تھے وہ کوئی نئی چیز تھی؟ کیا پہلے انبیا کے ذریعے جو تعلیم بھیجی تھی اور جس چیز کا حکم ان کو دیا گیا تھا وہ الگ تھا اور یہ الگ تھا؟ نہیں! تمام انبیا کی تعلیم اور ادیان میں جن چیزوں کا حکم دیا گیا تھا وہ سب ایک تھا، عقائد کے اعتبار سے اور اصولی طور پر اعمال کے

اعتبار سے سب ایک تھا، البتہ زمانوں کے اعتبار سے کچھ معمولی فرق رہا۔ تو تعلیم میں فرق تھا اس لیے انہوں نے انکار کیا ہو، ایسی بات نہیں تھی۔ اسی کو فرماتے ہیں:

غیرِ حق را در دل او نیست جائے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (اہل کتاب کو اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کریں کہ یکسو ہو کر بندگی کو اس کے لیے خالص رکھیں) خالص اللہ کی عبادت کریں اور اس میں کسی کو شریک نہ کریں۔ سب سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اللہ کی عبادت میں مشغول ہوں۔

حُنَفَاء کے معنیٰ ہیں صرف اللہ کی عبادت کرنا، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ شرک کرنے کے نتیجے میں آدمی حنیف نہیں رہتا۔ حضرت ابراہیمؑ کا لقب ہے حنیف۔ حنیف کا مطلب یہ ہے کہ سب کی طرف سے توجہ ہٹا کر خالص ایک خدا کی طرف متوجہ ہو جانا۔ یہ لقب اسی بنیاد پر تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی طرف آپ کا دھیان نہیں تھا۔ یہی حکم سب کو دیا گیا تھا کہ خالص اللہ کی عبادت کرو اس میں کسی کو شریک نہ کرو۔ چناں چہ یہاں اسی کو بیان کیا گیا ہے۔

وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (ان کو یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، اور یہی سچی امت کا سیدھا دین ہے)۔ امت محمدیہ کا دین یہی ہے، لیکن انہوں نے اختلاف کیا محض حسد، ضد اور عناد کی وجہ سے۔

نتیجہ:

اب آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد جو لوگ

آپ پر ایمان لائے اور آپ کی تعلیمات کو قبول کیا، ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا انعام دیا جائے گا، اور جنہوں نے انکار کیا ان کو کیا سزا دی جائے گی۔ اس کو بیان کیا جا رہا ہے۔ گویا اب نتیجہ بیان کیا جا رہا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (بیشک مشرکین اور اہل کتاب میں سے جنہوں نے کفر کیا یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں مانا وہ جہنم کی آگ میں جائیں گے، اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ تمام مخلوق میں سب سے برے ہیں)۔

شر البریة؛ کیوں؟:

دیکھو! کفار کو اللہ تعالیٰ نے شر البریة کہا ہے چاہے وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لیں۔ آج کل اہل یورپ اور اہل امریکہ نے بڑی دنیوی ترقی کی ہوئی ہے، لیکن چوں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں اپنی خواہشات کو ترجیح دی اور ایمان نہیں لائے، اس وجہ سے مخلوق میں سب سے برے ہیں۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں: جب انہوں نے اللہ کے حکم کا انکار کیا، رسولوں کی نفی کی، اپنی خواہشاتِ نفسانیہ کو اللہ حکموں پر غالب و مقدم رکھا، تو یہ ان کی ایسی برائیاں ہیں جو کسی مخلوق میں بھی نہیں پائی جاتیں اس لیے یہ شر البریة یعنی سب سے بدتر ہے۔[۱] خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مقابلے میں اپنی خواہشات کو ترجیح دینا یہی شر البریة ہونے کی وجہ ہے۔ مسلمان بھی اگر یہ راستہ اپنائیں گے تو وہ بھی اس کا مصداق بن سکتے ہیں۔ ایمان ختم نہیں ہو جاتا،

---

(۱) تفسیر عزیزی ص:٦٠٨۔

البتہ یہ وعید ہے۔ اس لیے اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع رکھا جائے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ (جو لوگ ایمان لائے، اور اچھے اعمال کیے وہ تمام مخلوق میں سب سے زیادہ اچھے ہیں) دونوں فریق کا انجام بتلا دیا، جنھوں نے مانا اور ایمان لائے ان کا بھی انجام بتلا دیا اور جنھوں نے نہیں مانا اور انکار کیا ان کا بھی انجام بتلا دیا۔

جَزَآؤُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ (روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا انعام یہ ہوگا کہ ہمیشہ رہنے والے ایسے باغات جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیش اس میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوں گے اور وہ اللہ تعالیٰ سے خوش ہوں گے۔ یہ ان کے لیے ہے جو اپنے پروردگار کا اپنے دل میں خوف رکھتے ہوں)۔

مقامِ صحابہؓ:

یہاں رضا کا لفظ لایا گیا، بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے:

إن الله تعالى يقول لأهل الجنة: يا أهل الجنة، فيقولون: لبيك ربنا وسعديك والخير في يديك، فيقول: هل رضيتم؟ فيقولون: وما لنا لا نرضى يا رب؟ وقد أعطيتنا ما لم تعط أحداً من خلقك، فيقول: ألا أعطيكم أفضل من ذلك؟ فيقولون: يا رب، وأي شيء أفضل من ذلك؟ فيقول: أحل عليكم رضواني، فلا أسخط عليكم بعده أبداً.

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنتی جب جنت میں پہنچ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے

خطاب کرتے ہوئے فرمائیں گے: اے جنتیو! جواب میں وہ عرض کریں گے کہ پروردگار ہم حاضر ہیں اور آپ کے حکم کے تابع ہیں۔ بتلایئے کیا حکم ہے؟ باری تعالیٰ جنتیوں سے پوچھیں گے کہ کیا تم راضی اور خوش ہو گئے؟ تو جواب میں وہ عرض کریں گے کہ ہم کیوں خوش نہ ہوں؟ ہم کیوں راضی نہ ہوں؟ آپ نے ہم کو وہ دیا جو مخلوق میں سے کسی کو بھی نہیں دیا۔ تو باری تعالیٰ فرمائیں گے میں اب تم کو ایسی چیز دینے جا رہا ہوں جو اب تک کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ جنتی کہیں گے کہ اس سے بڑھ کر کون سی نعمت ہے جو آپ دینے جا رہے ہیں؟ باری تعالیٰ فرمائیں گے: میں تم پر اپنی خوشنودی اور رضامندی کو اتارتا ہوں اور آئندہ کبھی بھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا)۔[۱] گویا اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی جنت اور اس کی نعمتوں سے بھی بڑھ کر ہے۔

اس سے آپ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقام کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرآن میں باری تعالیٰ نے پہلے ہی فرما دیا: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ جنتیوں کو جو نعمت سب سے اخیر میں ملے گی، اللہ تعالیٰ نے وہ نعمت حضرات صحابہ کو دنیا ہی میں عطا فرما دی۔

بہر حال! ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع بنا کر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی زندگی گزاریں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

---

(۱) صحيح البخاري: ۶۵۴۹، ۷۵۱۸۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ قدر

(مؤرخہ ۲۶/شوال المکرم ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۹/جون ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد للّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أمابعد! فأعوذباللهمن الشيطٰن الرجيم۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم۝

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝۱ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۝۲ لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۙ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ۝۳ تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ فِیۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ ۚ مِنۡ كُلِّ اَمۡرٍ ۝۴ سَلٰمٌ ۛ هِیَ حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ۝۵

وجہ تسمیہ:

یہ سورۂ قدر ہے۔ اس میں لفظ قدر تین مرتبہ آیا ہے، تو اسی کلمۂ قدر کی وجہ سے اس کا نام بھی سورۂ قدر ہے۔ اس سورت کے شانِ نزول کے سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں تین چیزیں لکھی ہیں؛ لیکن تیسری کے متعلق خود

ہی ناپسندیدہ ہونے کو لکھا ہے۔

شانِ نزول:

پہلا شانِ نزول یہ بتلایا کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہؓ کے درمیان بنی اسرائیل کے حالات بیان فرما رہے تھے، اسی سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنواسرائیل کے ایک عابد کا تذکرہ کیا، کہ اس نے ایک ہزار مہینے تک اللہ کی ایسی عبادت کی کہ دن میں روزہ رکھ کر جہاد کرتا اور رات میں نماز پڑھتا۔ اس طرح پورے ہزار مہینے اللہ کی عبادت میں مشغول رہا۔ یہ سن کر حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اس کی عبادت کے ثواب کو ہم کس طرح پا سکتے ہیں؟ جب کہ ہماری عمریں ہی ساٹھ ستر سال کی ہیں!!! اس لیے کہ ایک ہزار مہینے کا مطلب ہے ۸۳ر سال اور ۴ر مہینے، اور ہماری عمریں ہی عموماً ساٹھ ستر سال سے زیادہ نہیں ہوتیں، اس میں بھی ایک تہائی حصہ سونے میں، کچھ حصہ روزی کمانے میں، کچھ حصہ دوسری ضروریات میں، اور کچھ بیماری اور کاہلی میں ضائع ہو جاتا ہے، تو عبادت کے لیے کیا باقی رہا؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی صحابہؓ کی ان باتوں کو سن کر دلگیر اور غمگین ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے لیے یہ سورت نازل فرمائی۔ جس میں ایک رات کو ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا گیا۔[۱] یعنی اس امت کا کوئی فرد پوری عمر میں صرف ایک رات بھی پالے تو اس کو بھی ۸۳ر سال اور ۴ر مہینوں کی عبادت کا ثواب مل جائے گا؛ بلکہ ہزار مہینوں سے بہتر کہا گیا، اور بہتر کی بھی کوئی حد مقرر نہیں ہے کہ اس سے دوگنی، چارگنی، دس گنی، یا سوگنی بہتر ہے؛

---

(۱) تفسیر عزیزی ص/ ۵۹۰۔

بلکہ مطلق ہے۔اور کتنی بہتر ہے؟ وہ بات ظاہر نہیں کی گئی۔ الغرض! اس سے نبی کریم ﷺ کو تسلی دینا مقصود تھا۔

کہیں امت پیچھے نہ رہ جائے:

دوسرا شانِ نزول یہ لکھا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو آپ کی امت کے افراد کی عمریں بتلائی گئیں جو ساٹھ ستر کے درمیان ہوتی ہیں۔ اور حدیث شریف میں خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: أعمار أمتي مابين الستين إلى السبعين (میری امت کے لوگوں کی عمریں ساٹھ سے ستر کے درمیان ہوں گی) [۱] کسی کی کبھی اس سے زیادہ ہوگئی وہ بات جدا ہے۔ مگر عام طریقہ یہی ہے کہ ساٹھ ستر کے درمیان ہوتی ہیں۔ تو حضور اکرم ﷺ یہ سن کر غمگین ہوئے کہ اگلی امتوں کے لوگوں کی عمریں تو بہت زیادہ تھیں، ان کے مقابلے میں میری امت کے افراد کی عمریں اتنی کم؟ ایسا نہ ہو کہ میری امت کی عمریں کم ہونے کی وجہ سے قیامت کے روز میری امت دوسری امتوں کے مقابلے میں پیچھے رہ جائے، اور دوسرے لوگ زیادہ ثواب حاصل کر کے میری امت سے آگے بڑھ جائیں۔ اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔ تو اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کی تسلی کے لیے یہ سورت نازل فرمائی۔ [۲]

شبِ قدر؛ امت کی خصوصیت:

حافظ ابن کثیرؒ نے ابومصعب عن مالک کے حوالے سے شبِ قدر کو اس امت کی

---

(۱) سنن الترمذي: ۳۵۵۰ وسنن ابن ماجه: ۴۲۳۶.

(۲) تفسیر عزیزی ص ۵۹۰-۵۹۱۔

خصوصیات میں شمار کیا ہے۔ یعنی شب قدر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے صرف امت محمدیہ ہی کو عطا کی گئی ہے۔ علامہ خطّابیؒ نے تو اس پر اجماع نقل کیا ہے؛[۱] اگرچہ بعض مفسرین کو اس پر کلام ہے۔

لیلۃ القدر؛ کیوں؟

(۱) فرشتوں کے حوالے مقدرات:

لیلۃ القدر کا نام لیلۃ القدر کیوں ہوا؟ تو قَدَرَ يَقْدُرُ کے معنیٰ ہیں اندازہ لگانا، مقرر کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے جب سے اس کائنات کو پیدا کیا، کائنات کی ہر مخلوق کے لیے اللہ کی طرف سے جو کچھ بھی طے ہوا، چاہے وہ انسان ہوں یا دوسرے جانور، ان کی عمریں، ان کی روزی وغیرہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازل ہی سے طے کر دی ہے۔ تقدیر ایک دن کی بات نہیں بلکہ کائنات کی پیدائش سے پہلے ہی سے اللہ کی طرف سے یہ سب طے ہو چکا ہے۔ البتہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فرشتے کائنات کے سارے امور کو انجام دینے کے لیے مقرر ہیں، گویا فرشتے اللہ میاں کا اسٹاف ہے۔ جیسے حکومت کا عملہ اور کارندے ہوتے ہیں، وہ حکومت کے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ اور بھی بہت سارے کاموں کے لیے اللہ نے فرشتوں کو پیدا کیا ہے۔

مخلوق کی تقدیر تو اللہ کی طرف سے ازل ہی میں طے کر دی گئی تھی؛ لیکن اللہ تعالیٰ ہر سال ایک شب قدر سے دوسری شب قدر تک جن فرشتوں کو لوگوں کے کاموں پر مقرر کیا گیا ہے، ان کو اس شخص کی ساری فائلیں – اس سال کی روزی کتنی ہے؟ اس کی موت کب ہے؟ وہ

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، سورۃ القدر۔

حج کرے گا یا نہیں کرے گا؟ -دے دیتے ہیں، کہ اس سال تم کو یہ یہ کام کرنے ہیں۔تو مخلوق کے یہ مقدرات، اور خاص طور سے انسانوں کی موت وحیات، روزی اور دیگر امور ان فرشتوں کے حوالے کیے جاتے ہیں، پھر اسی کے مطابق وہ فرشتے سال بھر وہ کام انجام دیتے ہیں۔اس لیے اس رات کو لیلۃ القدر کہتے ہیں۔

(۲) عبادت کی قدر وعزت:

قدر کا دوسرا معنیٰ عزت وشرف ہے۔

اس رات میں عبادت کا ثواب اور عبادت کی قدر وعزت دوسری راتوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔چناں چہ اس رات کو اللہ تعالیٰ نے ہزار مہینوں سے بہتر بنایا، یعنی دوسری راتوں میں آدمی عبادت کرے گا تو اتنا ثواب نہیں ملے گا، جتنا اس رات میں عبادت کرنے پر ملے گا۔اس لیے اس کو لیلۃ القدر کہتے ہیں۔عزت وقدر اور شرف والی رات۔[۱]

(۳) عابدوں کی قدر ومنزلت:

بعض لوگ فرماتے ہیں کہ اس رات میں عبادت کرنے کی وجہ سے عبادت کرنے والوں کی قدر ومنزلت اور ان کا مقام ومرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اونچا ہوجاتا ہے۔اس لیے اس کو لیلۃ القدر کہتے ہیں۔تو اس کا لیلۃ القدر نام رکھنے کی یہ تین وجوہات بتلائی گئی ہیں۔[۲]

فضیلت کیوں......؟؟؟:

لیلۃ القدر کو اللہ تعالیٰ نے دوسری راتوں پر فضیلت عطا فرمائی، اس کی مختلف

---

(۱) تفسیر عزیزی ص:۵۹۱

(۲) تفسیر عزیزی ص:۵۹۱

وجوہات بیان کی گئی ہیں:

(۱) ایک وجہ یہ بتلائی گئی کہ اس رات کو شام سے صبح تک اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلی بندوں کی طرف متوجہ رہتی ہے، اور بندوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں معنوی قرب حاصل ہوتا ہے، جو دوسری راتوں میں نہیں ہوتا۔ اس معنیٰ کر کے اس رات کو دوسری راتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

(۲) دوسری یہ کہ اس رات میں فرشتے اور ارواح نازل ہوتی ہیں۔

فرشتوں کی ملاقات کا اثر:

حضرات مفسرین نے لفظ روح سے حدیث کے پیشِ نظر حضرت جبریلؑ مراد لیے ہیں۔ روح یعنی روح القدس، گویا حضرت جبریلؑ اور دوسرے فرشتے۔ لیکن حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے لکھا ہے: فرشتے اور دیگر ارواح اس رات میں آسمان سے نازل ہوتی ہیں، اور زمین پر جو لوگ اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں وہ ان سے ملاقات کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں عبادت کرنے والوں کی عبادت کی کیفیت اور حلاوت کئی گنا بڑھ جاتی ہے،[۱] جس کا ان کو بھی ادراک ہوتا ہے۔ اس بات کا بھلے ہی ادراک نہ ہو کہ کس نے مصافحہ کیا؟ لیکن اس مصافحے کے نتیجے میں قلب پر جو روحانی اثر اور کیفیات مرتب ہوتی ہیں، ان کا احساس و ادراک ہوتا ہے۔ اس معنیٰ کر کے اس رات کو دوسری راتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

---

(۱) تفسیر عزیزی ص: ۵۹۷-۵۹۸۔

نزولِ قرآن شبِ قدر میں:

سب سے بڑی فضیلت تو یہ ہے کہ قرآن پاک اسی رات میں نازل ہوا۔ یہ ایسی فضیلت ہے کہ اگر یہی ایک فضیلت ہوتی تو بھی کافی تھی۔

وجودِ ملائکہ شبِ قدر میں:

اس کی فضیلت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اسی رات میں پیدا فرمایا۔ فرشتوں کی پیدائش بھی لیلۃ القدر میں ہوئی۔[1]

جنت کی سجاوٹ شبِ قدر میں:

اس رات میں جنت کی بھی آرائش اور سجاوٹ ہوتی ہے۔ ہر سال اس رات میں جنت کی خصوصی آرائش ہوتی ہے۔[2]

تخلیقِ آدم شبِ قدر میں:

حضرت آدمؑ کی پیدائش کا مادہ بھی اللہ تعالیٰ نے اسی رات میں جمع فرمایا۔ اس معنیٰ کر کے اس رات کو دوسری راتوں کے مقابلے میں فضیلت حاصل ہے۔[3]

لیلۃ القدر رمضان ہی میں:

کون سی رات لیلۃ القدر ہے؟ اس سلسلے میں علمائے کرام کے پچاس اقوال ہیں۔

---

(۱) تفسیر عزیزی ص: ۵۹۲۔

(۲) تفسیر عزیزی ص: ۵۹۲۔

(۳) تفسیر عزیزی ص: ۵۹۲۔

قرآن پاک کی آیتوں سے اتنی بات تو صاف ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے۔

ایک آیت تو اسی سورت میں ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (ہم نے اس قرآن کو لیلۃ القدر میں اتارا)۔

سورۂ بقرہ میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (البقرۃ: ۱۸۵) (رمضان میں قرآن پاک اتارا گیا لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے)۔

تو ان دو آیتوں کو ملانے سے ایک بات صاف ہوگئی کہ قرآن پاک رمضان میں لیلۃ القدر میں اترا۔ تو لامحالہ وہ رمضان میں ہوگی، رمضان کے علاوہ نہیں ہوسکتی۔

رمضان میں کب......؟؟؟:

لیلۃ القدر رمضان میں کب ہے؟ اس سلسلے میں مختلف احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان مبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہے۔ آخری عشرے کی کسی بھی رات میں ہوسکتی ہے، لیکن زیادہ تر آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہوتی ہے۔

حقیقی محروم:

(۱) ابن ماجہ میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

دخل رمضان فقال رسول اللہ ﷺ: إن هذا الشهر قد حضركم، و فيه ليلة خير من ألف شهر، من حرمها فقد حرم الخير كله ولا يحرم خيرها إلا محروم.

(رمضان کا مہینہ تم پر آگیا، اس میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ جو آدمی اس رات سے محروم کردیا گیا وہ ہر خیر سے محروم کردیا گیا۔ اور اس رات کی

برکتوں سے وہی آدمی محروم کیا جاتا ہے جو حقیقۃً محروم ہوتا ہے)[۱] بھلا اس کی محرومی کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں؟ وہ حقیقت میں محروم ہی کہا جائے گا۔

آخری عشرے میں تلاش کرو:

(۲) بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: تحروا ليلة القدر في الوتر من العشر الأواخر من رمضان (رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں لیلة القدر کو تلاش کرو)[۲] معلوم ہوا کہ لیلة القدر رمضان کے آخری عشرے میں ہے، اور وہ بھی طاق راتوں میں۔

اعتکاف؛ شب قدر کی تلاش میں......:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ لیلة القدر کو پانے کے لیے رمضان کے پہلے عشرے کا اعتکاف کیا۔ جب وہ عشرہ پورا ہونے والا تھا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بتلایا گیا کہ وہ آئندہ ہے؛ اس میں نہیں تھی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے عشرے کا اعتکاف کیا۔ جب وہ بھی ختم ہونے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتلایا گیا کہ وہ آخری عشرے میں ہے۔[۳]

......اور آپ بھول گئے:

ایک مرتبہ تو باقاعدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری عشرے میں تعیین کے ساتھ بتلایا گیا کہ فلاں رات لیلة القدر ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بتلایا گیا تو

---

(۱) سنن ابن ماجه: ۱۶۴۴.

(۲) صحيح البخاري: ۲۰۱۷، ۲۰۲۰.

(۳) صحيح مسلم: ۱۱۶۷/۲۱۵.

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صحابہؓ کو یہ چیز بتلانے کے ارادے سے اپنے حجرۂ شریفہ سے باہر نکلے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نگاہوں نے ایک منظر دیکھا کہ دو صحابیؓ (حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی حدردؓ) آپس میں لڑ رہے ہیں۔ حضرت کعب بن مالکؓ کا قرضہ حضرت عبداللہ بن ابی حدردؓ پر تھا، اتفاق کی بات کہ وہ یہیں ہاتھ آ گئے !!! ورنہ عام طور پر مقروض جلدی ہاتھ آتا نہیں ہے، تو قرض خواہ بھی موقع غنیمت جانتا ہے کہ جہاں کہیں مل جائے، مسجد کی صف میں ملا تو وہیں پکڑ لیتا ہے۔ تو حضرت کعب بن مالکؓ نے حضرت عبداللہ بن ابی حدردؓ کو وہیں پکڑ کر ان سے کہا کہ میرا قرضہ لاؤ! اسی میں ''تو تو میں میں'' ہوئی، ان کی آوازیں بلند ہو گئیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان میں صلح کروائی۔ صلح اس طرح کروائی کہ حضرت کعب بن مالکؓ سے کہا کہ تم اپنا آدھا قرضہ چھوڑ دو، چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمانے پر انہوں نے فوراً چھوڑ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عبداللہ بن ابی حدردؓ سے فرمایا کہ اب جو باقی رہ گیا ہے وہ ادا کر دو۔[۱] اصل تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حجرۂ شریفہ سے شب قدر بتلانے کے لیے نکلے تھے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کا یہ جھگڑا سلجھانے میں مشغول ہوئے تو بھول گئے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام لے کر نکلتا ہے راستے میں کوئی دوسرا مسئلہ پیش آ جاتا ہے تو اس میں مشغولی کی وجہ سے اصل کام بھول جاتا ہے، اور اس کو یاد بھی نہیں رہتا کہ میں کیوں نکلا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے بتلایا تھا کہ کون سی رات لیلۃ القدر ہے؛ لیکن فلاں کے جھگڑے کی وجہ سے وہ تعیین اٹھا لی گئی۔

یہ درست نہیں:

شیعہ کہتے ہیں کہ شب قدر ہی اٹھا لی گئی۔ وہ اس وجہ سے درست نہیں کہ اسی حدیث

(۱) صحیح البخاري: ۴۹، ۴۵۷، ۴۷۱، ۲۴۱۸، ۲۷۱۰۔

میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فالتمسوها في التاسعة والسابعة والخامسة (پچیسویں، ستائیسویں اور انتیسویں رات کو تلاش کرو)[۱] اگر شب قدر ہی اٹھالی گئی ہوتی، تو فلاں رات میں تلاش کرنے کا حکم کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اس لیے اہل سنت وجماعت کہتے ہیں کہ یہ رات اٹھالی گئی یعنی اس رات کی تعین اٹھالی گئی۔

تعین اٹھانے میں حکمت:

چناں چہ آگے حضور ﷺ فرماتے ہیں: وعسىٰ أن يكون خيرا لكم (امید ہے کہ یہ اسی میں تمہارے لیے خیر ہو)[۲] وہ خیر بایں معنیٰ ہوسکتی ہے کہ دیکھو! جب یہ علم اٹھالیا گیا تو اس رات کو حاصل کرنے کے لیے لوگ کئی راتوں -جن میں گمان ہو- میں لوگ جاگیں گے اور عبادت کریں گے۔ تو جو رات ہے وہ تو مل ہی گئی، اس کے علاوہ عبادت کا موقع ملا، اور کئی راتوں کی عبادت کا ثواب ملا۔

دوسری بات یہ کہ اگر تعین معلوم ہوتی تو سب کو معلوم ہوتا، اور بہت سے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو گناہوں کا چسکا اور عادت ایسی پڑی ہوتی ہے کہ ان سے گناہ چھوٹتا ہی نہیں۔ لیلۃ القدر ہونے کے باوجود وہ گناہوں سے باز نہیں آئیں گے۔ اور لیلۃ القدر میں جانتے ہوئے گناہ کرنا بڑا خطرناک ہے، جیسے کوئی آدمی مسجد میں گناہ کرے تو کتنا بڑا گناہ ہے!!! تو نہ جانتے ہوئے گناہ کرلیا تو معذور سمجھا جائے گا؛ لیکن جانتے ہوئے گناہ کرنا بڑا خطرناک ہے۔

نیز اس رات میں اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے مباہات اور فخر کرتے ہیں۔ جس

---

(۱) صحيح البخاري: ۴۹، ۲۰۲۳، ۶۰۴۹.

(۲) صحيح البخاري: ۴۹، ۲۰۲۳، ۶۰۴۹.

وقت انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تھا: وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ (البقرة:۳) (میں زمین میں ایک نائب بنانا چاہتا ہوں، تو فرشتوں نے بطور اعتراض عرض کیا تھا: باری تعالیٰ! آپ ایک ایسی شخصیت اور ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرنے جا رہے ہیں جو خون بہائے گی، فساد مچائے گی) تو اس وقت تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں کہا تھا: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرة:۳) (میں جو جانتا ہوں تم نہیں جانتے) اللہ نے خاموش تو کر دیا؛ لیکن جب ایسے مواقع پر اس ایک رات کو حاصل کرنے کے لیے انسان عبادت کرتا ہے، تو باری تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں: دیکھو! اس بیچارے کو معلوم بھی نہیں کہ لیلة القدر کون سی ہے؟ اس کے لیے کئی کئی راتوں میں بیدار رہتا ہے، تو اس کے اس عملِ عبادت پر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ الغرض! اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں اور مصلحتیں ہوں گی۔

طاق راتوں میں......:

عام قول یہ ہے کہ رمضان کے آخری عشرے میں ہے، اور اس میں بھی طاق راتوں میں۔ اسی حدیث میں ہے: فالتمسوها في التاسعة والسابعة والخامسة (اس رات کو تلاش کرو نویں، ساتویں اور پانچویں رات میں)[۱] تو نویں یعنی بیس پر نویں، یعنی انتیسویں۔ بیس پر ساتویں، یعنی ستائیسویں، بیس پر پانچویں، یعنی پچیسویں۔ بعضوں نے پیچھے سے (الٹا) حساب گنا ہے۔ آپ فضائل رمضان میں اس کی تفصیل دیکھ سکتے ہیں۔ تو دونوں طرح کی باتیں ہیں۔ لہٰذا اتنی بات تو صاف ہوتی ہے کہ عشرۂ اخیرہ کی ہر رات میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ وہ شب قدر ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

---

(۱) صحيح البخاري: ۴۹، ۲۰۲۳، ۲۰۴۹۔

شب قدر میں کیا دعا مانگے......؟؟؟:

اب اگر کوئی آدمی شب قدر پالے تو اس کو کیا دعا کرنی چاہیے؟ اس لیے کہ جب آدمی کو معلوم ہوجاتا ہے کہ آج شب قدر ہے تو پھر سمجھ نہیں پڑتی کہ کیا مانگے اور کیا نہ مانگے؟ آدمی ٹینشن میں آجاتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی حضرت عائشہؓ نے حل کردیا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: يا رسول الله! أرأيت إن علمت أي ليلةٍ ليلة القدر ما أقول فيها؟ (اے اللہ کے رسول! بتلایئے! اگر مجھے پتا چل جائے کہ آج کی رات لیلة القدر ہے تو میں اللہ سے کیا مانگوں؟) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قولي اللهم إنک عفو تحب العفو فاعف عني (اے اللہ! تو بڑا معاف کرنے والا ہے، معافی کو پسند کرتا ہے، میرے گناہوں کو بھی معاف فرمادے)[۱] یہی سب سے بڑا انعام ہے، اور ہم گنہگاروں کے لیے تو اس سے بڑھ کر کوئی انعام نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ ہمارے نامۂ اعمال میں بے شمار ایسی حرکتیں ہیں کہ کسی ایک پر بھی اللہ تعالیٰ نے پکڑلیا تو ہمارا بیڑا غرق ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہمیں تو یہ مانگو اور وہ مانگو، اس کے بجائے اتنا ہی مل جائے تو بہتر ہے۔ جیسے شیخ سعدی نے نقل کیا ہے کہ میں نہیں کہتا کہ میری عبادتیں قبول کرو؛ بلکہ میری درخواست یہ ہے کہ میرے گناہوں پر قلمِ عفو پھیر دو۔

من نگویم کہ طاعتم بپذیر	قلم عفو بر گناہم کش

میری عبادتیں اس لائق کہاں ہیں کہ میں کہوں کہ قبول کرو، بس! اللہ میرے گناہوں کو معاف کردیجیے۔ تو یہ مسئلہ تو حضرت عائشہؓ نے حل کردیا۔

---

(۱) مسند أحمد: ۲۵۳۸۴، ۲۵۴۹۵، ۲۵۴۹۷، ۲۵۵۰۶، ۲۵۷۴۱ وسنن الترمذي: ۳۵۱۳ وسنن ابن ماجه: ۳۸۵۰.

ترجیحات کا تقاضا:

یہ دعا تو چھوٹی سی دعا ہے، اس کے علاوہ بھی بہت سارا وقت بچتا ہے، آپ کا جی چاہے تو اور بھی بہت سی دعائیں مانگ سکتے ہیں؛ لیکن ایک بات ہے کہ آدمی کو آخرت کی نعمتوں کی طرف زیادہ دھیان دینا چاہیے۔ ہم لوگ دنیا کی محبت میں ایسے غرق ہیں کہ ایسے مبارک اوقات میں بھی ہمیں آخرت کے بہ جائے دنیا کی سوجھتی ہے کہ یوں ہوجائے، فلاں ہوجائے۔ دنیا مانگو، اللہ تعالیٰ نے اس کے بھی مانگنے کا حکم دیا ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں تمہاری چپل کا تسمہ اور پٹی ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگو۔[1] ہر چیز اللہ سے مانگو؛ لیکن چیزوں میں بھی ترجیحات ہوتی ہیں کہ پہلے کیا اور بعد میں کیا؟ ترجیحات کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اللہ سے پہلے آخرت کا سوال کریں، اس کے بعد وقت بچے تو دوسری چیزیں مانگیں گے۔ اس کی طرف بھی دھیان ہونا چاہیے۔

پچھلے گناہ معاف:

اس رات کو عبادت کے ساتھ گزارنا چاہیے۔ بخاری شریف کی روایت ہے: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: من قام ليلة القدر إيماناً واحتساباً غفر له ماتقدم من ذنبه (جو لیلۃ القدر میں اللہ کی عبادت میں مشغول ہوا ایمان کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے تو اس کے اگلے سارے گناہ معاف ہوجائیں گے)[2] یہاں گناہ سے صغیرہ گناہ مراد ہیں۔ ویسے ایک اصولی بات جیسا کہ فضائل نماز میں بھی ہے کہ کسی بھی عبادت کی وجہ

---

(١) الزهد لأحمد بن حنبل: ١١٣٠ ومسند أبي يعلىٰ الموصلي: ٤٥٦٠.

(٢) صحيح البخاري: ٣٥، ١٩٠١، ٢٠١٤.

سے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ کبیرہ کے متعلق علما نے لکھا ہے کہ وہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ تو حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ ایسی بڑی راتوں میں کوئی گنہگار آدمی جب عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو وہ آدمی گناہوں کی معافی مانگتا ہی ہے۔ اس لیے وہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ سب کچھ مانگے اور گناہوں کے متعلق کچھ نہ کہے۔ اس کی طرف بھی توجہ ہوتی ہے، اس لیے کوئی حرج کی بات نہیں۔ تو یہ شبِ قدر کی تفصیلات ہوئیں۔

تاریخ کے اختلاف کا مسئلہ:

ایک سوال تاریخوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں ۲۷/ تاریخ ہے اور مکہ میں تو ۲۸/ ہو گئی، تو ہم کیا کریں؟ تو ہر جگہ کے اعتبار سے لیلۃ القدر ہو گی۔ اللہ تعالیٰ اس کے مطابق اس کو اجر عطا فرمائیں گے۔ وہاں والوں کے لیے وہاں کا حساب، ہمارے لیے ہمارا حساب۔ ہم ظہر کی نماز کب پڑھتے ہیں؟ جب ہمارا ظہر کا وقت ہو گا تب یا مکہ کا وقت ہوتا ہے تب پڑھتے ہیں؟ مکہ کا اپنا وقت ہے، مکہ والے اپنے وقت پڑھیں گے۔ ہم ظہر کی نماز اپنے وقت میں پڑھیں گے۔

لیلۃ القدر کی عبادت کے متعلق ایک بات تو یہ ہے کہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اور ہزار مہینے کا حساب ۸۳/ سال ۴/ ماہ ہوتا ہے۔ اور اس سے بھی بہتر کہا ہے۔ جیسا کہ شروع میں بتلایا تھا۔ اور کتنی بہتر ہے وہ نہیں بتلایا ہے۔ اس لیے اس میں بہت زیادہ وسعت ہے۔

فرشتوں کی آمد:

اور شبِ قدر میں فرشتے، خاص کر وہ فرشتے جن کا مقام سدرۃ المنتہیٰ ہے، وہ

حضرت جبریلؑ کے ساتھ اترتے ہیں، اور جو بھی بندۂ مؤمن مرد یا عورت اللہ کی عبادت میں مشغول ہو اس کے لیے دعاءِ رحمت بھی کرتے ہیں، اور مصافحہ بھی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی عبادتوں میں ایک حلاوت اور نورانیت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور شب قدر میں قرآن پاک نازل ہوا۔

......ان کی بخشش نہیں ہوتی:

کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جن کے گناہ اتنے خطرناک ہیں کہ اس رات میں بھی ان کی معافی نہیں ہوتی ہے۔ ایک شراب پینے والا، خنزیر کا گوشت کھانے والا، ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا، احسان کر کے جتلانے والا وغیرہ۔ آج کل تو یہ بیماری عام ہو گئی ہے۔ احسان کر کے جتلانے سے اس کا ثواب تو ختم ہو ہی جاتا ہے، یہ کبیرہ گناہ ہے۔ نیکی کرنا تو آسان ہے؛ لیکن کی ہوئی نیکی کو بچا کر رکھنا، حفاظت کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں حضرت ابو ذر غفاریؓ کی روایت نقل کی ہے: حضرت ابراہیمؑ پر جو صحیفے اللہ نے نازل فرمائے وہ ۳ر رمضان کو، حضرت موسیٰؑ پر توریت ۶ر رمضان کو نازل ہوئی۔ انجیل حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی ۱۳ر رمضان کو۔ حضرت داؤدؑ پر زبور نازل ہوئی ۱۸ر رمضان کو، اور قرآن نبی کریم ﷺ پر ۲۴ر رمضان کو نازل ہوا۔ (معارف القرآن، سورۃ القدر)

رات بھر عبادت کا ثواب؛ سونا فری:

شب قدر کی عبادت کی اتنی ساری فضیلت ہے؛ لیکن بہت سے لوگ وہ ہیں جن

کے لیے رات بھر جاگنا مشکل ہے تو ان کے لیے ایک آسان نسخہ بھی بتلا دیا جاتا ہے۔ حضرت عثمانؓ کی روایت مسلم شریف میں موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: من صلى العشاء في جماعة فكأنما قام نصف الليل ومن صلى الصبح في جماعة فكأنما صلى الليل كله (جس نے عشا کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی گویا آدھی رات تک اس نے عبادت کی اور فجر کی نماز بھی جماعت کے ساتھ پڑھی تو گویا پوری رات کی عبادت کا ثواب مل گیا)[۱] تو پورے رمضان کی راتوں میں اتنا تو کر سکتے ہیں کہ عشا اور فجر جماعت سے پڑھیں۔ یہ پوائنٹ کی باتیں ہیں۔ آپ سے یہ سب محنتیں نہیں ہوتیں تو رمضان میں اتنا تو کرو کہ رمضان میں مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھو۔ جماعت نہ چھوٹے۔ افطاری میں اتنے زیادہ مشغول مت ہو جانا کہ جماعت چھوٹ جائے۔ اس لیے کہ مغرب کی نماز رات میں پڑھی جاتی ہے، اور عشا بھی رات کی نماز ہے، فجر کی نماز دن کی نماز ہے۔ تو مغرب اور عشا یہ دونوں نمازیں رمضان میں جماعت کے ساتھ پڑھنے کا اہتمام کریں تو بھی کافی ہے دوسری نفل عبادتیں نہ کر پائے تو بھی اس تدبیر سے اچھی خاصی تلافی ہو جائے گی۔ اور اگر آپ نے پورا رمضان اس بات کا اہتمام کیا کہ عشاء کی نماز بھی جماعت کے ساتھ پڑھی اور فجر کی بھی تو پوری رات عبادت کا ثواب ملے گا۔ یہ کچھ ایسے نکتے ہیں جن میں ہم جیسے کمزوروں کے لیے آسانی ہو جاتی ہے۔

ترجمہ وتشریح:

اب سورت اور اس کا ترجمہ سنیے:

---

(۱) صحیح مسلم: ۲۶۰/۶۵۶۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ (بے شک ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات پر پورا قرآن مجید بیک وقت نازل نہیں ہوا۔ پہلی ہی وحی جو غار حرا میں نازل ہوئی تھی وہ سورۂ اقرأ کی پہلی پانچ آیتیں تھیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ۲۳ر سالہ دورِ نبوت میں نازل ہوا۔ لہٰذا اس آیت کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پورا قرآن لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر شب قدر میں ۲۴ر ویں رمضان کو رکھا گیا تھا۔ پھر وہاں سے حضرت جبریلؑ اللہ کے حکم سے ۲۳ر سالہ دورِ نبوت میں تھوڑا تھوڑا لے کر آتے رہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی جو سورۂ اقرأ کی نازل ہوئی وہ رمضان میں لیلۃ القدر میں نازل ہوئی۔

وَمَآ اَدۡرٰكَ مَا لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ (اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟)

لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَيۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ (لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بھی بہتر ہے)۔

ایک ہزار مہینے تک عبادت کرنے کی وجہ سے جتنا ثواب ملتا ہے، اس سے زیادہ شب قدر میں عبادت کرنے کا ثواب ہے۔ کتنی بہتر ہے؟ اس کی کوئی حد نہیں ہے، اس کا معاملہ بڑا وسیع ہے۔

تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ فِيۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ مِنۡ كُلِّ اَمۡرٍ (اس رات میں فرشتے اور روح حضرت جبریلؑ دوسرے فرشتوں کے ساتھ اللہ کے حکم سے ہر کام کے لیے اترتے ہیں) یعنی سال بھر کے مقدرات لے کر آتے ہیں، اور دوسرے فرشتوں کو حوالے کیے جاتے ہیں۔

سَلٰمٌ هِىَ حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ (وہ رات سراپا سلامتی ہے فجر طلوع ہونے تک)۔

یعنی پوری رات یہ برکات رہتی ہیں، رات کے کسی ایک حصے کے ساتھ مخصوص

نہیں، رات شروع ہونے سے لے کر ختم ہونے تک تمام حصوں میں یہ برکتیں موجود ہیں۔

عبادت نشاط کے وقت……:

آپ مغرب کے بعد ہی سے عبادت شروع کر دیں۔ بہت سے لوگ عبادت کے لیے بھی انتظار کرتے ہیں کہ عشا کے بعد، تراویح کے بعد شروع کریں گے۔ عشا اور تراویح کے بعد تو کھا پی کر ایسے مست ہوئے کہ جھومنے لگ جاتے ہیں۔ اس لیے مغرب کے بعد طبیعت میں ذرا نشاط ہے تو یہ وقت ہے، یہ بھی شب قدر ہی ہے، پڑھ لو نا نشاط کے وقت ہی میں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی فضیلت جو آپ کو تراویح کے بعد آدھی رات کو ملتی ہے وہی اب بھی ملے گی، اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی قدردانی نصیب فرمائے۔

ادارے کی دیگر مطبوعات

نمبر شمار	اسماءِ کتب
۱	جدید معاملات کے شرعی احکام
۲	بہارِ نبوت (اول) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوریؒ نمبر (انٹرنیٹ پر دستیاب ہے)
۳	بہارِ نبوت (ثانی) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوریؒ نمبر
۴	برما اور عالمی حالات اپنا طرزِ زندگی درست کیجیے (اردو، گجراتی)
۵	آیئے! نماز صحیح کریں (گجراتی، اردو)
٦	علمی و عرفانی شہ پارے
۷	چراغِ سہارنپور
۸	دعا ایسے مانگیں (گجراتی، اردو)
۹	آسان درس قرآن (سورۂ فاتحہ)
۱۰	آسان درس قرآن (معوذتین تا سورۂ کافرون)
۱۱	بیعت ہونے والوں کو ہدایات
۱۲	القول المبین في ذکر المجاز والمجیزین
۱۳	آسان درس قرآن (سورۂ فاتحہ اور سورۂ ناس تا علق)

DARUL HAMD RESEARCH INSTITUTE
SODAGARWADA, SURAT, GUJARAT (INDIA) +91 9173103824